اِنّ مِن البیانِ لَسِحرًا

جلد سوم

خُطباتِ راشدی

افادات

مفکرِ اسلام حضرت مولانا **زاہد الراشدی**
شیخ الحدیث جامعہ نصرۃ العلوم

ترتیب

قاری جمیل الرحمان اختر قادری

ناشر الشریعۃ اکیڈمی

خطبات راشدی (جلد سوم)

اسوہ رہبر عالم ﷺ

— افادات —

مفکرِ اسلام حضرت مولانا زاہد الراشدی مد ظلہ
شیخ الحدیث جامعہ نصرت العلوم گوجرانوالہ

— مرتب —

قاری جمیل الرحمٰن اختر

فاضل وفاق المدارس العربیہ پاکستان
و جامعہ نصرت العلوم گوجرانوالہ

----ناشر----

الشریعہ اکیڈمی

----واحد تقسیم کار----

انجمن خدام الاسلام

03009496702

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب:---خطبات راشدی (جلد سوم)

افادات:---مولانا زاہد الراشدی صاحب مد ظلہ

مرتب:---مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر قادری

تعاون:---خبیب الرحمٰن، ناصر الدین خان عامر

ناشر:----الشریعہ اکیڈمی

واحد تقسیم کار

انجمن خدام الاسلام

03009496702

لائبریری
الشریعہ اکادمی
۵۱۰

فہرست

1. عرض ناشر 7
2. پیش لفظ 8
3. حرف اول 10
4. رائے عامہ کا محاذ اور اسوۂ نبوی ﷺ 11
5. عبادات و معاملات میں توازن اور اسوۂ نبوی ﷺ 15
6. قوموں کی اچھی خصلتیں رسول اکرم ﷺ کی نظر میں 19
7. رسول اکرم ﷺ کا پیغام دنیا کے حکمرانوں کے نام 29
8. سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم 45
9. اتحاد امت اور اسوۂ نبوی ﷺ 59
10. خصائل نبوی، احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں 68
11. علاج معالجہ اور اسوۂ نبوی ﷺ 72
12. نبی اکرم ﷺ کا معاشرتی رویہ اور روز مرہ معمولات 75
13. حضور نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی 79
14. امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال اور اسوۂ نبوی ﷺ 85
15. عدل اجتماعی کا تصور تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں 89
16. میڈیا کا محاذ اور اسوۂ نبوی ﷺ 93
17. رسول اکرم ﷺ کی مجلسی زندگی 97

18. نعتیہ شاعری اور ادب واحترام کے تقاضے 99

19. نعت رسول ﷺ کے آداب 102

20. سیرت طیبہ اور امن عامہ 105

21. حالات کا اتار چڑھاؤ اور اسوہ نبوی ﷺ 108

22. رسول اکرم ﷺ بطور سیاست دان 111

23. رسول اکرم ﷺ کا منافقین کے ساتھ طرز عمل 114

24. تذکرہ نبوی ﷺ کے چند آداب 117

25. رسول اکرم ﷺ کی معاشرتی اصلاحات 121

26. حکمت عملی کا جہاد 124

27. معاہدہ حدیبیہ کے اہم سبق 129

28. دفاع وطن اور اسوہ نبوی ﷺ (1) 133

29. دفاع وطن اور اسوہ نبوی ﷺ (2) 137

30. کفار کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا معاشرتی رویہ 140

31. سفر معراج کے دو پہلو 145

32. معراج النبی ﷺ: ایک سبق، ایک پیغام 149

33. مکارم اخلاق اور سیرت نبوی ﷺ 159

34. سماجی خدمت اور سیرت نبوی ﷺ 176

35. خواتین کی معاشرتی حیثیت اور سیرت نبوی ﷺ 191

36. انسانی حقوق اور سیرت نبوی ﷺ 209

37. سیاسی قیادت اور سیرت نبوی ﷺ 225

38. قانون کی بالادستی اور سیرت نبوی ﷺ 238

39. معاشی انصاف اور سیرت نبوی ﷺ 254

40. دعوت اسلام اور سیرت نبوی ﷺ 269

41. خاندان نبوت ﷺ 288

42. اخلاق حسنہ، سیرت نبوی ﷺ کا سب سے نمایاں پہلو 307

43. تجارت اور سیرت نبوی ﷺ 312

44. حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کا اسوۂ حسنہ 322

45. خطبہ حجۃ الوداع کے چند اہم نکات 327

46. ذرائع ابلاغ اور سنت نبوی ﷺ 333

47. سیدنا ابراہیم علیہ السلام، عزیمت واستقامت کے پیکر 337

48. سیرت نبوی ﷺ اور ڈکٹیٹر شپ 342

49. سیرت نبوی ﷺ کے حوالہ سے ضروری گزارش 346

50. صلح حدیبیہ کے چند اہم پہلو 349

51. صلح وجنگ اور سیرت نبوی ﷺ 354

52. صلہ رحمی اور سیرت نبوی ﷺ 366

53. عدل اجتماعی کا تصور تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں 375

54. عدل وانصاف اور سیرت نبوی ﷺ 379

55. عوامی نمائندگی اور سیرت طیبہ ﷺ 390

56. عورتوں کے حقوق اور سیرت نبوی ﷺ 393

57. عید میلاد المسیح اور اسلام 405

58. غلامی کا تصور اور سیرت نبوی ﷺ 419

59. غیر مسلموں سے سلوک اور سیرت نبوی ﷺ 428

60. فرقہ وارانہ کشمکش اور اصول انسانیت 440

61. گھریلو زندگی اور سیرت نبوی ﷺ 446

62. معجزہ شق القمر 456

63. معراج النبی ﷺ: ایک سبق ایک پیغام 459

64. نبی اکرم ﷺ کی ذات ہی مسلمانوں کی زندگی کا محور ہے 469

65. نبی اکرم ﷺ کے معمولات زندگی 477

عرض ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اما بعد! محترم قارئین اللہ تبارک وتعالیٰ کا بے انتہا شکر ہے جس نے مجھ ناچیز کو دین متین کی نشر و اشاعت کیلئے قبول فرمایا ہے الحمدللہ۔ کئی ایک دینی کتب کی اشاعت کی توفیق ارزانی اور امام اہل سنت فخر المحدثین حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ سے وابستگی نصیب فرمائی اور حضرت کے صاحبزادے عظیم مذہبی و اسلامی سکالر شیخ الحدیث حضرت مولانا زاہد الراشدی دامت برکاتہم کے خطبات کی تیسری جلد اُسوۂ رہبر عالم ﷺ کے عنوان سے ترتیب و اشاعت کا موقع عطا فرمایا ہے۔ اس سے قبل دو جلدیں خطبات راشدی کے نام سے شائع ہو چکی ہیں، ایک مجموعہ تقریباً 30 کے قریب مضامین 124 صفحات پر مشتمل اُسوۂ رہبر عالم ﷺ کے عنوان سے عزیزم محترم صاحبزادہ ناصر الدین خان عامر زید مجدہ کا مرتب کردہ 2016 میں شائع کیا تھا۔ کچھ عرصہ سے وہ ختم تھا اس پر مزید حواشی اور مضامین شامل کر کے خطبات راشدی کی جلد سوم کی اشاعت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ پہلی دو جلدوں کی طرح اس کو بھی آپ استحسان کی نظر سے دیکھیں گے اور استفادہ کریں گے۔ میں دعا گو ہوں کہ حضرت دامت فیوضہم کا سایہ عاطفت تادیر ہمارے سروں پر سلامت رہے۔

یکے از خدام امام اہلسنت

(مولانا قاری) جمیل الرحمٰن اختر قادری نقشبندی مجددی

خطیب و متولی جامع مسجد امن اہل سنت والجماعت

285 جی ٹی روڈ باغبانپورہ لاہور

03009496702

پیش لفظ

(بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے رئیس محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی نے یہ مضمون "خطبات راشدی" کے پیش لفظ کے طور پر تحریر فرمایا تھا، قند مکرر کے طور پر اسے زیر نظر کتاب کا حصہ بھی بنایا جا رہا ہے۔)

ایک مشہور حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ دین اور شریعت کا علم ہر دور میں اہل علم کے ایک طبقے کے ذریعے محفوظ رہے گا جو اس علم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان غلط فہمیوں کی تردید بھی کرتے رہیں گے جو انتہا پسندوں اور غلو کاروں کے ذریعے پھیلیں گی، ان بے بنیاد باتوں کی تردید بھی کرتے رہیں گے جو اہل باطل کے ذریعے فروغ پائیں گی اور ان غلط تعبیرات و تصورات کی اصلاح بھی کرتے رہیں گے جو دین کے جاہل اور کم علم عقیدت مند پھیلائیں گے۔ اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک مخلص اہل علم کی ایک تعداد ان تینوں ذمہ داریوں کو انجام دیتی چلی آرہی ہے۔ یہ انہی بابرکت نفوس کی مبارک کوششوں کا ثمرہ ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ آج بھی اپنی اصل تعلیم کے ساتھ موجود ہیں۔ شریعت الٰہی کا روشن چہرہ آج بھی دنیا کے سامنے منور ہے۔ اکابر اسلام کے تاریخ ساز کارنامے آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہیں۔

اہل علم کے اسی بابرکت قافلے کے ایک قافلہ سالار حضرت مولانا زاہد الراشدی ہمارے دور میں یہی فرائض سہ گانہ انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے عرب و عجم اور مشرق و مغرب ہر جگہ اپنی فصیح اللسانی اور رواں قلم کے ذریعے اسلام کا مسلسل دفاع کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ انہوں نے دین اور شریعت کی تعلیمات پر کیے جانے والے اعتراضات کا ہمیشہ موثر اور مثبت جواب دیا ہے۔ باطل پرست طبقات کی طرف سے جب بھی اسلام یا اسلامی تہذیب سے کوئی غلط چیز منسوب کی گئی مولانا کے موثر اسلوب اور طاقتور قلم نے اس کی

کمزوری کھول کھول کر عیاں کر دی۔ دین کے نادان دوستوں اور جاہل عقیدت مندوں کی کمزور تاویلات کے نتیجے میں جب بھی کسی کو دین و شریعت پر اعتراض کا موقع ملا مولانا زاہد الراشدی نے جرأت سے کام لے کر اس موقف کی کمزوری واضح کی۔

مولانا کی یہ فاضلانہ تقریریں، تحریریں پاکستان اور انگلستان کے بیسیوں اخبارات اور رسائل کی فائلوں میں منتشر بلکہ مدفون ہیں۔ اخبارات کی زندگی چند گھنٹوں اور رسائل کی زندگی چند دنوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اخبارات چند گھنٹوں اور رسائل چند دنوں میں ردی کی نذر کر دیے جاتے ہیں۔ عام طور پر اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی علمی و فکری تحریروں کو محفوظ رکھنے کا کوئی موثر بندوبست نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ مولانا راشدی کے قلم سے نکلے ہوئے یہ جواہر پارے وقت کے ساتھ ساتھ ضائع ہو جائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ لاہور کے بعض علم دوست حضرات نے ان مضامین کی اہمیت کا احساس کیا اور ان کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کے یہ مقالات و مضامین اور تقاریر و خطبات متعدد جلدوں میں مرتب ہو کر محفوظ ہو جائیں گے اور اہل علم و دانش کے لئے دستیاب ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ مولانا زاہد الراشدی کے یہ وقیع خطبات و مقالات دور جدید میں دعوت و تبلیغ کے نئے اسلوب کو جنم دیں گے اور ان کی مدد سے ملک کے نوجوان علماء کرام تبلیغ دین کے ایک نئے اور منفرد ڈھنگ سے آشنا ہوں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی عمر، علم اور کوششوں میں برکت عطا فرمائے اور ان کی تحریروں اور تقریروں کو نتیجہ خیز اور مفید بنائے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی
سابق رئیس
جامعہ الاسلامیہ العالمیہ اسلام آباد
وسابق وفاقی وزیر مذہبی امور پاکستان

حرفِ اوّل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

گزشتہ نصف صدی کے دوران بحمد اللہ تعالیٰ سینکڑوں اجتماعات میں جناب سرور کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ اور اسوہ حسنہ کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کی سعادت حاصل ہوئی ہے جن میں سے کچھ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو کر اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ عزیزم حافظ ناصر الدین خان عامر سلمہ نے ان میں سے چند مطبوعہ مضامین کو جمع کیا تھا اور اسوۂ رہبر عالم ﷺ کے نام سے اس کی اشاعت ہوئی تھی ان میں کچھ کی بیشی سے اور اس کے علاوہ ۱۹۹۵ء میں جامعہ الہدیٰ نوٹنگھم برطانیہ میں جبکہ ۲۰۰۷ء میں دار الہدیٰ سپرنگ فیلڈ ورجینیا امریکہ میں سیرت النبیؐ کے مختلف پہلوؤں پر محاضرات کا موقع ملا تھا انہیں بھی ان کے ساتھ ملا کر مولانا قاری جمیل الرحمن اختر کے مرتب کردہ "خطبات راشدی" کی تیسری جلد کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

احباب سے درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھیں اور مفید مشوروں سے بھی نوازیں۔

مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

یکم مارچ 2020ء

رائے عامہ کا لحاظ اور اسوۂ نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O
وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ

محترم حضرات! کسی موقع پر اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا تھا کہ جناب نبی اکرم ﷺ ایسے معاملات میں، جن میں وحی کا نزول نہیں ہوتا تھا، ساتھیوں سے مشورہ کرتے تھے۔ عام لوگوں سے متعلقہ امور میں عام لوگوں کو شریک مشاورت کرتے تھے اور لوگوں کی رائے کو قبول بھی فرماتے تھے۔ آج اسی مسئلے کے ایک اور پہلو پر کچھ عرض کرنا مقصود ہے، وہ یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا بھی خیال رہتا تھا کہ ان کے کسی کام سے لوگوں میں بلاوجہ غلط فہمیاں نہ پھیلیں اور پبلک تاثر درست رہے۔ عوامی زندگی میں اپنے بارے میں لوگوں کے تاثرات کو درست رکھنا اور مختلف کاموں کے بارے میں لوگوں کے احساسات و جذبات کا جائزہ لیتے رہنا اور انہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ سنت نبویؐ بھی ہے۔ اس بارے میں دو واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا واقعہ بحوالہ بخاری شریف:

ایک واقعہ بیت اللہ کی تعمیر کے سلسلہ میں ہے جسے امام بخاریؒ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خانہ کعبہ کی موجودہ تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ بیت اللہ کے نقشہ کے مطابق نہیں ہے۔ ابراہیمی تعمیر میں حطیم سمیت پورے بیت اللہ پر چھت تھا، دروازہ زمین کے برابر تھا، اور آمنے سامنے دو دروازے تھے جس سے عام لوگوں کو یہ سہولت ہوتی تھی کہ وہ ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے

نکل جاتے تھے اور انہیں بیت اللہ شریف کے اندر جانے کا موقع مل جاتا تھا۔ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے جب قریش مکہ نے بیت اللہ شریف کی دوبارہ تعمیر کی، تو اعلان کے مطابق حلال کی کمائی کا چندہ اس قدر جمع نہیں ہو سکا تھا کہ پورے بیت اللہ پر چھت ڈالی جا سکے۔ اس لیے ایک حصہ چھت سے باہر نکال دیا گیا جو حطیم کہلاتا ہے۔ دو کی بجائے ایک دروازہ کر دیا گیا اور وہ بھی زمین کے برابر رکھنے کی بجائے اونچا کر دیا گیا جس کی وجہ آنحضرت ﷺ نے یہ بیان فرمائی کہ قریش کے سردار یہ چاہتے تھے کہ کعبہ کے اندر وہی شخص داخل ہو سکے جس کے متعلق وہ چاہیں اور اسی مقصد کے لئے ایک دروازہ ختم کر کے دوسرا اونچا کر دیا گیا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپ ﷺ نے ان سے یہ تفصیل بیان فرمائی تو انہوں نے دریافت کیا کہ وہ کعبہ کو گرا کر از سر نو حضرت ابراہیم علیہ السلام والی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیوں نہیں کر دیتے؟ اس پر جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کا اپنا جی بھی چاہتا ہے لیکن چونکہ قریش والے نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں اس لیے خدشہ ہے کہ وہ اسے محسوس کریں گے، اس لیے وہ ایسا نہیں کر رہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کو پبلک تاثرات کا کس قدر لحاظ رہتا تھا۔ بعد میں جب مکہ مکرمہ پر حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی امارت قائم ہوئی تو انہوں نے حضور ﷺ کی خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے بیت اللہ کو گرا کر اسے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کر دیا۔ لیکن جب حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ شہید ہو گئے اور حجاج بن یوسف نے مکہ مکرمہ کا چارج سنبھالا تو ابن زبیرؓ کا تعمیر کردہ کعبہ گرا کر اسے دوبارہ قریش کے نقشہ کے مطابق بنا دیا۔ اس کے بعد عباسی خلفاء کا دور آیا تو ان کی خواہش ہوئی کہ حجاج کی تعمیر کو گرا کر پھر سے بیت اللہ کو ابراہیمی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کیا جائے۔ مگر اس وقت کے سب سے بڑے عالم امام اہل سنت حضرت امام مالکؒ نے یہ محسوس کیا کہ اس طرح تو بیت اللہ سیاسی گروپوں کے درمیان بازیچۂ اطفال بن جائے گا اور جو حکمران بھی آئے گا وہ پہلے کی تعمیر گرا کر اسے از سر نو تعمیر کرنا چاہے گا۔ چنانچہ انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ بیت اللہ شریف قیامت تک اسی نقشہ کے مطابق رہے گا اور اب اسے گرا کر نئے سرے سے بنانا جائز نہیں ہے۔ یوں انہوں

نے اپنی مومنانہ فراست کے ساتھ خانہ کعبہ کو سیاسی گروپوں کی مخاصمت کا نشانہ بننے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

مگر اس واقعہ سے جو بات ہم عرض کرنا چاہتے تھے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عام لوگوں کے احساسات و تاثرات کا اس حد تک خیال رکھا ہے کہ ایک کام کی خواہش کے باوجود اسے محض لوگوں کے احساسات کی وجہ سے روک دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ تکوینی طور پر اسی صورت کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا سامان کر دیا جسے رسول اکرم ﷺ نے صرف لوگوں کے احساسات و تاثرات کی وجہ سے بظاہر وقتی طور پر باقی رکھا تھا۔

دوسرا واقعہ بحوالہ بخاری شریف:

دوسرا واقعہ بھی صحیح بخاری میں ہے اور وہ مدینہ منورہ میں منافقوں کے سردار عبد اللہ بن ابی کے بارے میں ہے جس کی سازش اور شرارتیں سب کے سامنے عیاں ہو چکی تھیں۔ اس نے کئی مواقع پر صحابہ کرامؓ کو آپس میں لڑانے کی سازش کی، قریش کے خلاف آنحضرت ﷺ کے غزوات میں اس نے درپردہ دشمنوں کی معاونت کی، ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں نعوذ باللہ قذف کے جھوٹے الزامات کی تشہیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور ایک غزوہ کے موقع پر سفر کے دوران اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ شر انگیز مشورہ کیا کہ مدینہ منورہ واپس پہنچ کر وہ انصار مدینہ پر زور دیں گے کہ وہ مہاجرین پر خرچ کرنا بند کر دیں اور حضرت محمد ﷺ اور ان کے مہاجر ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دیں۔ اس سازش اور مذموم مشورہ کی خبر حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ایک مستقل سورت نازل کر کے دی۔ اور اس ساری صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے رسالت مآب ﷺ سے اجازت چاہی تا کہ وہ اس منافق کی گردن اڑا دیں تو آپ ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ جب اس کا علم عبد اللہ بن ابی کے بیٹے جن کا نام بھی عبد اللہ رضی اللہ عنہ تھا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کی کہ

یارسول اللہ ﷺ اگر اس کا سر تن سے جدا کرنا ہے تو پھر میں خود یہ کروں گا جس پر آنحضرت ﷺ نے انہیں بھی منع کر دیا۔اور بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس سے لوگ خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کسی کام سے پہلے اس بات کا لحاظ رکھتے کہ اس سے عام لوگوں کا تاثر خراب نہ ہو۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

عبادات و معاملات میں توازن اور اسوۂ نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

آج کی محفل میں دور نبوی ﷺ کے ایک ایسے واقعہ کا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے جس سے اسلام کے معاشرتی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلامی احکام وہدایات کے اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ یہ واقعہ صحابی رسول حضرت عبد اللہ عمرو بن العاصؓ کا ہے جو حدیث نبوی ﷺ کے بڑے راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ صوفی منش بزرگ تھے، انہیں نماز، روزہ اور تعلیم و تعلم کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور ان کا یہ معمول بن گیا تھا کہ روزانہ پابندی کے ساتھ روزہ رکھتے تھے اور رات کا بیشتر حصہ اہتمام کے ساتھ نماز و قیام میں گزارتے تھے۔ حتیٰ کہ حافظ ابن عبد البر نے ”الاستیعاب“ میں ذکر کیا ہے کہ ان کے والد محترم حضرت عمرو بن العاصؓ کو اس بارے میں جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں باقاعدہ شکایت کرنا پڑی۔ اس شکایت کا پس منظر بھی بعض روایات میں بڑا دلچسپ بیان ہوا ہے۔

حضرت عبد اللہؓ کی شادی ہوئی اور وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ الگ گھر میں آباد ہو گئے تو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے بیٹے اور بہو کا حال احوال دریافت کرنے کے لئے ان کے گھر گئے بہو گھر میں موجود تھیں ان سے حال پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہر طرح خیریت ہے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے عبد اللہؓ کے طرز عمل اور سلوک کے بارے میں استفسار کیا تو اس نیک دل خاتون نے معنیٰ خیز انداز میں کہا:

”آپ کا بیٹا بہت نیک ہے۔ ساری رات مصلے پر ہوتا ہے اور سارا دن روزے سے رہتا ہے۔“

عمرو بن العاصؓ جہاندیدہ شخص تھے فوراً سمجھ گئے کہ بہو دراصل شکایت کر رہی ہے چنانچہ خود کچھ کہنے کی بجائے حضور ﷺ کی خدمت میں شکایت پیش کر دی۔ اس سے آگے کا واقعہ بخاری شریف میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبد اللہؓ کو بلایا اور اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے تصدیق کر دی کہ بلاناغہ روزہ رکھتے ہیں اور رات کا اکثر حصہ نماز و قیام میں گزارتے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا:

عَيْنَيْكَ عَلَيْكَ حَقٌّ وَلِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ وَلِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ

"تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، اور تیرے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔"

یعنی نبی اکرم ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ اگرچہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے جسے جتنا زیادہ ادا کیا جائے کم ہے۔ لیکن اس سے انسان کے اپنے جسم، گھر والوں، اور ملنے والوں کے حقوق متاثر نہیں ہونے چاہئیں۔ اور انسان کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان توازن قائم رکھنا چاہیے جو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ وہ ہر چاند ماہ کے درمیانے تین روزے رکھ لیا کریں تو انہیں ہمیشہ کے روزوں (صوم الدھر) کا ثواب مل جائے گا۔ حضرت عبد اللہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ بہت کم ہیں اور میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اچھا یہ معمول بنالو کہ ایک دن روزہ رکھو اور دو دن نہ رکھو، اس مہینے میں دس روزے ہو جایا کریں گے۔ حضرت عبد اللہؓ اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور کہا کہ یارسول اللہ ﷺ میں اس سے زیادہ ہمت رکھتا ہوں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی سنت اپنالو کہ وہ زندگی بھر ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھا کرتے تھے اور مہینے میں پندرہ روزے بن جاتے تھے۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کا اس پر بھی قناعت کرنے کو جی نہ چاہا اور یہ کہہ کر مزید تقاضہ کیا کہ میں اس سے افضل روزوں کی طاقت رکھتا ہوں۔ اس پر حضور ﷺ نے حد بندی کر دی اور فرمایا کہ اس سے افضل کوئی روزہ نہیں ہے۔ بعض روایات کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کے بارے میں بھی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے جناب نبی اکرم ﷺ کی اسی نوعیت کی گفتگو ہوئی اور اس کے اصرار کے باوجود آپ ﷺ نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ سات دن سے کم مدت میں قرآن کریم مکمل کیا کریں۔

اس طرح رسول اکرم ﷺ نے حکماً عبد اللہ بن عمروؓ کے اوقات کے ایک حصے کو نماز اور قرآن سے فارغ کر کے انہیں اپنے جسم، بیوی، مہانوں اور دیگر لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ زندگی بھر اس معمول پر قائم رہے جو جوانی اور ہمت کے دور میں تو انہیں اپنی طاقت سے کم نظر آتا تھا لیکن جب بڑھاپے اور ضعف نے غلبہ پایا تو مشکل محسوس ہوئی۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق وہ خود بڑھاپے میں کہا کرتے تھے کہ:

یالیتنی قبلت رخصتاً النبی صلی اللہ علیہ وسلم

"اے کاش! میں نے رسول اللہ ﷺ کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا۔"

مگر اب ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ جس معمول کا وعدہ وہ خود اپنے اصرار پر جناب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کر چکے تھے اسے چھوڑنے کے لئے خود کو تیار نہیں پاتے تھے۔ جبکہ بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے اس معمول کو نبھانا ان کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔

اس واقعہ سے جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن قائم رکھنے کا حکم دیتا ہے اور حقوق اللہ کی ادائیگی کی کوئی ایسی صورت قبول نہیں کرتا جس سے حقوق العباد متاثر ہوتے ہوں۔ وہاں ایک اور بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ انسان جب بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے سامنے وقتی حالات ہوتے ہیں اور وہ

انہی کی روشنی میں معاملات انجام دیتا ہے۔ جبکہ اسلام ایسا کوئی فیصلہ کرنے میں تمام احوال وظروف کا لحاظ رکھتا ہے جو کہ بسا اوقات انسان کو عجیب محسوس ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ اس کے اول و آخر تمام احوال سے واقف ہے اس لئے قاعدہ اور ضابطہ وہی دیرپا اور موثر ثابت ہوتا ہے جو انسان کا خود اپنا طے کردہ نہ ہو بلکہ اس کے ماضی اور مستقبل سے مکمل آگاہی رکھنے والے مالک وخالق کی طرف سے بیان کیا گیا ہو۔

یہی صورت انسانی اجتماعیت کے قوانین واحکام کی ہے کہ انسان جب اپنی سوسائٹی کے لئے خود قوانین وضع کرتے ہیں تو قوانین وضع کرنے والا فرد ہو یا جماعت، نمائندہ ہو یا ڈکٹیٹر، اس کے سامنے احوال وظروف اور اسباب ومحرکات سب وقتی ہوتے ہیں۔ اور وہ انہی کے دائرے میں قاعدے اور ضابطے ترتیب دیتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ بے کار ہو جاتے ہیں، اور پھر اس فرد، جماعت، ڈکٹیٹر اور پارلیمنٹ کو یوٹرن لینا پڑتا ہے۔ اس لیے انسانی معاشرے کے لیے وہی قوانین واحکام فطری اور دیرپا ہیں جو کائنات کے خالق ومالک نے وحی کے ذریعے بھیجے ہیں۔ کیونکہ وہ ساری نوع انسانی کی ضروریات کو خود ان سے بہتر طور پر جانتا ہے اور ان سب کے ماضی، حال اور مستقبل سے کماحقہ آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے آج تک کبھی اپنے کسی قانون کے بارے میں نہ معذرت کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے اور نہ کسی دور میں اس کے غیر موثر ہونے کی کوئی شکایت سنی گئی ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

قوموں کی اچھی خصلتیں رسول اکرم ﷺ کی نظر میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ
وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْد

اچھی عادات و خصائل انسانی معاشرہ میں افراد اور قوموں کا زیور ہیں۔ اچھی قومیں اچھی خصلتوں اور اوصاف کے ساتھ ہی بنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کا بنیادی مشن یہی رہا ہے کہ انسانوں کی اصلاح کی جائے اور افراد کے عقائد اور اخلاق و عادات کو سنوارا جائے تاکہ وہ بن سنور کر انسانی معاشرہ کی اجتماعی مشینری کے کارآمد پرزے بن سکیں۔

ایک بزرگ نے کیا خوب بات کہی ہے کہ وسائل و اسباب کو ترقی دینا اور ان میں اضافہ کرنا بہت اچھی بات ہے کہ اس سے انسانوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور سہولت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ وسائل و اسباب کو استعمال کرنے والے ہاتھوں کی اصلاح کی جائے اور انہیں ان کے صحیح استعمال کا سلیقہ بخشا جائے۔ کیونکہ مشین عمدہ اور نئی ہو مگر استعمال کرنے والے ہاتھ اناڑی ہوں تو اس مشین کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ اور اگر مشین پرانی اور کمزور ہو مگر استعمال کرنے والا کاریگر تجربہ کار اور اہل ہے تو وہ اسے کسی نہ کسی طرح استعمال میں لے ہی آئے گا۔

اس لیے صوفیاء کرام سب سے زیادہ توجہ افراد کی اصلاح کی طرف دیتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ افراد کے عقائد اور اخلاق و عادات کی جس قدر اصلاح ہو گی دنیا کے وسائل کا استعمال بھی اسی قدر صحیح ہو گا اور انسانوں کی آخرت سنورنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی امن و خوشحالی کا دور دورہ ہو گا۔ ایک اچھی قوم میں کون سی باتیں اور خصلتیں ہونی چاہئیں؟ اس پر سیرت نبوی ﷺ کا ایک سبق آموز واقعہ مطالعہ کے دوران نظر سے گزرا ہے جسے

قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ واقعہ حافظ ابن کثیرؒ نے "البدایہ والنہایہ" صفحہ ۱۱۱ جلد ۵ میں بیان کیا ہے۔ جبکہ اردو میں سیرت کی معروف کتاب "اصح السیر" میں مولانا عبد الرؤف داناپوری نے اسے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

بنوازد قبیلے کا ایک وفد جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں سات افراد شامل تھے۔ ان میں حضرت سوید بن الحارث ازدیؓ بھی تھے اور وہی اس واقعہ کے راوی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بات چیت کی تو آپ ﷺ ہمارے طرز گفتگو اور انداز سے خوش ہوئے اور دریافت کیا کہ تم کون لوگ ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم سب اہل ایمان ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ ہر دعوے پر دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہمارے اندر پندرہ خصلتیں موجود ہیں جو ہمارے مومن ہونے کی دلیل ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے اس کی تفصیل بیان کرنے کا کہا تو ہم نے عرض کیا کہ:

آپ کے نمائندے نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ہم ان پانچ باتوں پر ایمان لائیں:

1. اللہ تعالیٰ کی ذات پر۔
2. اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر۔
3. اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر۔
4. اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر۔ اور
5. اس بات پر کہ مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور زندگی کے اعمال کا حساب ہو گا۔ اور آپ کے نمائندے نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ان پانچ باتوں پر عمل کریں۔

1. زبان سے کلمہ طیبہ پڑھیں۔
2. نماز کی پابندی کریں۔
3. رمضان المبارک کے روزے رکھیں۔
4. زکوٰۃ ادا کریں۔
5. استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کریں۔

جبکہ ہم میں پہلے سے جو خصلتیں موجود تھیں وہ یہ ہیں:

1. آسائش اور راحت کے وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا۔
2. آزمائش اور تنگی کے وقت صبر کرنا۔
3. جو بات واقع ہو قدرت کا فیصلہ جان کر اس پر راضی ہو جانا۔
4. دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا۔ اور
5. دشمن کی مصیبت پر خوشی کا اظہار نہ کرنا۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ جن لوگوں نے تمہیں ان امور کی تعلیم دی ہے وہ حکمت و دانش والے لوگ تھے، اصحاب علم تھے اور انہیں انبیاء کرام علیہم السلام جیسا فہم عطا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان پندرہ خصلتوں کے ساتھ پانچ خصلتیں تمہیں اور بتا دیتا ہوں تا کہ 20 مکمل ہو جائیں:

1. جس چیز کے کھانے کی نوبت نہ آئے اس کا ذخیرہ نہ کرو۔
2. ایسی عمارتیں نہ بناؤ جن میں تمہیں رہنا نصیب نہ ہو۔
3. جو چیز کل ہاتھ سے نکل جانے والی ہو اس پر آج آپس میں ایک دوسرے پر برتری کا اظہار نہ کرو۔
4. جس خدا کے پاس تمہیں لوٹ کر جانا ہے اس سے ڈرتے رہو۔ اور
5. جس جگہ تم نے ہمیشہ رہنا ہے اس کی طرف دھیان دو کہ تم وہاں اپنے لیے کیا کچھ بھیج رہے ہو۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اہل ایمان کی ان خصلتوں کا بار بار مطالعہ کریں اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ مومن قوم کے خصائل کے حوالہ سے ہماری عملی کیفیت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو آخرت میں جنت کی کامیاب زندگی کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی غلبہ اور برتری کی بشارت دے رکھی ہے جو قرآن کریم میں واضح طور پر موجود ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

"وعدہ کیا اللہ تعالی نے ان لوگوں سے جو کہ ایمان لائے تم میں سے اور انہوں نے عمل کیے اچھے البتہ ضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسے خلیفہ بنایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور البتہ ضرور قدرت دے گا ان کے ذریعہ ان کے دین کو وہ دین جو پسند کیا ہے ان کے لیے اور البتہ ضرور بدل دے گا ان کے لیے ان کے خوف کے بعد امن کو وہ میری عبادت کریں گے نہیں شریک کریں گے میرے ساتھ کسی شے کو اور جس نے کفر کیا اس کے بعد پس یہی لوگ نافرمان ہیں۔ اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوۃ اور اطاعت کرو رسول کی (ﷺ) تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

مسئلہ خلافت:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے خلافت کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ قرآن کریم کے نزول کے وقت مخاطب صرف صحابہ کرامؓ تھے۔ دوسری امت اس کی مخاطب نہیں تھی کیونکہ موجود ہی نہیں ہے۔ نہ تابعین موجود تھے نہ تبع تابعین موجود تھے نہ ان سے بعد کے لوگ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے۔

قرآن پاک کی اس نص قطعی کے تحت حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ خلفائے برحق ہیں۔ یہ ساری خوبیاں اسلام کو ان کے دور میں حاصل ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے دین کو خوب پھیلایا اور چمکایا۔ مسند احمد اور مستدرک حاکم میں روایت ہے (آپ ﷺ کے دور میں مسجد نبوی کی تعمیر دو دفعہ ہوئی ہے پہلی دفعہ جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ دوبارہ تعمیر سات ہجری کے بعد ہوئی ہے۔ پہلے بھی کچی تھی دوبارہ بھی کچی تھی (1) دوبارہ جب تعمیر ہوئی اور بنیادیں نکالی گئیں روایت میں ہے) کہ پہلا پتھر آنحضرت ﷺ نے رکھا دوسرا پتھر آنحضرت ﷺ کے حکم

سے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رکھا اور تیسرا پتھر آپ کے حکم سے حضرت عمرؓ نے رکھا، چوتھا پتھر آپ ﷺ کے حکم سے حضرت عثمانؓ نے رکھا۔ اس موقع پر صحابہ کرامؓ کی کافی تعداد موجود تھی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "هٰؤُلَاءِ وُلَاةُ الْاَمْرِ مِنْ بَعْدِیْ" یہ جس ترتیب سے انہوں نے پتھر رکھے ہیں اسی ترتیب سے یہ میرے بعد خلفاء ہوں گے (2) صحیح روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خواب دیکھا اور پیغمبر کا خواب حقیقت ہوتا ہے۔ فرمایا میں نے دیکھا ایک کنواں ہے اس میں بڑا پانی ہے میں اس کنویں سے پانی نکال کر لوگوں کو پلا رہا ہوں۔ میرے بعد ڈول ابو بکرؓ نے پکڑ لیا اور پانی نکال کر لوگوں کو پلایا۔ اس کے بعد ڈول عمرؓ نے پکڑ لیا اور دیکھتے دیکھتے وہ ڈول بڑا ہو گیا۔ فرمایا لَمْ یَفْرِیْ فَرِیَّہٗ "ایسی قوت کے ساتھ پانی نکالنے والا قوی آدمی میں نے نہیں دیکھا" نکالتے گئے پہلے لوگ اپنے جانوروں کو کنویں کے پاس لا کر پانی پلاتے تھے جب حضرت عمرؓ نے ڈول پکڑا تو جانوروں کے باڑوں تک پانی پہنچ گیا۔

حضرت عمرؓ کے دور میں بائیس لاکھ مربع میل رقبہ فتح ہوا۔ پورا مصر، عراق، شام، ایران، افغانستان، کاشغر (آج جو چین کا صوبہ سنکیانک ہے) کی سرحد تک سارا علاقہ اور روم کا کافی حصہ فتح ہو گیا تھا تھوڑا سا رہ گیا تھا بعد میں وہ بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور انہوں نے لوگوں کے گھروں تک وظائف پہنچائے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کی طرف سے ایک ترازو اتری۔ اس کے ایک پلڑے میں مجھے بٹھایا گیا دوسرے پلڑے میں دوسرے لوگوں کو، میرا پلڑا بھاری ہو گیا۔ پھر میری جگہ ابو بکرؓ کو بٹھایا تو ان کا وزن بھاری تھا پھر ابو بکرؓ کی جگہ عمرؓ کو بٹھایا گیا تو ان کا وزن زیادہ تھا پھر حضرت عمرؓ کی جگہ عثمانؓ کو بٹھایا گیا جب تولا گیا تو اوپر سے رسی ٹوٹ گئی۔ یہ اشارہ تھا حضرت عثمانؓ کی شہادت کی طرف کہ ان کے آخری دور میں عبد اللہ ابن سبا یمنی کی ناپاک سازشوں کے تحت بہت کچھ ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔

خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ ہیں:

آنحضرت ﷺ نے خلفاء متعین تو نہیں فرمائے لیکن قرائن سے بتادیا کہ یہ حضرات میرے خلفاء ہیں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بڑی تکلیف تھی ایک عورت مقدمہ لے کر آئی کہ میں نے آپ سے فیصلہ کرانا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا بی بی! مجھے اس وقت تکلیف زیادہ ہے پھر آجانا۔ کہنے لگی حضرت میں دوبارہ آؤں اِنْ لَّمْ اَجِدْكَ تَعْنِي الْمَوْتَ " اگر میں آپ کو نہ پاؤں مراد اس کی موت تھی (یعنی آپ ﷺ کا وصال ہو جائے)، پھر میں کس کے پاس جاؤں ؟" آنحضرت نے فرمایا فَأْتِي أَبَا بَكْرٍ " ابو بکرؓ کے پاس آنا وہ تیرا فیصلہ کریں گے۔" کتنی واضح بات ہے کہ اگر میں نہ ہوں تو پھر فیصلہ صدیق اکبرؓ کریں گے۔ تو یاد رکھنا! قرآن پاک کی اس نص قطعی سے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ خلفاء ہیں۔ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دین کو چمکایا اور پھیلایا۔ ان میں پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بڑی عظمت اور شان عطا فرمائی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے بابا! میرے ساتھ سودا کر لو اپنی دو نیکیاں مجھے دے دو اور میری ساری نیکیاں لے لو۔ ایک غار ثور والی رات کی نیکی اور دوسری آنحضرت ﷺ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد استقامت والی نیکی۔ مشکوۃ شریف اور دیگر کتابوں میں سے روایت ہے کہ رات صاف تھی سب ستارے نظر آرہے تھے حضرت عائشہؓ نے کہا حضرت! کوئی ایسا بندہ ہے جس کی نیکیاں آسمان کے تاروں کے برابر ہوں ؟ دیکھو! کیا ذہن تھا۔ آج کل کی بیوی، بیٹی، ماں، بہن ہوتی تو سوال کرتی کہ کوئی آدمی ایسا ہوگا جس کے پاس اتنے پیسے ہوں جتنے آسمان پر تارے ہیں ؟ ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے طبعی طور پر جس طرح گرمی سردی کا اثر ہوتا ہے اسی طرح نیکی کے ماحول کا بھی اثر ہوتا ہے اور بدی کے ماحول کا بھی اثر ہوتا ہے۔ نیکی کی رفتار چیونٹی کی طرح ہے اور بدی کی رفتار گھوڑے کی طرح ہے۔ تو حضرت عائشہؓ نے کہا حضرت! کسی کی اتنی نیکیاں بھی ہوں گی جتنے آسمان پر تارے ہیں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! وہ عمر ہے رضی اللہ عنہ۔ حضرت عائشہؓ نے کہا حضرت! میرے ابا جی کی نیکیاں ؟ فرمایا عمر کی ساری نیکیاں اور ابو بکر کی ایک نیکی۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا بابا جی! مجھ سے سودا کر لو۔ اپنی دو

نیکیاں مجھے دے دو اور میری ساری نیکیاں لے لو۔ ایک نیکی ہجرت کے سفر والی کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر آپ ﷺ کے ساتھ غارِ ثور میں پہنچے پھر وہاں سے مدینہ طیبہ پہنچے۔ کافروں نے اعلان کیا ہوا تھا کہ جو ان کو زندہ پکڑ کر لائے اس کو دو سو اونٹ انعام میں ملیں گے۔ یا ان کے سر اتار کر لائے تو بھی دو سو اونٹ ملیں گے۔ انعام کی خاطر لوگ پاگلوں کی طرح ٹکریں مارتے تھے۔ اس حالت میں ساتھ دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور حضرت صدیق اکبرؓ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر ساتھ دیا ہے۔

حضور ﷺ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو سات محاذ بن گئے:

آنحضرت ﷺ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو سات محاذ بن گئے۔

1. مسیلمہ کذاب نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا اور ایک محاذ کھول لیا۔
2. اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور محاذ کھول لیا
3. طلیحہ بن خویلد نے نبوت کا دعویٰ کیا اور محاذ کھول کیا
4. ان کو دیکھ کر ایک نوجوان لڑکی جس کا نام سجاح تھا اس نے بھی نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ بھی ہو گئے۔ یہ بھی ایک محاذ تھا۔
5. کچھ لوگ جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے مرتد ہو گئے تھے۔ یہ بھی ایک محاذ تھا۔
6. ایک گروہ نے کہا ہم باقی تمام کام کریں گے مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (سورہ توبہ) "اے نبی کریم ﷺ! آپ ان کے مالوں سے زکوٰۃ وصول کریں۔" آپ ﷺ کو زکوٰۃ لینے کا حکم تھا چونکہ آپ اب نہیں ہیں تو اور کسی کو ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ ایک محاذ یہ ہو گیا۔
7. اور ایک محاذ موتہ کے مقام پر تھا جو آپ ﷺ نے خود نامزد کیا تھا۔

ان تمام محاذوں پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کا مقابلہ تھا۔ صرف ایک محاذ پر یمامہ کے مقام پر تین دن میں سات سو حفاظ کرام شہید ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا حضرت! یہ جو زکوٰۃ نہیں دیتے کلمہ پڑھتے ہیں نمازیں پڑھتے ہیں فی الحال ان کے ساتھ نہ لڑو۔ فرمایا عمر! اَجَبَّارٌ

فِی الْجَاھِلِیَّۃِ وَخَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ "جب کافر تھے تو بڑے بہادر اور دلیر تھے اب آپ ڈھیلی ڈھالی باتیں کرتے ہو اَیَنْقُصُ دِیْنٌ وَاَنَا حَیٌّ میرے سامنے دین کم ہوتا جائے اور میں تماشا دیکھتا رہوں۔ خدا کی قسم! اگر یہ وہ رسی بھی نہیں دیں گے جو زکوۃ کے جانور کے ساتھ ہوتی ہے تو میں ان کے ساتھ لڑوں گا۔"

حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت اور رافضیوں کا رفض:

حضرت صدیق اکبرؓ نے سات محاذوں پر جہاد کیا اور اللہ تعالیٰ نے کامیاب فرمایا اور دین کی حفاظت فرمائی۔ ان حضرات نے دین کو چمکایا ہے۔ یہ خلفاء ہیں آنحضرت ﷺ کے۔ "نہج البلاغۃ" شیعہ کی کتاب ہے اس میں حضرت علیؓ کا خط موجود ہے جو انہوں نے امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کو لکھا۔ فرمایا میری بات ٹھنڈے دل سے سن لو۔ تمہیں علم ہے کہ اسلام سچا مذہب ہے اور قرآن حق ہے۔ آنحضرت ﷺ پر تم بھی ایمان رکھتے ہو اور ہم بھی ایمان رکھتے ہیں آنحضرت ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد انہی مومنوں اور شوریٰ کے لوگوں نے ابو بکرؓ کو خلیفہ بنایا۔ ان کے خلیفہ برحق ہونے کو تم بھی مانتے ہو اور ہم بھی مانتے ہیں اور ابو بکرؓ کے بعد عمرؓ خلیفہ برحق تھے ہم بھی مانتے ہیں اور تم بھی مانتے ہو۔ ان کے بعد انہی لوگوں نے اور شوریٰ نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنایا۔ وہ خلیفہ برحق تھے ہم بھی مانتے ہیں اور تم بھی مانتے ہو۔ اور انہی لوگوں نے مجھے خلیفہ بنایا پھر تم کیوں نہیں مانتے؟ مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ سب کو خلیفہ برحق مانتے ہیں یہ جو روافض نے تفریق ڈالی ہوئی ہے خدا پناہ! اور اس تفریق کو تازہ کیا ہے خمینی نے۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ایک ارب چالیس کروڑ مسلمان کہلانے والے ہیں جن میں رافضیوں کی تعداد دس کروڑ ہے۔ یہ ایران، عراق اور دوسرے علاقوں میں بھی ہیں اور ان کی نشرواشاعت اور پھیلنے کی وجہ دولت ہے۔ چند عقائد ہیں اور متعہ اور تقیہ کے بل بوتے پر یہ چلتے ہیں۔ اسی طرح کچھ قادیانی ہیں، کچھ بابی ہیں، کچھ بہائی ہیں۔ باقی سنیوں میں کچھ کام کے سنی ہیں اور کچھ نام کے سنی ہیں۔ اور یہ باطل فرقے اتنے تیز ہیں کہ ان کے چھوٹے بچے سے بھی کچھ پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا۔ اور ہمارا پڑھا لکھا آدمی بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔

تو اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ان لوگوں سے کہ جو تم میں سے ایمان لائے ہیں صحابہ کرامؓ اور جنہوں نے عمل کیے اچھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضرور خلیفہ بنائے گا جیسا کہ خلفاء بنائے اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلوں میں۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور ان کو قدرت دے گا اور ان کے ذریعے دین کو پھیلائے گا اور چمکائے گا جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ضرور بدل دے گا ان کے خوف کو امن کے ساتھ۔

حضرت عمرؓ کا دور خلافت:

حیرہ عراق میں ایک بہت بڑا مقام ہے۔ یہ بین الاقوامی منڈی تھی۔ حضرت عمرؓ کے دور میں حیرہ کے علاقے سے زیوارت سے لدی ہوئی عورت جاتی تھی اور اس کی طرف کوئی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایسا امن تھا کہ کسی کو نہ مال کا خطرہ اور نہ جان کا خطرہ ہوتا تھا۔ فرمایا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ایک محاذ پر لڑائی زوروں پر تھی اور حضرت عمرؓ نے حضرت خالید بن ولیدؓ کو معزول کر کے حضرت مثنیٰؓ بن حارثہؓ کو کمانڈر بنادیا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہم کر تو کچھ نہیں سکتے مگر آپ کا یہ اقدام ہمارے خیال کے مطابق غلط ہے ایسے قابل جرنیل کو عین لڑائی کے موقع پر معزول کر دیا اور ہو سکتا ہے کہ خالدؓ جذبات میں آکر کافروں کے ساتھ مل جائے۔ جذبات میں آکر آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمہاری ان باتوں نے مجھے مجبور کیا ہے معزول کرنے پر کہ کہتے ہو خالد نے مورچہ فتح کیا، خالد کے ذریعے مورچہ فتح ہوا۔ میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ خالد کوئی چیز نہیں ہے ربِ خالد سب کچھ کرتا ہے۔ اب دیکھنا اس مورچے پر خالد جرنیل نہیں ہو گا پھر بھی اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائیں گے۔ رہی دوسری بات تو خالدؓ اتنا کچا آدمی نہیں ہے کہ عہدے سے معزول ہونے کے بعد وہ اسلام چھوڑ دے گا۔ تو فرمایا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ان ساری نعمتوں کو دیکھنے کے بعد بھی جو

کفر اختیار کرے گا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ اور جس نے کفر کیا اس کے بعد فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ پس یہی لوگ نافرمان ہیں۔ اور ایمان کے ساتھ اچھے اعمال کا بھی ذکر تھا۔ تو اچھے اعمال میں سرفہرست تین عمل ہیں۔

1. پہلا نماز قائم کرنا۔
2. اور زکوۃ ادا کرنا۔ یہ حقوق العباد کے سلسلے میں سے ہے
3. اطاعت کرنا رسول کریم ﷺ کی ہر ہر چیز میں تا کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں

اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون سی ذات وعدوں کا ایفا کرنے والی ہو گی؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کیا اپنے عمل و کردار کے حوالہ سے ان اہل ایمان میں ہم بھی شامل ہیں؟

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

رسول اکرم ﷺ کا پیغام، دنیا کے حکمرانوں کے نام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

غزوہ بدر میں ابو جہل کے قتل ہو جانے کے بعد قریش کی سرداری ابو سفیان نے سنبھال لی اور فتح مکہ تک تمام معرکوں میں وہ قریش کی کمان کرتے رہے لیکن فتح مکہ کے بعد وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد حضرت ابو سفیانؓ اپنے دور جاہلیت کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ حضرت ابو سفیانؓ کے بہت سے واقعات ہیں ان میں سے دو تین بیان کیے جاتے ہیں۔ حضرت عباسؓ بن عبد المطلب بیان فرماتے ہیں جو "البدایہ والنہایہ" میں منقول ہے فرماتے ہیں کہ:

میں ملک یمن میں تجارتی قافلے کے ساتھ گیا ہوا تھا اور اس قافلے میں ابو سفیان بن حرب بھی تھے۔ یمن میں قیام کے دوران ہمارا معمول یہ تھا کہ ایک روز میں کھانا پکا کر ابو سفیان اور قافلے کے دیگر افراد کے پاس لے جاتا اور کھانا کھلاتا اور ایک دن ابو سفیان کھانا پکاتے اور ساتھیوں کو کھلاتے گویا ہم باری باری یہ ذمہ داری نبھاتے ایک دن کہ جب میری ذمہ داری تھی اور میں کھانا پکا رہا تھا تو ابو سفیان بن حرب میرے پاس آئے اور کہا کہ اے ابو الفضل! کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ میرے ڈیرے پر تشریف لائیں اور کھانا بھی وہیں منگا لیں؟ میں نے کہا کہ کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ میں اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ابو سفیان کے ڈیرے پر پہنچ گیا اور کھانے پینے کا سارا سامان وہیں منگا لیا۔

جب سب لوگ کھانا کھا کر فارغ ہو گئے اور چلے گئے تو ابو سفیان نے مجھے اپنے پاس ہی روک لیا اور یوں گویا ہوئے کہ:

هَلْ عَلِمْتَ اَنَّ ابْنَ اَخِیْکَ یَزْعَمُ اَنَّہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ؟

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا بھتیجا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے؟"

میں نے پوچھا کہ میرا کون سا بھتیجا؟

ابوسفیان نے کہا کہ آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟ آپ کے ایک بھتیجے کے علاوہ کون ہے جو یہ بات کہہ سکتا ہے؟

میں نے پوچھا کہ میرا کون سا بھتیجا؟ آپ اس کی نشاندہی تو کریں!

ابوسفیان نے کہا کہ آپ کا بھتیجا محمد جو کہ آپ کے بھائی عبداللہ کا بیٹا ہے۔

میں نے کہا کہ نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں

ابوسفیان نے کہا کہ نہیں بلکہ یہ سچ ہے کہ اس نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

پھر ابوسفیان نے اپنے بیٹے حنظلہ بن ابوسفیان کا بھیجا ہوا خط نکال کر مجھے دکھلایا جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

اِنَّ مُحَمَّدًا قَامَ بِالْاَبْطَحِ غَدْوَةً فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اَدْعُوْكُمْ اِلَى اللّٰهِ

"صبح محمد نے بطحاء مکہ (وادی مکہ) میں کھڑے ہو کر لوگوں کے سامنے اعلان کیا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔"

میں نے کہا اے ابو حنظلہ! ممکن ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہو۔

ابوسفیان جلدی سے گویا ہوئے کہ چپ رہیے ابوالفضل! اللہ کی قسم! خدارا آپ ایسی بات مت کہیں مجھے تو خوف ہے کہ کہیں آپ بھی بغیر سوچے سمجھے اس کے دعوے کی تصدیق نہ کر بیٹھیں۔

پھر ابوسفیان نے کہا اے بنو عبدالمطلب! اللہ کی قسم! قریش کا دعویٰ ہے کہ لوگوں کے لیے تم (یعنی بنو عبدالمطلب) نحوست بھی ہو اور سعادت بھی۔ اے ابوالفضل! میں آپ کو اللہ کی قسم دے کہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے یہ بات نہیں سنی ہے؟

میں نے کہا کہ ہاں سنی تو ہے۔

ابو سفیان نے کہا کہ پھر اللہ کی قسم! یہ (یعنی محمد) تم لوگوں کی طرف سے نحوست ہے۔

میں نے کہا ممکن ہے کہ نحوست کی بجائے سعادت ہو۔

ابھی اس بات کو چند دن ہی گزرے تھے کہ حضرت عبد اللہ بن حذافہ سہمیؓ یہ خبر لے کر یمن پہنچ گئے کہ واقعی محمد ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دین اسلام کا دعویٰ کیا ہے اور وہ خود بھی اسلام قبول کر چکے ہیں۔

پھر تو یمن میں جگہ جگہ اس نئے دین کا چرچا ہونے لگا۔

ایک دفعہ یوں ہوا کہ ابو سفیان بن حرب یمن کے ایک یہودی عالم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے پوچھا کہ اے ابو سفیان! مجھے جو یہ خبر پہنچی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

ابو سفیان نے کہا کہ یہی بات تو میں نے بھی سنی ہے؟

یہودی عالم نے کہا کہ جو آدمی نبوت کا مدعی ہے اس کا چچا یہاں کون ہے؟

ابو سفیان نے کہا کہ میں ہی اس کا چچا ہوں۔

یہودی عالم: کیا تم اس مدعی نبوت کے والد کے بھائی ہو؟

ابو سفیان: ہاں

یہودی عالم: اس مدعی نبوت کے حالات سے مجھے آگاہ کرو!

ابو سفیان: یہ سوال آپ مجھ سے نہ کریں کیوں کہ میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میرا بھتیجا بھی کبھی اس قسم کا دعویٰ کر بیٹھے گا۔ میں اس کو عیب نہیں لگاتا البتہ اتنا ضرور ہے کہ دوسرے اس سے بہتر نہیں ہیں۔

یہودی عالم: پھر تو اس کو کچھ گزند نہیں پہنچنا چاہیے اور یہودیوں کو بھی اس سلسلہ میں کچھ حرج نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت عباس بن عبد المطلب فرماتے ہیں: کہ جب مجھے ابو سفیان اور یہودی عالم کے مابین مکالمے کی خبر پہنچی تو میری حمیت جاگ اٹھی اور دوسرے دن میں جا کر اسی مجلس میں بیٹھ گیا جس میں ابو سفیان اور یہودی عالم بیٹھے ہوئے تھے میں نے یہودی عالم سے پوچھا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نے ہمارے درمیان مدعی نبوت کے چچا کے بارے میں سوال کیا ہے تو ابو سفیان نے کہا کہ میں اس کا چچا ہوں حالانکہ وہ اس کے چچا نہیں بلکہ چچازاد بھائی ہیں البتہ میں اس کا چچا ہوں اور اس کے والد کا سگا بھائی ہوں۔

یہودی عالم نے پوچھا: کہ کیا واقعی آپ مدعی نبوت کے والد کے سگے بھائی ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں میں اس کے والد کا سگا بھائی ہوں۔

چنانچہ وہ یہودی عالم ابو سفیان کی طرف متوجہ ہوا! اور پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے؟

ابو سفیان نے جواب دیا کہ ہاں۔

پھر میں نے کہا کہ آپ مجھ سے میرے بھتیجے کے متعلق جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں اور ہاں اگر میں اس کے بارے میں کوئی جھوٹ بولوں تو پھر یہ ابو سفیان میری گرفت کریں۔

اب یہودی عالم میری طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ:

أُنْشِدُكَ اللّٰهَ! هَلْ فَشَتْ لِابْنِ أَخِيْكَ صَبْوَةٌ وَسَفْهَةٌ؟

"میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کے بھتیجے کے بارے میں ایسی کوئی بات پھیلی ہے کہ وہ بچوں کی سی حرکتیں کرتا ہے یا نادانی کرتا ہے؟

میں نے کہا کہ:

لَا وَإِلٰهِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! وَلَا كَذَبَ وَلَا خَانَ وَكَانَ اسْمُهُ عِنْدَ قُرَيْشٍ الْأَمِيْنُ

"نہیں نہیں، عبد المطلب کے معبود کی قسم! کبھی اس نے جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی اس نے خیانت کی، اور قریش اسے امین کے نام سے پکارتے ہیں۔"

یہودی عالم نے پوچھا کہ کبھی اس نے اپنے ہاتھ سے کوئی چیز لکھی؟

حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے اثبات میں جواب دینا چاہا لیکن فوراً سنبھل گیا کہ میرے پیچھے سفیان بن حرب موجود ہیں اگر میں جھوٹ بولوں گا تو فوراً وہ مجھے جھٹلا دیں گے۔ چنانچہ میں نے اس کو جواب دیا کہ نہیں اس کو لکھنا نہیں آتا۔

یہ سننا تھا کہ یہودی عالم اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی چادر چھوڑ کر باآواز یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ:

ذُبِحَتْ يَهُوْدُ! قُتِلَتْ يَهُوْدُ

"یہود ذبح کر دیے گئے! یہود قتل کر دیے گئے۔"

حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم اپنے ڈیرے میں واپس آئے تو ابوسفیان نے مجھ سے کہا کہ اے ابوالفضل! یہود آپ کے بھتیجے سے خوف زدہ ہیں۔

میں نے کہا کہ اے ابوسفیان! ایسا کیوں نہ ہو کہ آپ بھی اس پر ایمان لے آئیں، اگر وہ نبی برحق ہو گا تو آپ سبقت کرنے والوں میں سے ہوں گے اور اگر وہ بالکل باطل ہو گا تو آپ کے علاوہ آپ کے ہم مثل دیگر لوگ بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

ابوسفیان نے کہا کہ:

لَا وَاللّٰهِ! مَا أُوْمِنُ بِهٖ حَتّٰى أَرَى الْخَيْلَ تَطْلُعُ مِنْ كَدَاءٍ

"اللہ کی قسم! نہیں میں اس پر ایمان نہیں لا سکتا یہاں تک کہ میں گھوڑوں کو کداء (مکہ کے ایک پہاڑ کا نام) سے آتے ہوئے نہ دیکھ لوں۔"

میں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

ابوسفیان نے کہا:

كَلِمَةٌ وَاللّٰهِ جَاءَتْ عَلٰى فَمِيْ مَا أَلْقَيْتُ لَهَا بَالًا إِلَّا أَنِّيْ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ لَا يَتْرُكُ خَيْلًا تَطْلُعُ مِنْ كَدَاءٍ

"اللہ کی قسم! یہ کلمہ بے ارادہ میری زبان سے نکل گیا میں نے قصداً نہیں کہا ہے ہاں مجھے اتنا ضرور یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ گھوڑوں کو کداء، پہاڑ سے نہیں آنے دے گا۔"

پھر جب رسول اکرم ﷺ نے مکہ کو فتح کیا تو ہم نے گھوڑوں کو کداء سے آتے دیکھا اس وقت میں نے ابو سفیان سے کہا کہ اے ابو سفیان! کیا آپ کو وہ کلمہ یاد ہے جو آپ نے مجھ سے کہا تھا؟

ابو سفیان نے کہا کہ

واللہ انی ذاکرھا! فالحمد للہ الذی ھدانی للاسلام

"اللہ کی قسم! مجھے وہ کلمہ یاد ہے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے اسلام کی ہدایت دی۔" (سیرت حلبیہ اردو، ج ۱، ص ۵۸۸، سنہرے اوراق، ص ۵ تا ۱۰)

حضرت ابو سفیانؓ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے ہیں اس سے قبل وہ اسلام کے بڑے دشمنوں میں سے تھے یہاں ان کے ایمان لانے کی داستان بھی فائدے اور دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی جس کا ذکر کتب سیر میں موجود ہے ہم سیر الصحابہ کے حوالہ سے یہاں نقل کرتے ہیں (سیر الصحابہ، ج ۷، ص ۲۸۱) میں ہے کہ

سن ۸ھ میں جب آنحضرت ﷺ نے تطہیر کعبہ کی غرض سے مکہ پر فوج کشی کا ارادہ کیا تو اگرچہ اسے مخفی رکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا مگر پھر بھی مکہ میں آپ ﷺ کی آمد کی خبریں پہنچ گئیں۔ جن مشرکین اور قریش کے جابرین نے آپ ﷺ کو نہایت بے کسی کی حالت میں اس ارض مقدسہ سے جلاوطن کیا تھا اس وقت وہ بھی اپنے انجام سے بہت گھبرائے کیونکہ اسلام کے سیلاب کو روکنا اب ان کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ پہنچ کر مر ظہران میں قیام فرمایا۔ ابو سفیان حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء تحقیق کے لیے نکلے دور سے دیکھا کہ مر ظہران کا میدان رات کی تاریکی میں روشنی کی کثرت کی وجہ سے وادی ایمن بنا ہوا ہے۔ ابو سفیان نے کہا کہ یہاں گویا کہ عرفہ کی طرح روشنی ہو رہی ہے بدیل نے کہا کہ بنی عمرو آگ روشن کیے ہوئے ہیں ابو سفیان نے کہا کہ ان کی تعداد اتنی کہاں ہے الخ۔

اگرچہ قریش نے مسلمانوں پر بڑی ستم آرائیاں کی تھیں پھر بھی وہ رسول اللہ ﷺ اور اکثر اکابر صحابہؓ کے ہم خاندان تھے اور ان میں ان کے اعزاء واقرباء بھی موجود تھے اس

لیے حضرت عباسؓ کے دل میں خیال آیا کہ اگر آنحضرت ﷺ مکہ میں داخل ہو گئے اور قریش نے پہلے سے جان و مال کی امان نہ لی تو سب تباہ ہو جائیں گے چنانچہ وہ اس تلاش میں نکلے کہ اگر مکہ جانے والا کوئی آدمی مل گیا تو اس کی زبانی قریش سے کہلا بھیجیں گے کہ رسول اللہ ﷺ مرظہران تک پہنچ چکے ہیں وہ لوگ آکر جان بخشی کرا لیں۔ اتفاق سے حضرت عباسؓ اسی سمت گئے جدھر ابو سفیان اور بدیل تھے ابو سفیان کی آواز سن کر حضرت عباسؓ نے اس کو پکارا اس نے آواز پہچان کر کہا ابو الفضل؟ حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ ہاں میں ہوں۔

ابو سفیان بولا کہ میرے ماں باپ فدا ہوں آپ یہاں کہاں ہو؟ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان آگئے ہیں ابو سفیان نے سراسیمہ ہو کر کہا کہ پھر کوئی تدبیر بتلاؤ حضرت عباسؓ نے ان کے دو ساتھیوں کو لوٹا دیا اور انہیں عفو تقصیر کے لیے اپنے ساتھ روانہ کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے

حضرت عباسؓ ابو سفیان کو لے تو گئے مگر وہ اشتہاری مجرم تھا اور تمام مسلمان اس سے خار کھاتے تھے روشنی کی کثرت اور زیادہ راز فاش کیے دیتی تھی۔ قدم قدم پر لوگ سوال کرتے تھے کہ کون ہے؟ لیکن پھر رسول اللہ ﷺ کا اونٹ اور حضرت عباسؓ کو دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں حضرت عباسؓ لوگوں کی نظروں سے بچتے آرہے تھے لیکن وہ حضرت عمرؓ کی قیام گاہ کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے ابو سفیان کو پہچان لیا اور جوش غضب میں بے تاب ہو کر چلائے کہ اے دشمن خدا! خدا کا شکر ہے کہ اس نے بغیر کسی عہد و پیمان اور ذمہ داری کے تجھ پر قابو دے دیا مگر حضرت عباسؓ ساتھ تھے اس لیے حضرت عمرؓ سیدھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں گئے لیکن حضرت عباسؓ ان سے قبل ہی پہنچ چکے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ ابو سفیان ہے خدا نے بغیر کسی عہد و پیمان کے اسے ہمارے حوالے کر دیا ہے اجازت دیجئے کہ اس دشمن خدا کی گردن اڑا دوں۔

حضرت عباسؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے اس کو امان دی ہے اور وہ ابوسفیان کا سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ برابر ابوسفیان کے قتل پر مصر تھے ان کا اصرار دیکھ کر حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ اے عمر! اگر تمہارے قبیلے کا کوئی شخص ہوتا تو تم اتنا اصرار ہرگز نہ کرتے لیکن تمہیں بنی عبد مناف کی کیا پرواہ؟

• حضرت عمرؓ نے اس طنز کے جواب میں کہا کہ اے عباسؓ! خدا کی قسم مجھے تمہارے اسلام لانے کی اتنی خوشی ہوئی کہ اپنے باپ خطاب کے اسلام لانے سے نہ ہوتی۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ اس وقت انہیں لے جا کر اپنے پاس سلاؤ صبح کو فیصلہ کیا جائے گا۔[3]

اس ارشاد پر حضرت عباسؓ ابوسفیان کو ساتھ لے گئے رات بھر اپنے پاس رکھا اور صبح کو حسبِ ارشاد بارگاہ نبوی میں لا کر حاضر کیا اس وقت اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن آنحضرت ﷺ کے خون کا پیاسا جس نے آپ ﷺ کی تحقیر و تذلیل (اور جان لینے میں کوئی تامل نہ کیا تھا مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں اسلام کے استیصال میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا بے کس ولاچار اور بے حامی و مددگار بارگاہ رسالت میں حاضر تھا اور رحمۃ للعالمین کے دامن عفو و کرم کے علاوہ دنیا میں اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی بارگاہ رسالت میں اس سنگین مجرم کے لیے قتل کی سزا تجویز نہیں ہوئی، قید خانہ کی چاردیواری میں بند نہ کیا گیا، جلاوطنی کا حکم نہیں ملا بلکہ "وما ارسلناك الا رحمة للعالمين" کی عملی تفسیر ہوتی ہے فرماتے ہیں کہ اے ابوسفیان! افسوس کا مقام ہے کہ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کرو؟ اس سوال پر وہ زبان جو نہ معلوم رسول اللہ ﷺ کے دل پر کتنی مرتبہ تیر و نشتر لگا چکی تھی یوں گویا ہوئی کہ "میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ کتنے شریف اور کتنے بڑے صلہ رحمی کرنے والے ہیں خدا کی قسم! اگر خدا کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو آج میرے کام نہ آتا" پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ابوسفیان تمہاری حالت قابل افسوس ہے کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم مجھے خدا کا رسول مانو؟ جاہلی حمیت اور قومی عصبیت اب

بھی اعتراف رسالت کی اجازت نہیں دیتی۔ جواب ملتا ہے کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ کس قدر حلیم، کس قدر شریف اور کس قدر صلہ رحمی کرنے والے ہیں خدا کی قسم! ابھی تک مجھے اس میں شک ہے۔ حضرت عباسؓ یہ جاہلی حمیت دیکھ کر اسے ڈانٹتے ہیں کہ

"اے ابوسفیان! اس سے پہلے کہ سر تن سے جدا ہو "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہہ لو!"

حضرت عباسؓ کی ڈانٹ پر ابوسفیان کلمہ توحید پڑھ لیتے ہیں اور وہ سر جو جاہلی رعونت کی وجہ سے خدا کے سامنے جھکتا بھی نہ تھا آستان نبوی پر خم ہو جاتا ہے اور آنحضرت ﷺ نہ صرف ابوسفیان کی جان بخشی کا اعلان فرماتے ہیں بلکہ ان کے اس گھر کو جس میں بارہا مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہو چکی تھیں رسول اللہ ﷺ کے قتل کے مشورے ہو چکے تھے "مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ" کے اعلان کرم سے بیت الامن قرار دیتے ہیں۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عباسؓ انہیں لے کر لوٹنے لگے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال اور مسلمانوں کی شان و شوکت کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اس ارشاد پر حضرت عباسؓ نے انہیں لے جا کر کھڑا کر دیا تھوڑی دیر کے بعد دریائے اسلام میں طلاطم پیدا ہوا ہر قبیلے کے پرچم گزرنے لگے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ، ندیم اور اسلم کے بعد دیگرے ہتھیاروں میں ڈوبے تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے گزرے سب سے آخر میں انصار کا قبیلہ اس شان سے پرچم لہراتا ہوا نکلا کہ ابوسفیان متحیر ہو گئے اور پوچھا کہ یہ پرچم کس کا ہے حضرت عباسؓ نے نام بتلایا دفعتاً سردار فوج حضرت سعد بن عبادہؓ ہاتھ میں علم لیے ہوئے برابر سے گزرے۔ ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے الیوم یوم المذحمة الیوم تستحل الکعبة "آج گھمسان کا دن ہے آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔"

ابوسفیان گھبرا گئے اور حضرت عباسؓ سے کہا کہ "آج میری حفاظت تمہارے اوپر فرض ہے۔"

سب سے آخر میں کوکبہ رسالت نمودار ہوا حضرت زبیر بن عوامؓ کے ہاتھ میں علم تھا آنحضرت ﷺ ابوسفیان کے قریب سے گزرے اور جمال مبارک پر ان کی نظر پڑی تو باآواز بلند پکار کر کہا کہ آپ کو معلوم ہے ابھی سعد بن عبادہؓ کیا کہہ رہے تھے؟ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا کہہ رہے تھے؟

ابوسفیان نے بتلایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"غلط ہے بلکہ آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے آج اس پر غلاف چڑھایا جائے گا۔"

(بخاری کتاب المغازی، باب ابن رکز النبی ﷺ الرایۃ یوم الفتح)

ایک واقعہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے ان سے روایت کیا ہے اور امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کے پہلے باب میں اسے نقل کیا ہے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب جناب نبی اکرم ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان حدیبیہ میں دس سال تک آپس میں جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ اور عارضی مصالحت کے اس دور میں جہاں جناب نبی اکرم ﷺ مختلف علاقوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو اسلام کی دعوت کے خطوط بھجوا رہے تھے وہاں مکہ کے قریشی بھی تجارت کے لئے آزادانہ گھوم پھر رہے تھے۔

رسول اکرم ﷺ نے اس وقت کی ایک بڑی بلکہ سب سے بڑی سلطنت رومن ایمپائر کے حکمران ہرقل کو بھی، جو قیصر روم کہلاتا تھا، دعوت اسلام کا خط بھجوایا۔ یہ خط حضرت دحیہ کلبیؓ لے کر گئے۔ شام اس دور میں رومی سلطنت کا حصہ تھا اور قیصر روم شام کے دورے پر ایلیا میں آیا ہوا تھا۔ جبکہ جناب ابوسفیان بھی ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ وہیں قیام پذیر تھے۔ آنحضرت ﷺ کا ہرقل کے نام خط لے کر حضرت دحیہ کلبیؓ وہاں پہنچے۔ ہرقل کو اطلاع دی گئی کہ حجاز سے ایک قاصد آیا ہوا ہے جو نئے نبی حضرت محمد ﷺ کا خط اسے پیش کرنا چاہتا ہے۔ ہرقل نے خط وصول کرنے سے قبل حضور ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو ضروری سمجھا اور اپنے اہلکاروں سے کہا کہ ان کے علاقے سے اگر کچھ لوگ یہاں آئے ہوئے ہوں تو انہیں میرے پاس لایا جائے تاکہ میں ان سے ان کے نبی کے

بارے میں دریافت کر سکوں۔ سرکاری کارندوں نے جناب ابوسفیان کو ڈھونڈ نکالا اور انہیں قیصر روم کے دربار میں پیش کر دیا۔ حضرت ابوسفیانؓ فرماتے ہیں کہ قیصر روم نے ہمیں دیکھ کر کہا کہ تم میں سے جو شخص اس نئے نبی سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا ہو وہ آگے آجائے جس پر میں آگے بڑھ گیا اور باقی ساتھی میرے پیچھے تھے۔

قیصر نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے کچھ سوالات کروں گا۔ ان کے صحیح جواب دینا۔ اور میرے ساتھیوں سے کہا کہ اگر یہ کسی سوال کے جواب میں غلطی کرے تو تم اسے ٹوک دینا۔ اس کے بعد قیصر روم نے سوالات کیے جنہیں ترتیب وار پیش کیا جارہا ہے۔

قیصر: اس شخص کا خاندان اور نسب کیا ہے؟

ابوسفیان: یہ معزز ترین خاندان سے ہے۔

قیصر: اس خاندان میں پہلے کوئی بادشاہ گزرا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس کے خاندان میں پہلے کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس کے پیروکار کمزور لوگ ہیں یا خوشحال؟

ابوسفیان: کمزور لوگ زیادہ ہیں۔

قیصر: ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟

ابوسفیان: دن بدن بڑھ رہی ہے۔

قیصر: کوئی شخص اس پر ایمان لانے کے بعد مرتد بھی ہوا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: تمہیں اس شخص پر کبھی جھوٹ کا شک گزرا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: کبھی [illegible] اس نے غداری کی؟

ابوسفیان: ہم اس وقت معاہدہ کے دور سے گزر رہے ہیں، دیکھیں کیا کرتا ہے۔

قیصر: تمہاری کبھی جنگ بھی ہوئی اور کیا نتیجہ نکلا؟

ابوسفیان: متعدد جنگیں ہوئیں، کبھی وہ جیتا اور کبھی ہم۔

قیصر: اس کی تعلیمات کیا ہیں؟

ابوسفیان: وہ کہتا ہے کہ ایک اللہ کی بندگی کرو، تمہارے باپ دادا نے جو بت بنا رکھے ہیں انہیں چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ نماز پڑھو، سچائی اختیار کرو، پاک دامن رہو، صلہ رحمی کرو، امانت ادا کرو، اور وعدہ پورا کرو۔

اس پر قیصر روم نے اپنے سوالات پر عمومی تبصرہ کیا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے کوئی نبی یا بادشاہ قریب زمانہ میں گزرا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ صاحب اس کی نقل کر رہے ہیں اور اس طریقہ سے بادشاہت دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ باقی باتیں جتنی بتائی گئی ہیں وہ انبیاء ہی کے شایان شان ہیں کہ ان کا تعلق شریف اور معزز خاندانوں سے ہوتا ہے اور ان پر ایمان لانے والا کوئی شخص انہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ انبیاء سچے لوگ ہوتے ہیں۔ معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں، ان کے ساتھ جنگوں میں اتار چڑھاؤ کے معاملات رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبروں کی تعلیمات وہی ہوتی ہیں جو تم نے ان صاحب کے حوالہ سے بتائی ہیں۔ اس تبصرہ کے بعد قیصر روم نے کہا کہ میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ تم نے کہا ہے اگر یہ سب اسی طرح ہے تو یہ شخص میرے ان قدموں کی جگہ کا مالک ہو کر رہے گا۔ اور اگر میرے بس میں ہو تو میں ان صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے پاؤں خود اپنے ہاتھوں سے دھوؤں۔ اس موقع پر قیصر روم نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس بات کا اندازہ تو تھا کہ ایسے ایک پیغمبر کا ظہور ہونے والا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ پیغمبر تم عربوں میں سے ہوگا۔

حضرت ابوسفیانؓ کہتے ہیں کہ قیصر روم نے ان سے سوالات کرنے بعد تبصرہ کیا اور اس کے بعد حضرت دحیہ کلبیؓ نے بادشاہ کو جناب نبی اکرم ﷺ کا گرامی نامہ پیش کیا جس کا مضمون یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من محمد بن عبد اللہ و رسولہ الی ھرقل عظیم الروم،

سلام علی من اتبع الھدی اما بعد!

فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یوتک اللہ اجرک مرتین وان تولیت فان علیک اثم الاریسیین یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیأ ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔

(مسلم مترجم علامہ وحید الزمان کتاب الجہاد والسیر، نعمانی کتب خانہ، لاہور، ج ۵، ص ۴۴)

(فتح الباری، ج ۱، ص ۳۵)

اللہ کے بندے اور رسول محمد ﷺ کی طرف سے روم کے بادشاہ ہرقل کے نام "سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرلو سلامتی پا جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اجر عطا فرمائیں گے۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو اریسیین کا گناہ تجھ پر ہوگا۔ اے اہل کتاب آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اور ہم میں سے کچھ لوگ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا رب نہ بنائیں۔ پس اگر وہ اہل کتاب اعراض کریں تو تم (اہل اسلام) کہہ دو کہ ہم تو اس بات کو قبول کرنے والے ہیں۔"

(بحوالہ سیرت المصطفیٰ، ج دوم، ص ۳۷۸)

حضرت ابوسفیانؓ کہتے ہیں کہ قیصر روم کی یہ باتیں سن کر دربار میں ہر طرف شور مچ گیا اور مختلف اطراف سے آوازیں بلند ہونے لگیں جس پر ہمیں دربار سے نکال کر دروازے بند کر دیے گئے۔ میں نے باہر آتے ہی اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ کی بات تو پوری ہونے لگی ہے۔ رومیوں کا بادشاہ بھی اس سے خوف کھاتا ہے۔ اس کے بعد میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اب اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ حتیٰ کہ اسلام میرے دل میں داخل ہو گیا اور میں نے بالآخر اسلام قبول کرلیا۔ ابو کبشہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے خاوند کو کہا جاتا تھا جو آنحضرت ﷺ

کی رضاعی ماں تھیں۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت حلیمہ سعدیہؓ کا بچپن میں دودھ پیا تھا جس کی نسبت سے حضرت ابو کبشہ جناب نبی اکرم ﷺ کے رضاعی باپ بن گئے تھے۔ مشرکین مکہ اس وجہ سے حقارت آمیز لہجہ میں آنحضرت ﷺ کو ابو کبش کا بیٹا کہا کرتے تھے۔

آپ ﷺ کا خط پڑھے جانے کے بعد دربار میں شور و غوغا ہوا تو ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں کو دربار سے نکال کر دروازے بند کر دیے گئے۔ لیکن بادشاہ کے دربار میں کیا ہوا؟ وہ شام کے اس وقت کے چیف پادری ابن ناطورا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، جو بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی اس روایت میں مذکور ہے۔

ابن ناطورا اس واقعہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیصر روم ہرقل بادشاہ ایک روز صبح کے وقت انتہائی ست اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ قریبی ساتھیوں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ میں رات ستاروں کو دیکھ رہا تھا تو ستاروں کی چال سے مجھے معلوم ہوا کہ ملک الختان کا ظہور ہو گیا ہے یعنی ختنے والوں کا بادشاہ ظاہر ہو گیا ہے اور اس کے غلبہ کا دور شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ ختنہ کرنے والے لوگ کون اور کہاں ہیں؟ سرکاری پادریوں اور مصاحبوں نے جواب دیا کہ یہودی ختنہ کرتے ہیں لیکن وہ تو اس پوزیشن میں نہیں کہ ہمیں پریشان کر سکیں۔ وہ بہت تھوڑی تعداد میں ہیں، آپ مدائن کے حاکم کو حکم دیں وہ ان کا خاتمہ کر دے گا۔ اس دوران غسان کے بادشاہ نے قیصر روم کو خبر دی کہ حجاز میں ایک نئے نبی کا ظہور ہوا ہے۔ قیصر نے دریافت کیا کہ کیا یہ لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ جواب ملا کہ ہاں ان کے ہاں ختنہ ہوتا ہے۔ تو اس وقت سے قیصر روم کے دل میں جناب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بات بیٹھ گئی۔

ابن ناطورا کے مطابق ہرقل بادشاہ نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ اس امت کا اور نسل انسانی کا بادشاہ ہے جو ظاہر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ہرقل نے اپنے ایک صاحب علم اور ساتھی کو ساری تفصیل لکھ کر روانہ کی اور ان سے رائے چاہی جبکہ بادشاہ خود حمص کی طرف روانہ ہو گیا۔ [illegible] حمص [illegible] اس کے صاحب علم ساتھی کا جواب آ گیا [illegible] نے

ہرقل کی رائے کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ مکہ میں جس کا ظہور ہوا ہے وہ واقعی نبی (ﷺ) ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے حمص کے ایک ہال میں روم کے سرداروں کو جمع کیا اور ان کو ساری بات بتاتے ہوئے کہا کہ اگر تم فلاح اور رشد چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بادشاہت قائم رہے تو اس نبی (ﷺ) کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔ یہ سن کر ہال میں شور مچ گیا، طرح طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور بہت سے لوگ وحشی گدھوں کی طرح ہال سے باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ اس پر ہرقل بادشاہ نے انہیں باہر جانے سے روکا اور کہا کہ ٹھہرو میں تو یہ باتیں تمہارے امتحان کے لئے کر رہا تھا تاکہ تمہارے ایمان کی مضبوطی دیکھوں اور وہ میں نے دیکھ لی ہے۔ قیصر روم کے اس اعلان پر درباریوں کے قدم رک گئے اور وہ واپس آکر بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔

(تفصیلات کے لیے دیکھیے سیرت المصطفیٰ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، ج دوم، ص ۳۷۸۔)

یوں سچ اور اقتدار کے درمیان وہ کشمکش اپنے انجام کو پہنچی جس نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے مطلق العنان حکمران کے ذہن میں کچھ عرصہ سے ہلچل مچا رکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقتدار والوں کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں اور وہ ایک حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اس کے اعتراف سے کیوں رک جاتے ہیں۔

آج پھر تاریخ خود کو دہرا رہی کہ نسل انسانی اخلاقی، معاشرتی اور معاشی طور پر ہولناک تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ استحصال اور ظلم و غصب نے عالمی نظام کے خوشنما لیبل کے ساتھ پورے انسانی معاشرہ پر اپنے خونی پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ہر طرف افراتفری اور جبر و تشدد کا دور دورہ ہے۔ پسے ہوئے طبقات دنیا کے ہر خطے میں کسی نجات دہندہ کی راہ تک رہے ہیں، اور اعلیٰ دانش گاہوں میں موجود ورلڈ سسٹم کی ناکامی اور تباہ کاریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے متبادل سسٹم کی تلاش جاری ہے۔ یہ بات اب ہر ایک کی سمجھ میں آرہی ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی کی طرف واپسی کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ اور یہ بھی ہر ایک کو معلوم ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور وحی الٰہی کا محفوظ ذخیرہ صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔ اس کے لئے جناب نبی اکرم ﷺ کا گرامی نامہ تاریخ کے ایک عظیم الشان

ریکارڈ کے طور پر آج کے قیصروں، بادشاہوں اور حکمرانوں کو بھی مسلسل دعوت دے رہا ہے کہ اَسْلِمْ تَسْلَمْ "اسلام قبول کرلو سلامتی پاجاؤ گے۔"

لیکن بات یہ ہے کہ جب مسلم ممالک کے دارالحکومتوں میں بیٹھے ہوئے حکمران اس پیغام کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو دوسروں سے اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ آج کے مسلمان حکمران انسانی سوسائٹی پر اسلامی احکام و قوانین کی عملداری میں سب سے بڑی روکاٹ ہیں۔ وہ جناب نبی اکرم ﷺ کا کلمہ پڑھتے ہوئے، آپ ﷺ کی محبت کا دم بھرتے ہوئے، اور آپ ﷺ کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بھی اس آخرالزمان پیغمبر ﷺ کے سلامتی کے پیغام کے حوالہ سے "قیصر روم" بنے بیٹھے ہیں۔ مگر تاریخ کسی ایک جگہ رک نہیں جایا کرتی، وہ اپنی طبعی رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور "قیصر" اپنی تمام تر شوکت وسطوت کے باوجود اس کے دھندلکوں میں گم ہو جایا کرتے ہیں۔

حواشی

1. بخاری کتاب المغازی غزوۂ فتح مکہ
2. ابوداؤد کتاب الخراج باب ماجاء فی فتح مکہ
3. سیرۃ ابن ہشام ج ۲، ص ۲۳۴، ۲۳۳
4. سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۲۳۵ وفی البخاری ایضاً مختصراً جداً، مسلم کتاب الجہاد والسیر باب فتح مکہ

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

میں شیخ زید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا شکر گزار ہوں کہ جناب رسالت مآب ﷺ کی سیرت طیبہ کے موضوع پر منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں شرکت اور گفتگو کے اعزاز سے نوازا اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہمارے مل بیٹھنے کو قبول فرماتے ہوئے کچھ مقصد کی باتیں کہنے، سننے اور پھر ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

مجھے گفتگو کے لیے "سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم" کا عنوان دیا گیا ہے جس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ حتیٰ کہ تذکرہ بھی اس مختصر وقت میں ممکن نہیں ہے اس لیے بہت سے امور کو نظر انداز کرتے ہوئے چند ایک ایسے سوالات کا جائزہ لینا چاہوں گا جو جہاد کے حوالے سے آج کے دور میں عالمی سطح پر موضوع بحث ہیں اور ان کے بارے میں مثبت اور منفی طور پر بہت کچھ لکھا اور کہا جارہا ہے۔

"جہاد" کا لفظ لغوی مفہوم کے حوالے سے کوشش، محنت و مشقت اور تگ ودو کی مختلف شکلوں کا احاطہ کرتا ہے اور اسے دینی پس منظر میں لیا جائے تو اسلام کی سربلندی، دعوت و تبلیغ، ترویج و تنفیذ، اور تحفظ و دفاع کے لیے کی جانے والی مختلف الانواع عملی کوششوں کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنی خواہشات پر کنٹرول اور نفس کی اصلاح کی مساعی پر بھی جہاد کا لفظ بولا گیا ہے جس کی قرآن و سنت میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن جہاد کا ایک خصوصی مفہوم "جنگ" اور "محاربہ" بھی ہے جسے قرآن کریم میں "جہاد فی سبیل اللہ" اور "قتال" کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے اور سینکڑوں آیات قرآنی اور ہزاروں احادیث نبویہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور اس "جہاد" کے فضائل، احکام، مسائل

اور مقصدیت پر قرآن و سنت میں پورے اہتمام کے ساتھ جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ہے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کافروں کے خلاف میدان جنگ میں صف آرا ہو کر ہتھیاروں کے ساتھ ان سے معرکہ آرائی کرنا اور قتل و قتال کے ذریعے سے کفر پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا جس کی اہمیت و فضیلت پر قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ کی سینکڑوں تصریحات گواہ ہیں۔ اور اس کو آج کے دور میں اس وجہ سے سب سے زیادہ تنقید و اعتراض کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ جدید عقل و دانش کے نزدیک عقیدہ و مذہب کے فروغ اور غلبہ کے لیے ہتھیار اٹھانا تہذیب و تمدن کے تقاضوں کے خلاف ہے اور ایسا کرنا بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے دائرے میں آتا ہے۔

اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ عقیدہ و مذہب کے لئے ہتھیار اٹھانے اور باطل مذاہب پر حق مذہب کی بالادستی کے لیے عسکری جنگ لڑنے کا آغاز حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا بلکہ جہاد کا یہ عمل آسمانی ادیان میں پہلے سے تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے اس حوالے سے تاریخ میں کسی نئے عمل اور اسلوب کا اضافہ کرنے کے بجائے آسمانی مذاہب کی ایک مسلسل روایت کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ جس طرح قرآن کریم میں جہاد اور مجاہدین کا تذکرہ پایا جاتا ہے، اسی طرح بائبل میں بھی ان مجاہدین اور مذہبی جنگوں کا ذکر موجود ہے جو بنی اسرائیل نے اپنے مذہب کے دفاع اور اپنی آزادی اور تشخص کے تحفظ کے لیے لڑیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں فرمایا:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ

"پھر جب طالوت لشکروں کو لے کر چلا تو فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لینے والا ہے ایک نہر سے پس جس نے پانی پی لیا اس نہر کا پس وہ میرے ساتھیوں میں سے نہیں ہے اور

جس نے نہ چکھا اس کا پانی۔ پس بے شک وہ میرے ساتھ ہے کہ وہ شخص جس نے بھرا ایک چلو صرف ایک ہاتھ سے بس پیا انہوں نے اس نہر کے پانی سے مگر بہت تھوڑوں نے ان میں سے پس جب پار کر گئے اس نہر کو وہ یعنی طالوتؑ اور وہ جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ کہنے لگے کہ نہیں طاقت ہمارے لیے آج کے دن جالوت کے مقابلے میں اور اس کے لشکروں کے مقابلے میں کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے بے شک وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں کتنی ہی چھوٹی جماعتیں غالب آجاتی ہیں بہت ساری بڑی جماعتوں پر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

قرآن کریم نے ان آیات میں فلسطین کی سرزمین پر لڑی جانے والی اس مقدس جنگ کا تذکرہ کیا ہے جو جالوت جیسے ظالم حکمران کے خلاف حضرت طالوت علیہ السلام کی قیادت میں لڑی گئی اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت بادشاہ کا معجزانہ طور پر خاتمہ ہوا۔ اس جنگ کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے اور اس میں حضرت طالوت علیہ السلام کو ساؤل بادشاہ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

اس لئے اگر آج کی جدید دانش کو مذہب کے نام پر ہتھیار اٹھانے پر اعتراض ہے تو اس کا ہدف صرف قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی نہیں بلکہ اصولی طور پر بائبل اور بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ اس کی زد میں ہے، صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ بائبل کے ماننے والوں نے بائبل پر ایمان کے دعوے کے باوجود اس کے علمی احکام اور ماضی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے جبکہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے تمام تر عملی کمزوریوں کے باوجود اپنے ماضی اور قرآنی احکام و تعلیمات سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس وضاحت کے بعد جہاد کی مقصدیت کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جہاد کا مقصد آنحضرت ﷺ نے اعلاء کلمۃ اللہ قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جس کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی میں حکم اور قانون کا درجہ انسانی خواہشات اور ظن و گمان کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور آسمانی تعلیمات کو حاصل ہونا چاہیے۔ اور

کلمۃ اللہ کی اسی سربلندی کے لیے قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ نے آسمانی مذاہب کی ان دینی معرکہ آرائیوں کے تسلسل کو باقی رکھا ہے تاکہ کسی دور میں بھی انسانی خواہشات اور عقل و گمان کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر غلبہ حاصل نہ ہونے پائے اور انسانی سوسائٹی پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی عمل داری کے جس مشن کے لیے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ اس میں تعطل واقع نہ ہو۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک ارشاد مبارکہ میں یہ کہہ کر اس جدوجہد کے قیامت تک جاری رہنے کا اعلان فرمادیا ہے کہ الجہاد ماض الی یوم القیامۃ۔ (جہاد قیامت تک جاری رہے گا)

یہ فکر و فلسفہ کی جنگ ہے۔ اسلوب زندگی کی معرکہ آرائی ہے، اور تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے جس میں شروع سے آسمانی مذاہب کا یہ موقف رہا ہے اور اب آسمانی مذاہب و ادیان کے حقیقی وارث کی حیثیت سے اسلام کا موقف بھی یہی ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہنمائی اور اس کے مسائل کے حل کے لیے انسانی خواہشات اور عقل و دانش تنہا کفایت نہیں کرتیں بلکہ ان پر آسمانی تعلیمات کی نگرانی ضروری ہے کیونکہ اس "چیک اینڈ بیلنس" (Check & Balance) کے بغیر انسانی خواہشات اور انسانی عقل کے لیے پوری نسل انسانی کی ضروریات و مفادات میں توازن قائم رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تہذیب جدید نے آسمانی تعلیمات سے دستبرداری کا اعلان کر کے خواہشات اور عقل ہی کو تمام امور کی فائنل اتھارٹی قرار دے رکھا ہے جس سے توازن بگڑ گیا ہے۔ اجتماعی اخلاقیات دم توڑ گئی ہیں۔ طاقت کا بے لگام گھوڑا وحی الٰہی کی لگام سے آزاد ہو گیا ہے۔ اور پوری دنیا میں ہر طرف جنگل کے قانون (Might is Right) کا دور دورہ ہے۔

آج کی جدید دانش نے چونکہ مذاہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے شخصی زندگی کے دائروں میں محدود کر دیا ہے اس لیے عقل جدید کے نزدیک مذہب کو وہ مقام حاصل نہیں رہا کہ اس کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں اور اس کے فروغ و تنفیذ کے لیے عسکری قوت کو استعمال میں لایا جائے ورنہ ہتھیار تو آج بھی موجود ہیں اور جتنے ہتھیار آج پائے جاتے ہیں اور تیار ہو رہے ہیں، انسانی تاریخ میں اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہ ہتھیار استعمال

بھی ہوتے ہیں اور وہ تباہی لاتے ہیں کہ اس سے قبل کی انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے مگر ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والوں کے مقاصد اور عنوانات مختلف ہیں:

☆ جرمنی نے جرمن نسل کی برتری کے عنوان سے ہتھیار بنائے اور دو عظیم جنگوں میں پوری دنیا کے لیے تباہی کا سامان فراہم کیا۔

☆ روس نے محنت کشوں کی طبقاتی بالادستی کے نام پر عسکری قوت کا بے تحاشا استعمال کیا اور نسل انسانی کے ایک بڑے حصے کو تہہ تیغ کر دیا۔

☆ اسرائیل ایک نسلی مذہب کی برتری کے لیے اپنے سائز سے سینکڑوں گنا زیادہ ہتھیار جمع کیے ہوئے ہے اور فلسطینیوں کی مسلسل نسل کشی (Genocide) میں مصروف ہے۔

☆ اور امریکہ نے مغربی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے نام پر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر نسلی برتری، طبقاتی بالادستی، اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانا اور صرف اٹھانا نہیں بلکہ اسے وحشیانہ انداز میں اندھا دھند استعمال کرکے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا دہشت گردی نہیں ہے تو آسمانی تعلیمات کے فروغ اور وحی الٰہی کی بالادستی کے لیے ہتھیار اٹھانے کو کون سے قانون اور اخلاقیات کے تحت دہشت گردی قرار دیا جارہا ہے؟

باقی تمام پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے آج کی معروضی صورت حال (Scenario) میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے طرز عمل کا جائزہ لے لیں کہ افغانستان اور دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کا نام لینے والوں کے خلاف "عالمی اتحاد" کے پرچم تلے جو وحشیانہ فوج کشی جاری ہے۔ اس کے جواز میں اس کے علاوہ اب تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکی کہ اسلام کا نام لینے والے ان مبینہ انتہاپسندوں سے آج کی عالمی تہذیب کو خطرہ ہے، بالادست ثقافت کو خطرہ ہے، اور بین الاقوامی نظام کو خطرہ ہے، اس لیے ان انتہاپسندوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عقیدہ و

مذہب کے لیے ہتھیار اٹھانے کو دہشت گردی کہنے والے خود ایک مذہب اور عقیدہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے میدان جنگ میں مسلسل صف آراء ہیں۔

میری اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانے اور اسے بے دریغ استعمال کرنے کا ایک فریق کو حق حاصل ہے تو اس کے خلاف دوسرے عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے علمبرداروں کو ہتھیار اٹھانے کے حق سے کسی طرح محروم نہیں کیا جاسکتا اور ہتھیار بنانے اور استعمال کرنے کے لیے یہ کوئی وجہ جواز (Excuse) نہیں ہے کہ چونکہ ایک فریق کے پاس ہتھیار بنانے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اسے ان ہتھیاروں کے استعمال کے مواقع زیادہ میسر ہیں، اس لیے اسے تو ہتھیار بنانے اور چلانے کا حق حاصل ہے، اور دوسرا فریق اس صلاحیت میں کمزور اور ان مواقع کی فراوانی سے محروم ہے اس لیے اس کا سرے سے کوئی حق نہیں ہے۔

آج امریکہ اور اس کے اتحادی اس بات پر مطمئن ہیں کہ جو جنگ وہ لڑ رہے ہیں، وہ اعلیٰ مقاصد کی خاطر لڑی جارہی ہے۔ انسانیت کی بھلائی کی جنگ ہے۔ اور ان کے بقول اعلیٰ ترین تہذیبی اقدار کے تحفظ کی جنگ ہے۔ جنگ کی اسی مقصدیت کی وجہ سے انہیں اس عظیم جانی ومالی نقصان کی کوئی پروا نہیں ہے جو دنیا بھر میں ان کے ہاتھوں مسلسل جاری ہے۔ انسان مر رہے ہیں۔ عورتیں بیوہ ہورہی ہیں، بچے یتیم ہورہے ہیں، عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہورہی ہیں، ملکوں اور قوموں کی معیشتیں تباہ ہورہی ہیں، اور امن و امان کا توازن مسلسل بگڑتا چلا جارہا ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے چونکہ اپنے زعم کے مطابق یہ سب کچھ اعلیٰ مقاصد کے لیے کررہے ہیں اور ان اقدامات کے ذریعے سے اعلیٰ تہذیب و ثقافت کا تحفظ کررہے ہیں اس لیے ان کے خیال میں یہ سب کچھ جائز ہے اور جنگ کا حصہ ہے جسے کسی چون وچرا کے بغیر پوری نسل انسانی کو برداشت کرنا چاہیے۔ یہی بات اسلام کہتا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ نسل انسانی کے لیے نجات کا راستہ انسانی خواہشات اور صرف انسانی عقل نہیں ہے بلکہ وحی الٰہی کی نگرانی اور آسمانی تعلیمات کی برتری انسانی سوسائٹی کے لیے ضروری ہے اور اسلام کے نزدیک انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور تہذیبی روایات کا سرچشمہ

انسانی خواہشات اور عقل محض نہیں بلکہ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات ہیں اس لیے ایک مسلمان اگر ان مقاصد کے لیے ہتھیار اٹھاتا ہے تو دنیا کی مسلمہ روایات اور تاریخی عمل کی روشنی میں اسے یہ کہہ کر اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ مخالف فریق کے نزدیک اس کا یہ عمل دہشت گردی قرار پا گیا ہے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد قرآن و سنت کی رو سے جہاد کی چند عملی صورتوں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے حوالے سے جہاد کے ایک حکم کا تذکرہ سورۃ المائدہ میں کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے چنگل سے بنی اسرائیل کو نکال کر صحرائے سینا میں خیمہ زن ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو حکم ملا کہ وہ "بیت المقدس" کو قوم عمالقہ سے آزاد کرنے کے لیے جہاد کریں اور آگے بڑھ کر حملہ آور ہوں۔ مگر غلامی کے دائرے سے تازہ تازہ نکلنے والی مرعوب قوم کو اس کا حوصلہ نہ ہوا اور پھر اس کے چالیس سال بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جنگ لڑ کر بیت المقدس کو آزاد کرایا۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل ہی کے حوالے سے ایک اور جہاد کا تذکرہ کیا ہے جس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں (سورۃ بقرہ آیت ۲۴۶ تا ۲۵۲) کہ جالوت نامی ظالم بادشاہ نے فلسطین کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے بنی اسرائیل کو مظالم کا شکار بنانا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام کے حکم پر طالوت بادشاہ کی قیادت میں بنی اسرائیل کی مٹھی بھر جماعت نے جالوت کا مقابلہ کیا اور اسے میدان جنگ میں شکست دے کر فلسطین کے علاقے آزاد کرائے۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں کفار مکہ کے خلاف پہلے بڑے معرکے کی قیادت بدر کے میدان میں کی جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۲۳ تا ۱۲۷ میں کیا جس میں آنحضرت ﷺ نے قریش کو شکست دے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ جنگ قریش مکہ کے ان عزائم پر ضرب لگانے کے لیے بپا ہوئی تھی جو وہ اسلام کو ختم کرنے

اور جناب نبی اکرم ﷺ اور ان کی جماعت کو ناکام بنانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس کے بعد "احد" اور "احزاب" کی جنگیں بھی اسی پس منظر میں تھیں اور اس کشمکش کا خاتمہ اس وقت ہوا جب آپ ﷺ نے ۸ھ میں خود پیش قدمی کر کے مکہ مکرمہ پر قبضہ کر لیا۔

یہود مدینہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے امن وامان کے ماحول میں وقت بسر کرنے کی کوشش کی لیکن یہودیوں کی سازشوں اور عہد شکنیوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ رہا تو آپ ﷺ نے یہودیوں کے سب سے بڑے مرکز (Stronghold) خیبر پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کر لیا اور یہود کا زور توڑ دیا۔ جس کا ذکر سورۃ الفتح میں بھی ہے اور صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۳ میں بھی ہے۔

قیصر روم کے باج گزاروں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور یہ خبر ملی کہ خود قیصر روم مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے تو جناب نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں اس کا انتظار کرنے کے بجائے شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کی اور تبوک میں ایک ماہ قیام کر کے رومی فوجوں کا انتظار کرنے کے بعد وہاں سے واپس تشریف لائے۔
(صحیح بخاری، ج ۲، ص ۶۳۳)

یہ تو چند کھلی جنگیں ہیں جو علانیہ لڑی گئیں لیکن ان سے ہٹ کر ایسی متعدد کارروائیاں بھی سیرت النبی ﷺ کے ریکارڈ میں ملتی ہیں جنہیں چھاپہ مار کارروائیوں (Ambush) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

☆ مدینہ منورہ کے ایک سازشی یہودی سردار کعب بن اشرف کو جناب نبی اکرم ﷺ کے ایما پر حضرت محمد بن مسلمہؓ اور ان کے رفقا نے شب خون مار کر قتل کیا۔[1]

☆ خیبر کے نواح کے ایک اور سازشی یہودی سردار ابو رافع کو جناب نبی اکرم ﷺ کے حکم پر حضرت عبداللہ بن عتیکؓ نے اسی قسم کی چھاپہ مار کارروائی کے ذریعے سے قتل کیا۔[2]

☆ جناب نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں یمن کے اسلامی صوبہ پر ایک مدعی نبوت اسود عنسی نے قبضہ کر کے آنحضرت ﷺ کے مقرر کردہ گورنر کو شہید

کر دیا اور اسلامی ریاست کے عمال کو یمن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو آپ ﷺ کے ایما پر حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقا نے چھاپہ مار کارروائی کر کے اسود عنسی کو رات کی تاریکی میں قتل کیا اور یمن پر اسلامی اقتدار کا پرچم دوبارہ لہرا دیا۔[۳]

☆ صلح حدیبیہ میں قریش مکہ کی بعض ناجائز اور یک طرفہ شرائط کے خلاف دباؤ ڈالنے کے لیے حضرت ابو بصیرؓ اور حضرت ابو جندلؓ نے سمندر کے کنارے ایک باقاعدہ چھاپہ مار کیمپ قائم کیا اور قریش کا شام کی طرف تجارت کا راستہ غیر محفوظ بنا دیا جس سے مجبور ہو کر قریش کو صلح حدیبیہ کے معاہدے میں شامل اپنی یک طرفہ شرائط واپس لینا پڑیں اور ابو بصیرؓ کی چھاپہ مار کارروائیوں سے تنگ آکر قریش کو حضور ﷺ سے دوبارہ گفتگو کرنا پڑی۔[۴]

جناب نبی اکرم ﷺ نے میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے کے ساتھ ساتھ میڈیا کے محاذ پر بھی کفار کے خلاف صف آرائی کی چنانچہ غزوۂ احزاب کے بعد حضور ﷺ نے مدینہ منورہ کے ایک اجتماع میں باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کیا کہ اب قریش مکہ کو مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوگی، لیکن اب وہ زبان کی جنگ لڑیں گے اور مسلمانوں کے خلاف پورے عرب میں پروپیگنڈے اور منافرت انگیزی کا بازار گرم کریں گے۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر شعر و خطابت سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرامؓ کو میدان میں آنے کی ترغیب دی چنانچہ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ نے کھلے بندوں اعلان کر کے یہ محاذ سنبھالا اور شعر و شاعری کے محاذ پر کفار کے حملوں کا پوری جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔

زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں ہے لیکن ان گزارشات سے اتنی بات ضرور سامنے آگئی ہوگی کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کے تحفظ و استحکام کے لیے موقع و محل کی مناسبت سے جنگ کی ہر ممکنہ صورت اختیار کی اور محاذ آرائی کے جس اسلوب نے بھی آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنا چیلنج رکھا، اسے جواب میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

آج کے حالات میں جہاد کے حوالے سے دو سوال عام طور پر کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا کسی علاقے میں جہاد کے لیے ایک اسلامی حکومت کا وجود اور اس کی اجازت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں حضرت ابو بصیرؓ کا کیمپ اور حضرت فیروز دیلمیؓ کی چھاپہ مار کاروائی ہمارے سامنے واضح مثال کے طور پر موجود ہے۔ حضرت ابو بصیرؓ نے اپنا کیمپ حضور ﷺ کی اجازت سے قائم نہیں کیا تھا لیکن جب یہ کیمپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا تو آپ ﷺ نے نہ صرف اس کے نتائج کو قبول کیا بلکہ قریش کی طرف سے یک طرفہ شرائط سے دستبرداری کے بعد اس کیمپ کے مجاہدین کو باعزت طور پر واپس بلا لیا۔ اسی طرح یمن پر اسود عنسی کا غیر اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ سے فوج بھیج کر لشکر کشی نہیں کی بلکہ یمن کے اندر مسلمانوں کو بغاوت کا حکم دیا اور اسی بغاوت کی عملی شکل وہ چھاپہ مار کارروائی تھی جس کے نتیجے میں اسود عنسی قتل ہوا۔

دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر جہاد شرعی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے تو جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں اقلیت (Minority) کے طور پر رہتے ہیں، ان کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا ان کے لیے جہاد میں شمولیت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں دو واقعات کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور ان کے والد محترم جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کی خدمت میں جہاد میں شمولیت کے لیے حاضر ہو رہے تھے کہ راستے میں کفار کے ایک گروہ نے گرفتار کر لیا اور اس شرط پر انہوں نے ہمیں رہا کیا ہے کہ ہم ان کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر حصہ نہیں لیں گے۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرما کر انہیں بدر کے معرکے میں شریک ہونے سے روک دیا کہ اگر تم نے اس بات کا وعدہ کر لیا ہے تو اس وعدہ کی پاسداری تم پر لازم ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد محترم موجود ہوتے ہوئے بھی بدر کے معرکے میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکے تھے۔ اس طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول اکرم ﷺ قبا میں قیام فرماتے تھے اور ابھی مدینہ

منورہ نہیں پہنچے تھے لیکن حضرت سلمان فارسیؓ کا ذکر نہ بدر کے مجاہدین میں ملتا ہے اور نہ وہ احد ہی میں شریک ہو سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت آزاد نہیں تھے بلکہ ایک یہودی کے غلام تھے چنانچہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کی شمولیت جس پہلے غزوے میں ہوئی، وہ احزاب کا معرکہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے جہاد کے حوالے سے مسلمانوں کے معروضی حالات اور ان کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا ہے اس لیے جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں رہتے ہیں اور ان کے ان ریاستوں کے ساتھ وفاداری کے معاہدات موجود ہیں، ان کے لئے ان معاہدات کی پاسداری لازمی ہے۔ البتہ اپنے ملکوں کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور ہمدردی و خیر خواہی کے لیے وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، وہ ان کی دینی ذمہ داری ہے اور اس میں انہیں کسی درجے میں بھی کوتاہی روا نہیں رکھنی چاہیے۔

افغانستان پر امریکی حملے کے موقع پر میں برطانیہ میں تھا۔ مجھ سے وہاں کے بہت سے مسلمانوں نے دریافت کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو یہودیوں کی پیروی کرنا چاہیے اور ان سے کام کا طریقہ سیکھنا چاہیے کیونکہ یہودی ان ممالک میں رہتے ہوئے جو کچھ یہودیت کے عالمی غلبہ اور اسرائیل کے تحفظ و دفاع کے لیے کر رہے ہیں، اسلام کے غلبہ اور مظلوم مسلمانوں کے دفاع کے لیے وہ سب کچھ کرنا مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ مگر یہ کام طریقہ اور ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیے اور جن ملکوں میں مسلمان رہ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ اپنے معاہدات اور کمنٹمنٹ کے دائرے میں رہتے ہوئے کرنا چاہیے۔

آج دنیا کی عمومی صورت حال پھر اس سطح پر آگئی ہے کہ خواہشات اور محدود عقل پرستی نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور آسمانی تعلیمات کا نام لینے کو جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ آج کی اجتماعی عقل نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے انکار کر کے حاکمیت مطلقہ کا منصب خود سنبھال لیا ہے اور وحی الٰہی سے راہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اس کے نشانات و اثرات کو ختم کرنے کی ہر سطح پر کوشش ہو رہی ہے۔ اس فضا میں "اعلاء کلمۃ اللہ" کا پرچم پھر سے بلند

کرنا اگرچہ مشکل بلکہ مشکل تر دکھائی دیتا ہے لیکن جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت و سیرت کا تقاضا یہی ہے کہ نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محض کی پیروی کے فریب سے نکالا جائے اور اسے آسمانی تعلیمات کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے وحی الٰہی کے ہدایات کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے۔

اس کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان جس مظلومیت اور کسمپرسی کے عالم میں ظالم اور متسلط قوتوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہیں اور انہیں جس بے رحمی اور سنگ دلی کے ساتھ ان کے مذہبی تشخص کے ساتھ ساتھ قومی آزادی اور علاقائی خود مختاری (Territorail Independence) سے محروم کیا جارہا ہے، اس کے خلاف کلمہ حق بلند کرنا اور ان مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جبر کے ماحول سے نجات دلانے کے لیے جو کچھ ممکن ہو کر گزرنا یہ بھی حضور ﷺ کی تعلیمات و ارشادات کا ایک اہم حصہ ہے جس سے صرف نظر کر کے ہم آپ ﷺ کی اتباع اور پیروی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

ان دو عظیم ترین ملی مقاصد کے لیے جدوجہد کے مختلف شعبے ہیں۔ فکر و فلسفہ کا میدان ہے، میڈیا اور انفرمیشن ٹیکنالوجی کی جولان گاہ ہے، تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے، تعلیم و تربیت کا دائرہ ہے، لابنگ اور سفارت کاری کا شعبہ ہے، اور عسکری صلاحیت کے ساتھ ہتھیاروں کی معرکہ آرائی ہے۔ یہ سب جہاد فی سبیل اللہ کے شعبے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے ناگزیر تقاضے ہیں۔

اس لیے آج کے دور میں "سنت نبوی کی روشنی میں جہاد کا مفہوم" یہ ہے کہ:

☆ نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محض کی پیروی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی حاکیت اور آسمانی تعلیمات کی عمل داری کی طرف لانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔

☆ اسلام کی دعوت اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو نسل انسانی کے ہر فرد تک پہنچانے اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق اسے دعوت اسلام کا مقصد و افادیت سمجھانے کا اہتمام کیا جائے۔

☆ ملت اسلامیہ کو فکری وحدت، سیاسی مرکزیت، معاشی خود کفالت، ٹیکنالوجی کی مہارت، اور عسکری قوت وصلاحیت کی فراہمی کے لیے بھرپور وسائل اور توانائیاں بروئے کار لائی جائیں۔

☆ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے اخلاق وکردار کی تعمیر کے لیے تگ ودو کی جائے نیز دینی تعلیم وتربیت کے نظام کو ہر سطح پر مربوط ومنظم کیا جائے۔

☆ مظلوم مسلمانوں کو ظلم وجبر سے نجات دلانے اور ان کے دینی تشخص اور علاقائی خود مختاری کی بحالی کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کی جائے۔

☆ مسلم ممالک میں قرآن وسنت کی عملداری اور شرعی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کر کے تمام مسلم ممالک کو عالمی سطح پر کنفیڈریشن کی صورت میں خلافت اسلامیہ قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

☆ دینی جذبہ وغیرت کے تحت ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کے حق میں ہتھیار اٹھانے والے مجاہدین کو عالمی استعمار کے ہاتھوں ذبح کرانے اور ان کے قتل عام پر خوش ہونے کے بجائے ان کو بچانے کی کوشش کی جائے اور اس عظیم قوت کو ضائع ہونے سے بچانے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرتے ہوئے انہیں ملت اسلامیہ کے لیے حقیقی معنوں میں ایک کار آمد قوت بنانے کی راہ نکالی جائے۔

☆ اسلامی تعلیمات، قرآن وسنت کے قوانین اور جہاد کے بارے میں عالمی استعمار اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے یک طرفہ اور معاندانہ پروپیگنڈے سے متاثر ومرعوب ہونے کی بجائے اس کو مسترد کیا جائے اور دلیل ومنطق کے ساتھ اسلامی احکام اور جہاد کی ضرورت وافادیت سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔

یہ کام دراصل مسلم حکومتوں کے کرنے کے ہیں اور انہیں او آئی سی کے عملی ایجنڈے کا حصہ ہونا چاہیے لیکن اگر دینی مراکز اور اسلامی تحریکات بھی باہمی ربط و مشاورت کے ساتھ ان مقاصد کے لیے مشترکہ پیش رفت کا اہتمام کر سکیں تو حالات کو خاصا بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

حواشی

1. طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۲۴۔ زرقانی ج ۲، ص ۹، فتح الباری، ج ۷، ص ۲۵۹۔ ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۷۔ دیکھیے تفصیل سیرت المصطفیٰ، ج ۲، ص ۱۷۵۔
2. زرقانی ج ۲، ص ۱۶۵ کے حوالے سے سیرت المصطفیٰ، ج ۲، ص ۳۴۵ میں تفصیل مذکور ہے۔
3. صحیح بخاری، ج ۲، ص ۲۶۹
4. صحیح بخاری، ج ۱، ص ۳۷۷ کتاب الشروط میں یہ واقعہ موجود ہے مزید تفصیل فتح الباری میں دیکھیں

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

اتحادِ امت اور اسوۂ نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

مجھے جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے ہزاروں پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو پر کچھ عرض کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ آقائے نامدار ﷺ امت مسلمہ کے اتحاد کا مرکزی نقطہ ہیں۔ حضور ﷺ کی ذات اقدس ہمیشہ مسلمانوں کی وحدت کا مرکز رہی ہے، آج بھی امت آپ ﷺ کی ذات پر مجتمع ہے، اور قیامت تک آپ ﷺ تمام مسلمانوں کی یکساں عقیدت و اطاعت کا مرکز رہیں گے۔ اس عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے میں وقت کے اختصار کے باعث صرف تین حوالوں سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

1. اتحاد کا مطلب کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟
2. مسلمانوں کو آپس میں متحد رکھنے کے لیے جناب نبی اکرم ﷺ نے جن سینکڑوں ارشادات گرامی میں تلقین فرمائی ہے ان میں سے چند ارشادات نبوی ﷺ کا ذکر کروں گا۔
3. توہین رسالت ﷺ کے اخباری خاکوں کی اشاعت کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں نے اجتماعی طور پر جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جس شدت سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ایک بار پھر مسلمانوں کی وحدت و اجتماعیت کے مرکزی نکتے کے طور پر دنیا کے سامنے آئی ہے، اس بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

اتحاد کا مطلب اور اس کے تقاضے:

پہلی بات یہ کہ اتحاد کسے کہتے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی قوم کے درمیان اختلافات پیدا نہ ہونے کو اتحاد کہا جاتا ہے۔ یعنی اتحاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ اول تو اختلاف پیدا نہ ہو اور اگر کسی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جائے تو یہ اتحاد ختم ہو جائے۔ میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ کیونکہ اختلاف ایک فطری امر ہے، جہاں بھی انسان باہم اکٹھے ہوں گے ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوگا، یہ عقل و فطرت کا تقاضہ ہے اور اسلام اس کی نفی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل و فہم کے مختلف درجات سے نوازا ہے، مزاج الگ الگ ہیں، اور نفسیات میں بے پناہ تفاوت ہے۔ اس لیے اختلاف پیدا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ اختلاف کو ختم ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ اختلاف اگر پیدا ہوگا تو وہ باقی بھی رہے گا۔ ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اختلاف اور چیز ہے جبکہ تفرقہ اور چیز ہے۔ قرآن کریم نے اختلاف سے کسی جگہ بھی منع نہیں کیا البتہ تفرقہ سے منع کیا ہے۔ چنانچہ اتحاد بین المسلمین پر گفتگو کرتے ہوئے میں اس نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں اور اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کے بیسیوں ارشادات میں سے دو کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

بخاری شریف میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی میں ایک صاحب نماز پڑھ رہے تھے جس میں وہ بلند آواز سے قرأت کر رہے تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی جو اس طرح نہیں تھی جس طرح حضرت عمرؓ نے جناب رسول اللہ ﷺ سے پڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ چونکہ وہ میرے حساب سے قرآن کریم کی آیت غلط پڑھ رہا تھا اس لیے مجھے غصہ آیا، قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی اسے دبوچ لیتا مگر میں نے صبر کیا اور اس کے نماز مکمل کرنے کا انتظار کیا۔ جونہی اس نے نماز مکمل کی میں نے اس کے گلے میں چادر ڈالی اور کھینچتا ہوا اسے جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ شخص نماز میں قرآن کریم غلط پڑھ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پہلے اس کی گردن تو چھوڑ دو، میں نے اسے چھوڑ دیا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ وہ آیت جس طرح

تم پڑھ رہے تھے اب پڑھ کر سناؤ۔ اس نے سنادی۔ پھر مجھے فرمایا کہ جس طرح تمہیں یاد ہے تم سناؤ۔ میں نے بھی سنادی۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس نے بھی ٹھیک پڑھا ہے اور تم نے بھی درست پڑھا ہے۔

یہ دراصل قراٗتوں کا اختلاف تھا۔ کسی بھی زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا تلفظ اور لہجہ علاقوں اور قوموں کے فرق سے بدل جاتا ہے لیکن معنیٰ ایک ہی رہتا ہے۔ لفظ بھی بنیادی طور پر وہی ہوتا ہے لیکن لہجہ اور تلفظ بدل جاتا ہے اور بعض اوقات سپیلنگ بھی بدل جاتے ہیں۔ میں مثال کے طور پر پنجابی کے ایک لفظ کا حوالہ دوں گا کہ ہمارے ہاں کسی کام کی کیفیت پوچھنے کے لیے ''کیویں'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے مختلف تلفظ ہیں، کہیں یہ لفظ کیویں ہے، کہیں کِدّاں ہے، کہیں کیکن ہے، کہیں کنجو ہے، اور کسی علاقے میں اسے کیّاں کے تلفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ یعنی لفظ اور معنیٰ ایک ہی ہے لیکن تلفظ اور ادائیگی مختلف ہے۔ یہ زبان پر علاقائی اثرات ہوتے ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم جب نازل ہوا تو اسے قریش کے لہجے اور تلفظ میں پڑھنے کی پابندی تھی۔ آپ ﷺ نے بارگاہ ایزدی میں خود درخواست کی کہ ایک ہی لہجے اور تلفظ کا سب عربوں کو پابند بنانے سے بہت سے عرب قبائل کو قرآن کریم پڑھنے میں دقت پیش آسکتی ہے اس لیے اس معاملے میں سہولت پیدا کی جائے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری استدعا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو سات مختلف لہجوں اور قراٗتوں میں پڑھنے کی اجازت دے دی تاکہ تمام لہجوں اور قراٗتوں کے ساتھ لوگ آسانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر سکیں۔ اب یہ اختلاف ایسا ہے جو آنحضرت ﷺ نے خود مانگ کر لیا ہے اس لیے کہ یہ فطری ضرورت تھا۔

دوسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے مستقل الگ وضو فرماتے تھے، لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک ہی وضو کے ساتھ پورے دن کی نمازیں پڑھ ڈالیں۔ حضرت عمرؓ نے اس بارے میں

دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے آج ایسا کام کیا ہے جو اس سے پہلے آپ نہیں کیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے الگ وضو کرنا اگرچہ بہت اجر و ثواب کی بات ہے لیکن اس کی پابندی سے بہت سے لوگوں کو دقت ہو گی۔ اس لیے حضور ﷺ نے ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں ادا کر کے اسے بھی سنت میں شامل فرما لیا تاکہ کسی کو ایسا کرتے ہوئے کوئی الجھن نہ ہو۔ یہ صرف ایک مثال میں نے ذکر کی ہے اس طرح کی بیسیوں بلکہ سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک کام کو جناب رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے انجام دیا تاکہ طریقوں میں تنوع ہو اور لوگوں کو اپنی سہولت کے مطابق ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کرنے میں یہ پریشانی نہ ہو کہ حضور ﷺ نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔

اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ اسلام نے اختلاف کی نفی نہیں کی بلکہ اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا احترام کیا ہے اور اسے برقرار رکھا ہے۔ البتہ اسلام نے اختلاف کی حدود کا تعین کیا ہے اور ہر اختلاف کو اس کے دائرے میں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اختلاف کی حدود میں پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ جہاں اختلاف کی گنجائش ہو وہاں اختلاف کیا جائے اور جہاں اختلاف کی گنجائش نہ ہو وہاں اختلاف کرنے سے گریز کیا جائے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے حضرت بریرہؓ کے ایک واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنی باندی بریرہؓ کو آزاد کر دیا جو ایک صحابی مغیثؓ کے نکاح میں تھیں۔ آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر بریرہؓ کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اگر مغیثؓ کے نکاح میں نہ رہنا چاہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ بریرہؓ نے ایسا ہی کیا اور مغیثؓ سے نکاح ختم کر لیا۔ اس پر مغیثؓ کو پریشانی ہوئی اور اس نے مختلف اطراف سے بریرہؓ کو واپسی پر آمادہ کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں حتیٰ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق مغیثؓ کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھومتے رہتے تھے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو منا لائے؟ حضور ﷺ نے یہ صورتحال دیکھ کر خود بریرہؓ سے بات کی اور اس

بارے میں اس سے پوچھا۔ بریرہؓ نے جواب دیا کہ یہ میرا شرعی حق تھا جو میں نے استعمال کیا ہے کیونکہ میں مغیثؓ کے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم اپنا یہ فیصلہ واپس نہیں لے سکتیں؟ اس نے بڑے ادب سے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ بڑی سمجھدار خاتون تھی، اور کیسے نہ ہوتی کہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہ رہی تھی۔ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اس نے یہ سوال کر کے ایک حد فاصل قائم کر دی کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے کسی حکم کو نہ ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ مشورہ کی صورت میں اختیار باقی رہتا ہے جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں حکم نہیں دے رہا بلکہ مشورہ دے رہا ہوں تو اس نے بے ساختہ کہا کہ میں اپنے فیصلہ پر قائم ہوں اور مجھے مغیثؓ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر جگہ اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی اور اختلاف وہیں کیا جاسکتا ہے جہاں اس کی گنجائش ہو۔ مثلاً قرآن کریم کے کسی حکم کو سمجھنے اور اس کا مصداق طے کرنے میں تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن نفس حکم سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے کسی ارشاد اور عمل کا مفہوم و منشا متعین کرنے میں تو اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ارشاد و عمل سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا اختلاف کی حدود میں پہلی بات یہ ضروری ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ کہاں اختلاف کی گنجائش ہے اور کہاں نہیں ہے۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ضروری ہے کہ ہر اختلاف کو اپنی سطح پر اور اپنے درجہ میں رکھا جائے۔ ہمارے ہاں اختلاف پر ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ بازی کا جو رجحان زور پکڑ گیا ہے یہ درست نہیں ہے۔ ہر اختلاف کفر و اسلام کا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر اختلاف حلال و حرام کا ہوتا ہے۔ بعض جگہ صرف اولیٰ و غیر اولیٰ اور ترجیحات کا اختلاف ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں فتویٰ بازی ہر اختلاف کے حوالے سے یکساں ہوتی ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اس رجحان پر قابو پانا وحدت امت کے لیے آج کے دور کا سب سے بڑا تقاضہ ہے۔ اس سلسلہ میں جناب نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشاد گرامی کا حوالہ دوں گا جس میں

آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس شخص نے کسی مسلمان کو کافر کہا اگر وہ کافر نہ ہو تو کفر کا فتویٰ کافر کہنے والے پر واپس لوٹ آئے گا۔ اور جس شخص نے کسی مسلمان پر لعنت بھیجی ہے جبکہ وہ لعنت کا مستحق نہیں تو یہ لعنت بھیجنے والے پر واپس آئے گی۔" یہی فتوے ہمارے ہاں سب سے بڑے فتوے شمار ہوتے ہیں جن کی اہمیت اور نزاکت جناب نبی اکرم ﷺ نے ان ارشادات گرامی میں بیان فرمائی ہے۔ اگر اختلاف کی حدود کو قائم رکھا جائے اور بلاوجہ فتویٰ بازی سے گریز کر کے ہر اختلاف کو اس کی سطح پر اور اس کے دائرے میں محدود رکھا جائے تو یہ اختلاف امت کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اختلاف نہ صرف فطرت کا تقاضہ اور رحمت ہیں بلکہ ہماری معاشرتی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔

وحدتِ امت کے لیے آنحضرت ﷺ کے ارشادات:

اس کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے بہت سے ارشادات میں ہمیں باہمی وحدت برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں جناب رسالت مآب ﷺ نے دور جاہلیت کے خاتمے کا اعلان کر کے اسلام اور روشنی کے دور کا آغاز کیا اور یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ "كُلُّ شَيْءٍ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوعٌ (مسلم)" کہ جاہلیت کی تمام اقدار آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ ان میں شرک و بدعت، نسل پرستی، زبان و رنگ کا امتیاز، بدکاری، شراب، جوا، سود، کہانت و نجوم، ناچ گانا، عریانی، اور باہمی قتل و قتال کی جاہلی اقدار شامل تھیں جنہیں جناب رسول اللہ ﷺ نے تیئس سالہ محنت کے ساتھ ختم کیا اور ان جاہلی اقدار سے پاک اسلامی معاشرے کا آغاز فرمایا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ آج یہ تمام اقدار ایک ایک کر کے پھر ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان روایات کا ابوجہل، ابولہب، نضر بن حارث، اور دیگر کافر سرداروں کے حوالہ سے ذکر کیا جاتا ہے تو وہ جاہلی اقدار کہلاتی ہیں جبکہ وہی اقدار ہماری سوسائٹی کا حصہ بنتی ہیں تو تمدن، سولائزیشن، ترقی، یا آرٹ کا

عنوان اختیار کر لیتی ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنے خطبے میں ہمیں اس بات کی تلقین بھی فرمائی تھی کہ میرے بعد کفر و جاہلیت کے دور کی طرف واپس نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانا اور باہمی قتل و قتال کسی بھی عنوان سے ہو، اسے جناب رسول اللہ ﷺ نے کفر و جاہلیت سے تعبیر کیا ہے جبکہ ایک حدیث میں اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی ایک صورت قرار دیا ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لیے چار باتوں کا سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے تین چیزیں عطا فرمائیں لیکن ایک نہیں دی۔ میں نے سوال کیا کہ میری امت پر مجموعی طور پر پہلی امتوں جیسا عذاب نازل نہ ہو، یہ بات اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت یکبارگی گمراہی کا شکار نہ ہو، یہ بات بھی قبول کر لی گئی۔ میں نے گزارش کی کہ میری امت ساری کی ساری یکبارگی تباہ نہ ہو، یہ بات بھی قبول ہو گئی۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت آپس میں نہ لڑے تو یہ بات اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی۔ جبکہ ایک اور حدیث میں ہے کہ جناب رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت پر جب اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو گا تو اس کی عملی صورتیں تین ہوں گی۔ ایک یہ کہ میری امت کے لوگ آپس میں لڑیں گے اور ایک دوسرے کا خون بہائیں گے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ امت کے شریر لوگوں کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ اور تیسرا یہ کہ امت کے نیک لوگوں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں۔" اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ یعنی آنکھ کو تکلیف ہو تو سارا جسم اسے محسوس کرتا ہے اور اگر پاؤں کو درد ہو تو جسم کے سارے اعضاء اسے محسوس کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس لیے کوئی مسلمان نہ اپنے دوسرے بھائی پر خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے ظلم کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کرتا ہے۔"

ان ارشادات نبوی ﷺ کی روشنی میں دیکھا جائے تو امت کے موجودہ افتراق کے اسباب کو تلاش کرنا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ آج کے دور کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم امت کے افتراق کے اصل اسباب کو تلاش کریں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں اسی کی تلقین فرمائی ہے اور اس حوالے سے ہماری یہی دینی و ملی ذمہ داری ہے۔

توہین رسالت کے خاکے اور امت مسلمہ کا اجتماعی رد عمل:

اس کے بعد میں گفتگو کے آخری نکتے کی طرف آتا ہوں کہ ہماری تمام تر خرابیوں، کمزوریوں، اور بداعمالیوں کے باوجود توہین رسالت ﷺ کے خلاف عالم اسلام کے حالیہ اجتماعی احتجاج سے ایک بار پھر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان وحدت و اتحاد کا مرکزی نکتہ آج بھی حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ یہ بات جہاں حضور ﷺ کا اعجاز اور اسلام کی صداقت کا اظہار ہے وہاں اس بات کی بھی علامت ہے کہ مسلمانوں کے ایمان کا کنکشن آج بھی قائم ہے۔ یہ کنکشن درست ہے اور اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ البتہ ہمارے "سیٹوں" (موبائل سیٹ مراد ہے) میں کمزوری ہے۔ اگر ہم اپنے اپنے سیٹ ٹھیک کرلیں اور ان کی خرابیوں کو دور کرلیں تو حضور ﷺ کی عقیدت کا کنکشن آج بھی "اسٹیبل" ہے اور اس کی برکتیں اور بہاریں بدستور تازہ ہیں۔

یورپ کے بعض اخبارات نے تو یقیناً یہ کارروائی شر کے خیال سے کی ہو گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں سے خیر کا یہ پہلو نکال دیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ مسلمانان عالم کی بے لچک کمٹمنٹ کا ایک بار پھر اظہار ہو گیا ہے اور مغرب کو اس تکلیف دہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ اس نے گزشتہ تین صدیوں کے درمیان مسلمانوں کی کمٹمنٹ کے مراکز تبدیل کرنے کی جو محنت کی تھی وہ رائیگاں جا رہی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی کمٹمنٹس کی ترجیحات میں آج بھی سرفہرست اسلام اور جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ باقی تمام کمٹمنٹس کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ یہ حضور ﷺ کی ذات گرامی، سیرت مبارکہ اور

تعلیمات کا وہ اعجاز ہے جس کا مشاہدہ ہم جیسے گئے گزرے مسلمان بھی کر رہے ہیں اور ساری دنیا اس منظر کو دیکھ رہی ہے۔ اس لیے ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کا آج کے دور میں ہمارے لیے یہی پیغام ہے کہ اپنی اصل کی طرف واپس پلٹیں اور آپ ﷺ کی سیرت واسوۂ حسنہ سے روشنی حاصل کر کے اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگیوں کا جزو بنالیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

خصائل نبوی، احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

محدثین کرام نے جناب نبی اکرم ﷺ کے ذاتی اوصاف و کمالات اور معمولات کو علم حدیث کے ایک مستقل شعبے کی صورت میں مرتب کیا ہے جسے "شمائل نبوی" کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ بعض محدثین نے اس پر الگ کتابیں لکھی ہیں اور باذوق اہل علم نے بڑی محبت وعقیدت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے حسن ذوق کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی اجتماعی، معاشرتی، اور علمی و عملی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ذاتی زندگی کی جزئیات تک روایت کی ہیں جنہیں محدثین کرام نے حدیث کے مستقل ابواب کی صورت میں جمع کر کے قیامت تک امت مسلمہ کی راہنمائی کا اہتمام کر دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا تو ذوق ہی یہ تھا کہ وہ ہر کام اسی ترتیب اور جزئیات کی پاسداری کے ساتھ کرتے تھے جس طرح حضور ﷺ نے وہ کام کیا تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا تھا جو "حجۃ الوداع" کہلاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اس حج میں حضورؐ کے ساتھ تھے اور انہوں نے اس سفر کے آنے جانے کی تفصیلات اس جزرسی کے ساتھ یاد رکھی تھیں کہ باقی صحابہ کرامؓ اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اس کے بعد زندگی بھر ہر سال حج کیا اور اسی ترتیب کے ساتھ کیا جیسے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کیا تھا۔ جہاں سے آپ ﷺ نے احرام باندھا وہیں سے وہ احرام باندھتے تھے، جہاں آپ ﷺ نے پہلی رات قیام کیا وہیں پہلی رات قیام فرماتے تھے، جہاں آپ ﷺ نے دوسرے روز ظہر کی نماز پڑھی وہیں ظہر کی نماز پڑھتے۔ حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق عبد اللہ بن عمرؓ اس مبارک سفر کے دوران پیشاب بھی اسی جگہ کرتے تھے جہاں انہوں نے آپ ﷺ کو پیشاب کرتے دیکھا تھا۔ منیٰ میں وہ اسی جگہ خیمہ لگاتے جہاں

حضور ﷺ کا خیمہ حجۃ الوداع میں نصب تھا اور قربانی بھی اسی جگہ کرتے تھے جہاں آپ ﷺ نے قربانی کے جانور ذبح کیے تھے۔ ایک صاحب نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ہم آپ کو بعض کام بڑے اہتمام سے کرتا دیکھتے ہیں مگر باقی صحابہ کرامؓ وہ کام ویسے نہیں کرتے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو ہر کام اسی انداز اور ترتیب سے کرتا ہوں جس طرح میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو وہ کام کرتے دیکھا ہے۔

اس قدر جزرسی اور تفصیلات اگرچہ ضروری نہیں ہیں مگر جناب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ حددرجہ محبت وعقیدت کی علامت ضرور ہیں۔ کیونکہ محبوب کی ہر ادا اور ہر چیز محبت کرنے والے کو محبوب ہوتی ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی طرح ہو جائے اور اس کی ہر ادا کو اپنالے۔ اس کی ایک جھلک ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں کہ ہمارے بچے کھلاڑیوں کو کھیلتے دیکھتے ہیں تو جس کھلاڑی کی کوئی ادا کسی نوجوان کو پسند آجاتی ہے وہ اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً کرکٹ کے حوالے سے آپ کو اپنے ماحول میں کئی چھوٹے چھوٹے میانداد نظر آئیں گے، کئی عمران خان ملیں گے، اور کئی شاہد آفریدی دکھائی دیں گے۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں لیکن بیٹ ایسے پکڑیں گے جیسے جاوید میانداد پکڑتے ہیں، گیند ایسے کرائیں گے جیسے عمران خان کراتے رہے ہیں اور ایکشن ایسے لیں گے جیسے انہیں شاہد آفریدی کا ایکشن دکھائی دیتا ہے۔ یہ پسند کی علامت ہے، محبت کا اظہار ہے، اور دل میں بس جانے کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ذوق بھی یہی تھا اور وہ اس معاملے میں تمام صحابہ کرامؓ میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے ذاتی اوصاف و خصائل اور معمولات پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث محدثین کرامؒ نے روایت کی ہیں جن میں بطور نمونہ چند ایک کا تذکرہ کرنے کی سعادت ہم حاصل کر رہے ہیں، اس اُمید پر کہ اللہ تعالیٰ اس ذکر کی برکت سے اس ذوق کا کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب فرمادیں جو قیامت کے روز حضور ﷺ کی شفاعت اور ان کے ساتھ قربت کا ذریعہ بن جائے، آمین یارب العالمین۔

1. ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو انسانی خصال میں سے سب سے زیادہ نفرت جھوٹ سے تھی (بیہقی)۔ اور اپنے خاندان

کے کسی شخص کے بارے میں جھوٹ کی کسی بات پر مطلع ہوتے تو اس سے اس وقت تک اعراض فرماتے تھے جب تک اس کی توبہ مشاہدے میں نہ آجاتی (مسند احمد)۔

2. حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کسی شخص کو کسی علاقے کا حاکم بنا کر بھیجتے تو یہ نصیحت بطور خاص فرماتے تھے کہ لوگوں سے انہیں قریب لانے والی باتیں کرنا، دور کرنے والی باتوں سے گریز کرنا۔ آسانی والی بات کرنا، مشکل اور تنگی والی بات نہ کرنا (ابوداؤد)۔

3. حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ جب کسی سے بیعت لیتے اور کسی کام کے کرنے کا عہد لیتے تو اس عہد میں یہ گنجائش رکھنے کی تلقین فرماتے کہ "فیما استطعت" کہ جہاں تک میرے بس میں ہوگا اطاعت کروں گا (مسند احمد)۔

4. حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کسی کو امیر (حاکم) بنا کر بھیجتے تو یہ تلقین فرماتے کہ تقریر مختصر کرنا اور باتیں تھوڑی کرنا اس لیے کہ کلام میں بھی جادو جیسی تاثیر ہوتی ہے (طبرانی)۔ ایک طالب علم کے طور پر اس کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ حاکموں سے فرما رہے ہیں کہ لوگوں کو اپنی جادو بیانی اور گفتگو کے سحر میں ہی نہ جکڑے رکھنا بلکہ ان کے مفاد کے عملی کاموں کو ترجیح دینا۔ (صرف یہی نہ ہو کہ لوگ کہیں کہ تقریر تو اچھی کی ہے: از مرتب)

5. حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ جب کسی ساتھی کو رخصت کرتے تو اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے اور اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ خود ہاتھ نہ چھوڑتا اور اسے رخصت کرتے وقت دعا سے بھی نوازتے (مسند احمد)۔

6. حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ خوش مزاج اور سب سے زیادہ مسکرانے والے تھے (طبرانی)

7. حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ جب بھی گفتگو فرماتے، مسکراہٹ آپ کے چہرے پر نظر آتی تھی (مسند احمد)۔

8. حضرت حنظلہ بن خدیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کسی شخص کو بلاتے تو اس کے پسندیدہ نام اور کنیت کے ساتھ اس کو پکارتے (طبرانی)۔

9. حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات اپنے سر مبارک کو ڈھانپ کر رکھتے یعنی سر پر اکثر کپڑا ہوتا تھا(ترمذی)۔
10. حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے، بے مقصد بات نہ کرتے، نماز لمبی پڑھتے اور، خطبہ مختصر ارشاد فرماتے۔ آپ ﷺ کسی بات پر ناک نہیں چڑھاتے تھے اور کسی بیوہ، یتیم یا غلام کے ساتھ اس کے کام کے لیے چلنے میں تکبر نہیں کرتے تھے اور جب تک اس کا کام نہیں ہو جاتا تھا ساتھ رہتے تھے (مستدرک حاکم)۔
11. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ اپنے کام اکثر خود کر لیتے تھے۔ کپڑے کو ٹانکا لگا لیتے، بکری کا دودھ دوہ لیتے اور ذاتی خدمت کے کام بھی خود کر لیتے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ دوسرے روز کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہیں رکھتے تھے اور جو کچھ ہوتا اسی روز خرچ کر ڈالتے تھے (ترمذی)۔
12. حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس اُحد پہاڑ جتنا بھی سونا ہو تو میں اپنے پاس تین دن سے زیادہ ذخیرہ نہیں رکھوں گا اور سب کا سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دوں گا (بخاری شریف)۔
13. حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خوراک بہت کم تھی۔ وہ اگر دوپہر کا کھانا کھاتے تو رات کا نہیں کھاتے تھے اور رات کا کھانا کھا لیتے تو دوپہر کا نہیں کھاتے تھے (حِلیہ)۔
14. جناب رسول اللہ ﷺ اپنے خادموں سے پوچھتے رہتے تھے کہ تمہاری کوئی ضرورت تو نہیں؟ تمہیں کوئی کام تو نہیں؟ (مسند احمد)۔

گویا حضور ﷺ اپنے خادموں کی ضروریات کا بھی بطور خاص خیال رکھتے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں بھی ان خصائل مبارکہ کو اپنانے کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

علاج معالجہ اور اسوۂ نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

علاج معالجہ اور اس کے لیے ریسرچ، محنت اور فکر مندی انسانی ضرورت ہے، سوسائٹی کا تقاضا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ بھی ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ نے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی بیماریوں کے علاج معالجے کی تلقین فرمائی ہے اور آپ ﷺ نے بیماریوں کے لیے جسمانی و روحانی دونوں طرز کے علاج خود بھی تجویز کیے ہیں، اس لیے انسانی بیماریوں کا علاج انسانی خدمت ہونے کے ناتے عبادت اور سنت رسول ﷺ بھی شمار ہوتا ہے۔

اسی طرح عام سطح پر محسوس کیے جانے والے خدشات کا لحاظ رکھنا بھی آنحضرت ﷺ کی سنت مبارکہ ہے۔ بخاری و مسلم کی ایک روایت کے مطابق

"جناب رسول اللہ ﷺ نے عام لوگوں سے سنا کہ جب بچہ ماں کا دودھ پی رہا ہو تو اس دوران میاں بیوی کا ہم بستری کرنا بچہ کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اسے عربی میں "غیلہ" کہتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس عمل پر پابندی لگا دی، لیکن بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ عمومی تاثر درست نہیں ہے تو آپ ﷺ نے یہ کہہ کر غیلہ پر پابندی ختم کر دی کہ مجھے پہلے جو بتایا گیا تھا وہ درست نہیں تھا اس لیے میں اس پابندی کو ختم کر رہا ہوں۔"

(مشکوٰۃ شریف ص ۲۷۶، رواہ مسلم)

چنانچہ کسی چیز کے بارے میں کوئی تاثر عام ہو جائے تو اس کا نوٹس لینا چاہیے اور تحقیق کے بعد اگر وہ غلط ثابت ہو جائے تو اس تاثر کو ختم کرنے کی کاروائی بھی کرنی چاہیے۔ اس لیے جو لوگ پولیو مہم کے بارے میں کسی شک و شبہ کا شکار ہیں انہیں تحقیق کے علاوہ متعلقہ ماہرین سے رجوع کرنا چاہیے اور بلا تحقیق کسی عوامی تاثر کو پھیلانے سے گریز کرنا چاہیے۔

پولیو کی مہم میں بچوں کو قطرے پلائے جاتے ہیں اور بچے دوائی خوش دلی سے نہیں پیتے بلکہ بسا اوقات مزاحمت کرتے ہیں۔ اس حوالے سے جناب نبی اکرم ﷺ کا ایک دلچسپ واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ

"آخری ایام میں جب نبی اکرم ﷺ زیادہ بیمار ہوئے تو کمزوری بڑھنے لگی۔ ایک دن جب آپ ﷺ ایسی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے کہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہے تھے لیکن بولنے اور کسی کام سے روکنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اس دوران گھر والوں نے آپ ﷺ کو دوائی پلانا چاہی تو آپ ﷺ نے اشاروں سے منع کیا۔ مگر گھر کی خواتین نے منع کرنے کے باوجود زبردستی آپ ﷺ کے منہ میں دوائی ڈال دی۔ حضور ﷺ کو جب افاقہ ہوا تو گھر والوں سے پوچھا کہ میں نے جب منع کیا تھا تو آپ لوگوں نے مجھے زبردستی دوائی کیوں پلائی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ مریض تو ایسی دوائی سے روکتا ہی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم سب کو باری باری اسی طرح دوائی پلائی جائے، اس لیے ہر ایک کو باری باری جکڑ کر اس کے منہ میں دوائی ڈالو۔ حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ انہیں نہ پلائی جائے کہ وہ اس عمل میں شریک نہ تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے حکم پر سب کو باری باری جکڑ کر یہ دوائی پلائی گئی۔ بعض دوسری روایات میں ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر عرض کیا کہ میں (نفلی) روزے سے ہوں۔ مگر آپ ﷺ نے فرمایا کوئی بات نہیں اس کو بھی ابھی اسی طرح دوائی پلاؤ۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ فرمایا کہ انہیں نہ پلائیں کہ وہ اس عمل میں شریک نہیں تھے۔ حالانکہ وہ اگرچہ اس کاروائی میں عملاً شریک نہیں تھے مگر ازواج مطہرات کو انہوں نے ہی آپ ﷺ کو زبردستی دوائی پلانے کے لیے کہا تھا۔"

(بخاری شریف، باب مرض النبی ﷺ وفات، ج ۲، ص ۶۴۱)

(سیرت النبی ﷺ ج ۲، ص ۱۴۸۲ از علامہ شبلیؒ، علامہ ندویؒ)

بہر حال علاج معالجہ اور اس کی ضروریات و تقاضوں کو پورا کرنا سنت نبوی ﷺ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات آج کی اس محفل میں شریک اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے دور کی سب سے بڑی طبیبہ بھی تھی۔ ان کے بھانجے حضرت عروۃ بن زبیر رضی اللہ عنہ جو خود بھی تابعین کے دور کے بڑے محدث اور فقیہ ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دور میں قرآن کریم کی تفسیر، حدیث و سنت، شعر و ادب، قبائل کے انساب و تاریخ اور طب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ حضرت عروۃ رضی اللہ عنہ نے ایک دن پوچھ لیا کہ خالہ جان! یہ طب آپ نے کہاں سے سیکھ لی ہے؟ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جب بیمار ہوتے تھے تو میں ان کے علاج کے لیے زیادہ فکر مند ہوتی تھی اور مختلف طبیبوں سے پوچھ کر علاج کرتی تھی، اس سے مجھے علاج معالجے کے بارے میں خاصی معلومات اور تجربہ حاصل ہو گیا۔

معاشرے میں پھیلنے والی بیماریوں کی نشاندہی کرنا، ان کے اسباب معلوم کرنا، ان کے سد باب کی صورتیں نکالنا اور عوام میں حکمت اور علاج کے بارے میں شعور بیدار کرنا بھی علاج معالجہ کے تقاضے ہیں۔ اور اس کے لیے خلوص کے ساتھ کوشش کرنے والے افراد اور ادارے اس کار خیر پر جہاں قابل تحسین ہیں وہاں ان سے ہر ممکن تعاون کرنا ہماری قومی اور دینی ذمہ داری بھی ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاشرتی رویہ اور روز مرہ معمولات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

امام ترمذیؒ نے ”شمائل ترمذی“ میں سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روز مرہ کے معمولات اور شب و روز کی مصروفیات کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے اپنے سوال کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔(۱) گھر کے اندر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو وقت گزارتے تھے اس کی ترتیب کیا تھی؟(۲) گھر سے باہر کے معمولات اور انداز کیا تھا؟(۳) مجلسی زندگی کے آداب اور انداز کیا تھا؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کے اوقات اور معمولات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وقت کا ایک حصہ اپنے ذاتی کاموں پر صرف کرتے تھے، دوسرا حصہ گھر والوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا اور تیسرا حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی کاموں کے لیے مخصوص وقت میں ان خواص کے ساتھ ملاقات بھی کرتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گھر میں حاضر ہوتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ یہ مجلس روزانہ ہوتی تھی، کوئی ضرورت مند ہوتا تو وہ اپنا سوال لے کر آتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حسب موقع اس کی ضرورت پوری فرمادیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس کے شرکاء کے ساتھ امت کے اجتماعی مسائل پر گفتگو فرماتے اور عام لوگوں کے معاملات میں ہدایات دیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجلس میں خاص طور پر دو باتوں کی تلقین فرما رکھی تھی کہ مسلمانوں کے عمومی مفاد اور مصلحت کی

کوئی بات ہو تو اسے دیگر لوگوں تک پہنچاؤ اور یہ کہ کوئی شخص اپنی ضرورت اور حاجت کو حضور ﷺ تک براہ راست پہنچانے میں کوئی دقت یا حجاب محسوس کرتا ہو تو اس کا مسئلہ آپ ﷺ تک پہنچایا جائے۔ اس سلسلہ میں حضور ﷺ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی ضرورت اور مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچانے کا موقع نہیں پاتا، اس کا مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچانے والے مسلمان کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ثابت قدمی عطا فرمائیں گے۔ مجلس میں آنے والے جو لوگ سوالی ہو کر آتے تھے حضور ﷺ کے گھر سے کوئی چیز چکھے بغیر واپس نہیں جاتے تھے۔ اس مجلس میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک ہونے والے بہترین افراد ہوتے تھے جو مجلس سے باہر کے لوگوں کے لیے راہنما کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ مجلس اسی قسم کی باتوں پر مشتمل ہوتی تھی اور ان سے ہٹ کر کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

گھر سے باہر کی عمومی مجالس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ جناب نبی اکرم ﷺ مجلس کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ کرتے تھے اور مجلس کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہوتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ جب کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں تک مجلس پہنچ چکی ہوتی وہیں بیٹھ جاتے اور اس بات کی تلقین بھی فرماتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حضور اکرم ﷺ جس جگہ بیٹھ جاتے وہی جگہ مجلس کا صدر مقام بن جاتی تھی۔ ہر صاحب مجلس کو حضور اکرم ﷺ اس کا حصہ دیتے تھے اور کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے دوسرے اصحاب مجلس سے کم توجہ مل رہی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے سامنے کوئی شخص اپنا مسئلہ پیش کرتا یا کسی مسئلے پر بات کرتا تو آپ ﷺ اس کی پوری بات سنتے تھے اور جب تک وہ اپنی بات مکمل نہ کر لیتا اس سے رخ نہیں پھیرتے تھے۔ کوئی شخص حضور ﷺ کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کرتا تو آپ ﷺ اس کی ضرورت پوری کرتے یا نرمی کے ساتھ تسلی کی کوئی بات فرما دیتے۔ آنحضرت ﷺ کی مجلس علم کی مجلس ہوتی تھی، حیا کی مجلس ہوتی تھی، کسی پر الزام تراشی نہیں ہوتی تھی، کسی پر تہمت نہیں لگائی جاتی تھی، کسی کی غلطی کو اچھالا نہیں جاتا تھا، اور آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کے لیے باپ جیسے شفیق ہوتے تھے۔

مجلس سے ہٹ کر جناب نبی اکرم ﷺ کا عمومی انداز اور طرز عمل یہ ہوتا تھا کہ بے مقصد باتوں سے اپنی زبان کو بچاتے تھے اور وہی بات فرماتے تھے جس کی ضرورت ہوتی تھی۔ لوگوں کو قریب کرنے کی بات کرتے تھے، دور کرنے والی باتوں سے گریز کرتے تھے۔ کسی قوم کا بڑا آپ کے پاس آتا تو اس کا اکرام کرتے تھے اور اس کے ساتھ اسی سطح کا معاملہ فرماتے تھے۔ لوگوں کو اللہ کا خوف دلاتے رہتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے مگر کسی کو بے رخی کا احساس بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے حالات معلوم کرتے تھے اور اگر کوئی غیر حاضر ہوتا تو اس کی تحسین فرماتے اور اسے تقویت دیتے۔ آپ ﷺ اگر کوئی قبیح معاملہ دیکھتے تو اس کی قباحت کا ذکر کرتے اور حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ حضور ﷺ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ لوگ خیر کے معاملات سے غافل نہ ہو جائیں اور اس بات کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ وہ اکتا نہ جائیں۔ ہر قسم کے معاملے کا آپ کے پاس حل تیار ہوتا تھا اور ہر صورتحال کے لیے مستعد ہوتے تھے۔ آپ ﷺ حق بات کہنے سے نہیں کتراتے تھے اور ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ لوگوں میں سے آپ ﷺ سے زیادہ قریب وہی حضرات ہوتے تھے جو اچھے لوگ ہوتے تھے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کے ہاں سب سے زیادہ قابل احترام وہی شخص ہوتا تھا جو لوگوں کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہو اور آپ ﷺ کے ہاں اس شخص کو زیادہ قدر حاصل ہوتی تھی جو عام لوگوں کے ساتھ غم خواری اور مدد میں پیش پیش ہوتا تھا۔

آنحضرت ﷺ کے روزمرہ معمولات اور طرز عمل کے بارے میں یہ ارشادات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہیں۔ جبکہ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق ایک بار چند نوجوان صحابہ کرامؓ نے باہمی مشورہ کیا کہ حضور اکرم ﷺ کے گھر کے اندر کے معمولات معلوم کرنا چاہئیں تاکہ وہ بھی ان معمولات کی پیروی کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی خدمت میں باری باری حاضری دی اور دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ جب گھر کے اندر تشریف لاتے ہیں تو آپ ﷺ کے معمولات کیا ہوتے ہیں؟ ازواج مطہراتؓ میں سے ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ گھر کے اندر آپ ﷺ کے

معمولات کم و بیش وہی ہوتے ہیں جو ہر گھر کے سربراہ کے ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ آرام فرماتے ہیں، بیوی بچوں کو وقت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، آنے جانے والوں کے حالات دریافت کرتے ہیں، گھر کا کوئی کام کاج ہو تو اس میں ازواج مطہراتؓ کا ہاتھ بٹاتے ہیں، حتیٰ کہ جوتا گانٹھ لیتے ہیں، چارپائی کی مرمت کر لیتے ہیں اور اس طرح کے ضرورت کے کام آپ ﷺ خود کر لیا کرتے ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

"خارجہ پالیسی" کا جملہ جب بولا جاتا ہے تو سب سے پہلا یہ تاثر سامنے آتا ہے کہ ایک ریاست اور حکومت کو دوسری ریاستوں، حکومتوں اور قوموں کے ساتھ اپنے معاملات چلانے اور دنیا میں ان کے ساتھ مل جل کر رہنے کے لیے کوئی طریق کار اور اصول و قوانین طے کرنے ہیں۔ اس مفہوم میں جب ہم جناب نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی کے لیے ان کے طے کردہ اصولوں اور ہدایات کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو گفتگو کا دائرہ یہ بنتا ہے کہ مدینہ منورہ کی ریاست وجود میں آنے اور اس میں آنحضرت ﷺ کی حکومت و اقتدار قائم ہونے کے بعد خارجہ پالیسی کے بارے میں آپ ﷺ نے کیا طرز عمل اختیار کیا تھا اور کیا ہدایات دی تھیں، اس کے لیے ہمیں بنیادی طور پر

1. حضور ﷺ کے ان خطوط کا مطالعہ کرنا ہوگا جو آپ ﷺ نے دنیا کے مختلف ممالک کے حکمرانوں کو ارسال فرمائے تھے۔
2. ان معاہدات کا جائزہ لینا ہوگا جو متعدد اقوام اور ریاستوں کے ساتھ آپ ﷺ نے کیے تھے۔
3. اور ان وفود کے ساتھ رسالت مآب ﷺ کی گفتگو اور رویے کو سامنے رکھنا ہوگا جو مختلف مواقع پر مختلف اقوام کی طرف سے مدینہ منورہ آئے اور انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ باہمی معاملات پر گفتگو کی۔

دوسری قوموں کے ساتھ معاملات کے بارے میں قرآن کریم نے بیسیوں آیات میں احکام دیے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خارجہ پالیسی کی بنیاد انہی آیات

قرآنیہ پر تھی۔ ان ساری باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو صورتحال سامنے آتی ہے اس کے پیش نظر میری طالب علمانہ رائے میں حضور ﷺ کی خارجہ پالیسی کے بعض حصوں کو درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

☆ جناب نبی اکرم ﷺ رسول انسانیت ہیں اور آپ ﷺ کی دعوت و نبوت پوری نسل انسانی کے لیے ہے۔ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو سب سے پہلا خطاب کیا تھا وہ یاایھا الناس کے عنوان سے تھا کہ قریشیوں یا عربوں سے خطاب کرنے کی بجائے نبی آخر الزمان ﷺ پوری نسل انسانیت سے مخاطب ہوئے تھے۔ آج گلوبلائزیشن کے حوالے سے مغربی دنیا کچھ بھی کہے، مگر تاریخی حقیقت یہ ہے کہ رنگ و نسل، قومیت، جغرافیہ اور زبان وغیرہ کی حدود سے بالاتر ہو کر پوری نسل انسانیت کو اپنی دعوت و خطاب کا عنوان سب سے پہلے حضرت محمد ﷺ نے بنایا تھا اور گلوبلائزیشن کے اولین بانی پوری تاریخ انسانی میں حضور ﷺ ہی تھے۔ اس لیے آپ ﷺ نے دوسری قوموں، حکومتوں اور سرداروں کو جو خطوط لکھے ان میں سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت اسلام کے تعارف اور دعوت کو حاصل تھی جو جناب رسول اللہ ﷺ کی عالمگیر نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا۔

☆ جناب نبی اکرم ﷺ چونکہ دین فطرت لے کر آئے تھے جس کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر ہے اور آپ ﷺ کا دین تمام آسمانی دینوں کا آخری اور فائنل ورژن ہے۔ چنانچہ پوری نسل انسانی کو فطرت اور وحی کی طرف لانا بھی آنحضرت ﷺ کے مقاصد نبوت میں سے تھا جس کے لیے اسلام کا غلبہ اور برتری نسل انسانی کی ناگزیر ضرورت تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے دنیا کے تمام انسانوں کو دعوت دی کہ وہ اسلام قبول کریں۔ اور اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو نسل انسانی تک اس دین کے پہنچنے اور انسانوں کے اس مذہب کو قبول کرنے میں مزاحمت نہ کریں اور رکاوٹ نہ بنیں، یعنی وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی اسلام کے فروغ اور غلبے کی راہ میں حائل نہ ہوں۔

☆ یہ بات میرے خیال میں ایسی ہی ہے جیسے آج مغرب، دنیا کے تمام ممالک واقوام سے کہہ رہا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک مغربی تہذیب و ثقافت سب سے بہتر اور ایک آئیڈیل فلسفہ و تہذیب کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے دنیا کے تمام اقوام و ممالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ ویسٹرن سولائزیشن کی بالادستی کو قبول کریں اور اپنی اپنی علاقائی تہذیبوں اور ثقافتوں کو مغربی تہذیب و ثقافت کی حدود میں لے آئیں۔ مغرب اس کے لیے قوت، لابنگ اور دھونس کے سارے حربے استعمال کر رہا ہے اور دنیا بھر میں اپنی ثقافت کی بالادستی قائم کرنے کی جنگ لڑ رہا ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اسلام کا موقف بھی کم و بیش یہی ہے کہ چونکہ وہ دین فطرت ہے اس لیے اس کی بالادستی کے سامنے دنیا کی تمام اقوام و ممالک کو سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔

☆ چنانچہ اصل جھگڑا یہ نہیں ہے کہ کسی تہذیب و ثقافت کی بالادستی تسلیم کرانے کے لیے طاقت کا استعمال درست ہے یا نہیں، بلکہ اصل تنازع یہ ہے کہ مغرب کے دعوے کے مطابق دنیا پر بالادستی کا حق ویسٹرن سولائزیشن کو ہے، جبکہ ہم کہتے ہیں کہ نسل انسانی کی قیادت کا حق دین فطرت کو حاصل ہے اور انسانیت کی بھلائی اسی دین و ثقافت کو قبول کرنے میں ہے۔

بہر حال جناب نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی کا دوسرا بڑا نکتہ اسلام کا غلبہ اور اس کی بالادستی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنا تھا۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ یہ ہدایت دیا کرتے تھے کہ پہلے دوسری قوموں کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر اسے قبول نہ کریں تو اس بات کی دعوت دو کہ وہ اسلام کی بالادستی اور برتری تسلیم کریں اور اس کے فروغ و نفاذ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ اور اگر وہ اسلام بھی قبول نہ کریں اور اس کی اشاعت میں رکاوٹ بھی بنیں تو ان سے جہاد کرو۔ گویا جہاد اور جنگ اسلام قبول نہ کرنے پر نہیں ہے، بلکہ اس کی راہ میں مزاحم ہونے پر ہے۔

☆ اسلام قبول نہ کرنے والی اقوام کے ساتھ معاملات میں قرآن کریم نے جو ہدایات دی ہیں ان کی روشنی میں ان اقوام و ممالک کی درجہ بندی تین دائروں میں کی جاسکتی ہے۔ اس طرح یہ تین اصول ہیں جنہیں اسلام کی خارجہ پالیسی کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے:

1. سورۃ الممتحنہ کی آیت 8 کے مطابق:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ

جو قومیں مسلمانوں کے ساتھ دین کے حوالے سے جنگ نہیں کرتیں اور مسلمانوں کو ان کے ملک اور زمین سے محروم کرنے کے عمل میں شریک نہیں ہیں، ان کے ساتھ حسن سلوک اور برابری کی بنیاد پر تعلقات کی اجازت ہے۔ انہیں فقہائے کرام کی اصطلاح میں غیر محارب اقوام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

2. اس سے اگلی آیت کریمہ میں کہا گیا ہے کہ

اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

جو لوگ دین کے حوالے سے مسلمانوں سے جھگڑا کرتے ہیں، مسلمانوں کو ان کی زمین اور وطن سے محروم کرنے کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں، اور ایسا کرنے والوں کے ساتھ اس معاملہ میں معاون ہوتے ہیں، ان قوموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی اجازت نہیں ہے۔

3. جبکہ سورہ آل عمران کی آیت 28 میں حکم الٰہی یہ ہے کہ:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِىْ شَىْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ

"مسلمان کافروں کو دوست نہ بنائیں سوائے مومنوں کے اور جو مسلمان کافروں کو دوست بنائیں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ کسی بات پر نہیں نہیں۔ مگر یہ کہ ڈرو تم ان سے ڈرنا اور اللہ تعالیٰ تمہیں ڈراتا ہے اپنے سے (یعنی اپنے عذاب سے)"

البتہ کافروں کے شر سے بچنے کے لیے ظاہری تعلقات رکھے جاسکتے ہیں۔ اسے "تحفظاتی دائرے" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی میں یہ بات ایک بڑی حکمت عملی سمجھی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں جب آپ ﷺ نے "میثاق مدینہ" کی صورت میں یہودیوں کے ساتھ ایک مشترکہ ریاست تشکیل دی تھی جس پر یہودی قائم نہ رہے اور معاہدہ شکنی کی پاداش میں یکے بعد دیگرے یہودیوں کے تینوں قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریضہ مدینہ منورہ سے جلاوطن ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے خیبر کو مرکز بنا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور مسلمانوں کو یہودیوں کے ساتھ یہ فیصلہ کن جنگ نظر آنے لگی۔ اس پر جناب رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی جنگ سے پہلے قریش مکہ کے ساتھ "معاہدہ حدیبیہ" کر کے اس محاذ کو خاموش کیا اور اس کے فوراً بعد خیبر پر حملہ کر کے یہودیوں سے نمٹ لینے کا اہتمام کیا جو کہ جنگی اور سفارتی فراست و تدبر کا شاہکار ہے۔

☆ جناب نبی اکرم ﷺ نے بین الاقوامی سطح پر برابری اور رواداری کے باوجود اگر کہیں سے کوئی چیلنج سامنے آیا تو اسے قبول کرنے میں کمزوری نہیں دکھائی اور چیلنج کو قبول کر کے اس کا بروقت سامنا کیا۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے ایک سفیر کو شام کے علاقے میں قتل کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس دور کے عالمی عرف کے مطابق اسے اعلان جنگ تصور کرتے ہوئے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لشکر شام کی طرف روانہ کیا جس نے موتہ کے مقام پر جنگ لڑی اور اس میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔

☆ غزوہ خندق کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ قریش مکہ ہمارے خلاف آخری زور لگا چکے ہیں، اب وہ ہمارے خلاف جنگ کے لیے میدان میں نہیں آئیں گے بلکہ اب ہم ان کی طرف جنگ کرنے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا کہ اب قریش اور ان کے ہمنوا تلوار کی جنگ نہیں لڑیں گے بلکہ شعر و شاعری اور ادب و

خطابت کے ذریعے اسلام کی توہین اور مسلمانوں کی کردار کشی کی جنگ لڑیں گے۔ اسے میں آج کے عرف کے مطابق "میڈیا وار" سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ جنگ لڑنے کے لیے صحابہ کرامؓ کو دعوت دی تو تین بڑے شاعر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سامنے آئے اور ان کے ساتھ ایک بڑے خطیب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ بھی میدان میں ڈٹ گئے اور ان چاروں نے شاعری اور خطابت کے میدان میں کفر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اس کے ساتھ ہی عسکری قوت میں بھی قرآن کریم نے مسلمانوں کو اس حد تک آگے بڑھنے کا حکم دیا کہ مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے اس قدر طاقتور ہونا چاہیے کہ دشمن اس سے خوفزدہ ہوں اور طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے کہ ایک موثر خارجہ پالیسی کے لیے جہاں داخلی استحکام اور قومی وحدت ضروری ہے وہاں عسکری قوت میں بالا دستی اور رعب بھی اس کا ناگزیر تقاضا ہے، اور قرآن کریم نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔

یہ چند نکات جناب رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں آئے جو عرض کر دیے ہیں۔ جبکہ اجتماعیت اور نظام کے حوالے سے جناب نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اور پالیسیوں کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کرنے اور انہیں آج کی زبان و اسلوب میں سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ ہم مسلمان بالخصوص دینی حلقے اس اہم دینی و ملی ضرورت کی طرف توجہ دے سکیں۔ آمین یا رب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال اور اسوۂ نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ قیامت تک ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے اسوہ حسنہ ہے اور ہر دور میں نسل انسانی اس سے راہنمائی حاصل کرتی رہی ہے۔ آج بھی نسل انسانی اور خاص طور پر امت مسلمہ کے لیے یہی راہنمائی فلاح و نجات کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

امت مسلمہ اس وقت جن مسائل میں الجھی ہوئی ہے ان کی فہرست بہت طویل ہے اور انہیں صرف شمار کیا جائے تو اس کے لیے خاصا وقت درکار ہے، لیکن ان میں سے چند بڑے بڑے مسائل کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں تاکہ یہ بات ہمارے ذہنوں میں تازہ ہو جائے کہ ہمیں اسوۂ نبوی سے کیسے راہنمائی حاصل کرنی ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں بہت سی باتیں نسل انسانی اور امت کی راہنمائی کے لیے فرمائی تھیں، ان میں سے دو باتوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "کل امر الجاہلیۃ موضوع تحت قدمی" کہ جاہلیت کی ساری قدریں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ یعنی نسل انسانی کو جاہلیت کے دور سے نکال کر علم اور روشنی کی طرف لے جا رہا ہوں اور اس کے ساتھ ایک جاہلی قدر یعنی باہمی قتل و قتال کا ذکر کر کے فرمایا "لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض، لا ترجعوا بعدی ضلالاً یضرب بعضکم رقاب بعض" گویا آپ فرما رہے ہیں کہ تمہیں دور جاہلیت سے نکالنے کے لیے میں نے بڑی محنت کی ہے، بڑے مقابلے کیے ہیں، بڑی تکالیف اٹھائی ہیں۔ وہ کفر، ضلالت اور گمراہی کا دور تھا، اس دور کی طرف کہیں واپس نہ چلے جانا۔ اس کی سب سے بڑی علامت کیا ہو گی؟ دور جاہلیت کی اقدار میں سب سے مکروہ قدر کی نشاندہی کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

"یضرب بعضکم رقاب بعض" ایک دوسرے کی گردنیں مارنا نہ شروع کر دینا۔ فرمایا کہ ایسا کرنا جاہلیت کے دور کی طرف واپس جانا ہو گا اور اس کیفیت کو امت پر خدا کے عذاب کی سب سے خوفناک شکل قرار دیا۔

قرآن کریم میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (الانعام6:65)

آپ ان سے کہہ دیجیے، میں کئی قسم کے عذاب نازل کیا کرتا ہوں۔ اوپر آسمان سے بھی اور نیچے زمین سے بھی۔ پہلی امتوں پر یہ عذاب آتے رہے ہیں۔ آسمان سے پتھر برسے ہیں اور زمین پر زلزلے اور سیلاب آئے ہیں۔ عذاب کی کئی شکلیں ہیں، ایک شکل اس آیت میں یہ بیان فرمائی کہ تمہارے لئے یہ عذاب بھی ہو سکتا ہے کہ خود تمہیں ایک دوسرے کے لیے عذاب بنادوں۔ عذاب کی سب سے خوفناک صورت یہ ہے کہ نہ اوپر سے عذاب آئے نہ نیچے سے بلکہ "أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا" تمہیں گروہوں میں تقسیم کردے، وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ۔ اس کا محاورے کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے کہ تمہیں خانہ جنگی، باہمی قتل اور خونریزی کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے عذاب بنادے۔ فرمایا یہ جاہلیت کے دور کی طرف واپس جانا ہو گا۔

ہمیں آج اس امر کا جائزہ لینا ہو گا کہ جن جاہلی اقدار کو آنحضرت ﷺ نے پاؤں تلے روند کر علم اور روشنی پر مبنی سوسائٹی قائم کی تھی وہ جاہلی اقدار کہیں پھر تو ہمارے معاشرے میں واپس نہیں آگئیں؟ آج ہمارا حال یہ ہے کہ حضور ﷺ کا تذکرہ محبت اور عقیدت کے ساتھ تو کرتے ہیں اور ان کے مبارک تذکرے سے ثواب اور برکات بھی حاصل کرتے ہیں لیکن راہنمائی کے لیے اوروں کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ عقیدت و محبت اور ثواب و برکات کے ساتھ ساتھ راہنمائی کے لیے بھی جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کریں اور ان جاہلی اقدار سے نجات حاصل کرنے کی کوشش

کریں جو آج پھر سے ہماری سوسائٹی میں عام ہو گئی ہیں، اور اس معاشرہ کے احیاء کے لیے محنت کریں جو آپ ﷺ نے تیئیس سال کی محنت سے قائم کر کے دنیا کے سامنے بطور مثال پیش کیا تھا۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اس لیے تباہی کا شکار ہوئیں کہ ان کے ہاں قانون کا نفاذ سب پر یکساں نہیں ہوتا تھا، غریب آدمی جرم کرتا تو اسے سزا دی جاتی تھی لیکن معاشرہ کے بڑے لوگ اور وی آئی پی جرم کا ارتکاب کرتے تو وہ سزا سے بچ جاتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس صورت حال کو امتوں کی تباہی کا باعث قرار دیا ہے۔ جبکہ ہمارا عمومی مزاج یہ بن گیا ہے کہ کوئی بڑا آدمی سنگین سے سنگین جرم بھی کرتا ہے تو اس کے لیے باقاعدہ گنجائشیں تلاش کی جاتی ہیں اور اسے سزا سے بچانے کے لیے پورا نظام متحرک ہو جاتا ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے دیانت و امانت کو مسلمان فرد اور امت کا فریضہ قرار دیتے ہوئے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "امانت اور دیانت جب دنیا سے ختم ہو جائے گی تو یہ قیامت کا پیش خیمہ ہو گا۔" بد دیانتی اور نا اہلی کی ایک صورت جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی بیان فرمائی کہ جب معاملات اور اختیارات نا اہل لوگوں کے سپرد ہونے لگیں گے تو سمجھ لینا کہ قیامت قریب ہے، آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سب کرپشن، نا اہلی اور بد دیانتی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اسے فخر کی بات سمجھا جاتا ہے۔ عالم اسلام میں عمومی طور پر ہمارا حال یہ ہے کہ کرپشن اور بد دیانتی کا دور دورہ ہے اور لوٹ کھسوٹ اور اختیارات کے غلط استعمال کے علاوہ تجارت اور کاروبار میں بھی ہماری ساکھ بری طرح مجروح ہو چکی ہے۔ تجارتی دنیا میں ہماری ساکھ سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے اور بین الاقوامی برادری میں ہمارا اعتماد کسی طرح بحال نہیں ہو رہا۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے امت کو دشمن کے مقابلہ میں ہر وقت تیار رہنے کا حکم دیا تھا اور جنگی قوت اس حد تک فراہم کرنے کا حکم دیا تھا کہ دشمن پر مسلمانوں کا رعب رہے، یعنی

دنیا میں جنگی طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے لیکن آج ہم سائنس، ٹیکنالوجی اور جنگی اسباب میں باقی دنیا سے بہت پیچھے ہیں۔ اس لیے آج ہم سے اسوۂ نبوی ﷺ کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم راہنمائی کے اصل سرچشمہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کر کے دوسروں کی ذہنی غلامی سے نجات حاصل کریں، کرپشن اور نااہلی کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کریں، قانون کی سب کے لیے یکساں عملداری کا اہتمام کریں، سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے آگے بڑھنے کو اپنا ہدف قرار دیں اور جاہلیت کی ساری قدروں کو پھر سے پاؤں تلے روندتے ہوئے صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین کے دور کی مسلم سوسائٹی کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے محنت کریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

عدلِ اجتماعی کا تصور تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

آج مجھے عدل اجتماعی کے بارے میں جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور ارشادات گرامی کے حوالہ سے کچھ عرض کرنا ہے، اور اس کے بیسیوں پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو پر چند معروضات پیش کروں گا۔ وہ یہ کہ عام طور پر ایک حکومت اور ریاست کی ذمہ داری میں شہریوں کی جان ومال کی حفاظت، امن کی فراہمی، انصاف کے قیام اور ان کے حقوق کی پاسداری کو شامل کیا جاتا ہے لیکن جناب رسول اللہ ﷺ نے حکومت و ریاست کی ذمہ داریوں میں ایک اور بات کا اضافہ کیا کہ وہ شہریوں کو ضروریات زندگی کی فراہمی اور سوسائٹی کے نادار، بے سہارا اور معذور لوگوں کی کفالت کی بھی ذمہ دار ہے۔ اسی کو آج کی دنیا میں رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ مال اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا ومن ترک کلا وضیاعا فَاِلَیَّ وَعَلَیَّ اور جو شخص قرض کا بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کریں گے اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ گویا آپ ﷺ نے فرمایا کہ سوسائٹی کے نادار، مستحق اور بے سہارا اپنی ضروریات کے لیے میرے پاس آئیں گے، اور آپ ﷺ نے بات صرف فَاِلَیَّ پر نہیں چھوڑی بلکہ وَعَلَیَّ فرما کر خود کو اس کا ذمہ دار بھی قرار دیا۔ چنانچہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بیت المال کا تصور سامنے آیا جس کا دائرہ آنحضرت ﷺ کے دور میں یہ تھا کہ کسی شخص کو جو ضرورت بھی پیش آتی تھی وہ آپ ﷺ سے رجوع کرتا تھا اور آپ ﷺ بیت المال کے فنڈ سے اس کی ضرورت پوری فرما دیتے تھے۔ بیسیوں واقعات احادیث میں مذکور ہیں جن میں سے صرف دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کو ایک سفر کے لیے کچھ اونٹ درکار تھے، میں خاندان کا نمائندہ بن کر جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور سواریوں کا تقاضہ کیا، اس وقت آنحضرت ﷺ کے پاس اونٹ موجود نہیں تھے اس لیے آپ ﷺ نے نہیں دیے لیکن تھوڑی دیر کے بعد کہیں سے اونٹوں کا بندوبست ہو گیا تو مجھے واپس بلا کر دو جوڑے میرے حوالے کیے۔ اسی طرح ایک واقعہ حضور ﷺ کی خوش طبعی اور دل لگی کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ مجھے سفر کے لیے اونٹ کی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ٹھہرو میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں، وہ شخص فکر مند ہو گیا کہ میں اونٹنی کے بچے کے ساتھ کیا کروں گا۔ تھوڑی دیر اس کی فکر مندی سے محظوظ ہونے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا خدا کے بندے جو اونٹ میں تجھے دوں گا وہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہو گا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی ضروریات کے لیے نبی اکرم ﷺ سے رجوع کرتے تھے اور بیت المال سے ان کی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔ جبکہ اسے آپ ﷺ نے حکمرانوں کی مہربانی اور احسان قرار دینے کی بجائے حکومت کی ذمہ داری کے طور پر بیان کیا ہے۔ خود آنحضرت ﷺ کا مالی نظام یہ تھا کہ غنیمت میں سے بیت المال کو خمس یعنی پانچواں حصہ ملتا تھا اور اس خمس کا خمس جو کل غنیمت کا چار فی صد بنتا ہے حضور ﷺ کو اپنے ذاتی اور گھریلو اخراجات کے لیے دیا جاتا تھا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس خمس الخمس میں سے حضور ﷺ اپنی ازواج اور خاندان کے دیگر افراد کو خرچہ دیتے تھے اور یہ خرچ پورے ہونے کے بعد جو بچ جاتا تھا وہ پھر بیت المال کو عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے واپس کر دیتے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کو لوگوں کی ضروریاتِ حسب موقع فراہم کرنے کا ذمہ دار قرار دینے کی بات سب سے پہلے جناب نبی اکرم ﷺ نے کی ہے اور وہیں سے رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کا آغاز ہوتا ہے، اور آج بہت سی حکومتوں نے رفاہی ریاست کا یہ نظام اختیار کر رکھا ہے۔ یہ نظام خلفاء راشدین رضی اللہ عنہ کے دور میں باقاعدہ منظم ادارے

کی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی ایک عملی صورت حضرت عمر بن العزیزؒ کے دور خلافت کے ایک واقعہ کا ذکر کر کے واضح کرنا چاہتا ہوں جبکہ اس وقت مدینہ منورہ میں جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بیت المال کے آغاز کو کم و بیش ایک صدی گزر چکی تھی۔

کتاب الاموال میں امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت میں ان کے عراق کے گورنر عبد الحمید مرحوم نے ایک سال انہیں خط لکھا کہ صوبہ میں زکوٰۃ و عشر اور دیگر محصولات کی وصولی کے بعد پورے سال کا خرچہ اور بجٹ پورا کر کے کچھ رقم بچ گئی ہے اس کے بارے میں بتایا جائے کہ ہم کیا کریں؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب لکھا کہ یہ سروے کرواؤ کہ تمہارے صوبے میں جو لوگ مقروض ہیں اور اپنا قرضہ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے قرضے اس رقم سے ادا کرو، گورنر نے جواب دیا کہ حضرت یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ امیر المومنین نے دوسرا خط لکھا کہ جن بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہیں ان کی شادیاں اس رقم میں سے کرا دو۔ گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں، امیر المومنین نے تیسرا خط لکھا کہ جن خاوندوں نے ابھی تک بیویوں کے مہر ادا نہیں کیے اور وہ مہر ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے مہر اس رقم میں سے دلوا دو، گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں، امیر المومنین نے چوتھا خط لکھا کہ زمینوں کا سروے کرواؤ اور بے آباد زمینوں کی کاشت کے لیے کسانوں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔

دلچسپی کی بات، یہ ہے کہ میں نے یہ واقعہ ایک مجلس میں بیان کیا تو ایک نوجوان نے مجھ سے سوال کیا کہ مولوی صاحب! یہ صوبے کا بجٹ تھا یا بحر الکاہل تھا، ایک صوبے کے بجٹ میں اتنے پیسے کدھر سے آگئے تھے؟ میں نے جواب دیا کہ انہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا ایک اور واقعہ سن لو یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی۔ کتاب الاموال ہی کی روایت کے مطابق ایک دن حضرت عمر بن عبد العزیزؒ شام کے وقت گھر واپس آئے تو اہلیہ سے پوچھا کہ تمہارے پاس ایک درہم ہو تو مجھے دے دو ضرورت ہے۔ اس نے پوچھا کیا ضرورت ہے؟ فرمایا کہ آتے ہوئے راستے میں ایک ریڑھی پر انگور دیکھے ہیں، کھانے کو جی چاہتا ہے مگر

جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اہلیہ نے کہا کہ آپ کے پاس نہیں ہیں تو میرے پاس کہاں سے آئیں گے؟ پھر اس نے بیویوں والے انداز میں کہا کہ آپ کیسے امیر المومنین ہیں کہ اپنے لیے ایک درہم کے انگور بازار سے نہیں منگوا سکتے۔ میں اس کا ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ کیا آپ کے پاس اتنا صوابدیدی فنڈ بھی نہیں ہے کہ ایک درہم کے انگور اپنے لیے خرید سکیں؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس پر فرمایا کہ خدا کی بندی جس درہم کی تم بات کر رہی ہو وہ درہم نہیں آگ کا انگارہ ہے۔

میں نے اس نوجوان سے کہا کہ برخوردار! جس ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے درہم کو آگ کا انگارہ سمجھے گا اس کے خزانے میں پیسے ہی پیسے ہوں گے، پھر مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہوں گے، کنواروں کی شادیاں بھی ہوں گی، خاوندوں کے مہر بھی ادا ہوں گے، اور کسانوں کو قرضے بھی ملیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے روپے کو آگ کا انگارہ تصور کرے۔

حضرات محترم! میں نے عدلِ اجتماعی اور سوشل جسٹس کے حوالہ سے جناب نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کی صرف ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کی ہے، آج کی دنیا کو اسی نظام کی تلاش ہے اور یہی نسل انسانی کی بہت بڑی ضرورت ہے، یہ ہماری ضرورت بھی ہے اور ذمہ داری بھی کہ دنیا کو سوشل جسٹس کے اس تصور سے متعارف کرائیں اور جناب رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی تعلیمات کی روشنی میں صحیح سمت نسل انسانی کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

میڈیا کا محاذ اور اسوۂ نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

نبی کریم ﷺ کے ناموس و حرمت کے حوالہ سے بنائی گئی فلم کے حوالے سے دو پہلوؤں پر تو کچھ عرض نہیں کر سکوں گا۔ ایک اس کا فنی اور تکنیکی پہلو ہے جس کے بارے میں کوئی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، اس لیے کہ میں اس فن سے واقف نہیں ہوں اور نہ اس کا ذوق رکھتا ہوں۔ دوسرا پہلو جواز اور عدم جواز کی بحث کا ہے، اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کہہ سکوں گا، اس لیے کہ یہ مفتیان کرام کا کام ہے اور میں مفتی نہیں ہوں۔ چنانچہ نہ تو اس سلسلہ میں کوئی فتویٰ دوں گا اور نہ ہی کسی فتوے سے اختلاف کرنا چاہوں گا۔ البتہ ایک اور پہلو سے کچھ معروضات پیش کروں گا اور وہ ہے ضرورت کا پہلو۔

چونکہ میں خود بھی اس محاذ کا آدمی ہوں، اس لیے محاذ کی ضروریات اور تقاضوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ جناب نبی اکرم ﷺ جب جنگ احزاب (اس کو جنگ خندق بھی کہتے ہیں) سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ میں ایک اعلان فرمایا کہ اب قریشیوں کو ہمارے خلاف جنگ کے لیے یہاں آنے کی ہمت نہیں ہوگی، اب جب بھی جائیں گے ہم ہی جائیں گے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ اب یہ ہمارے خلاف زبان کی جنگ لڑیں گے اور خطابت و شاعری کا محاذ گرم کریں گے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کا بازار گرم کریں گے، پروپیگنڈہ کریں گے، کردار کشی کریں گے اور عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائیں گے۔ یہ فرما کر جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ اس جنگ میں کون آگے بڑھے گا؟ اس موقع پر تین انصاری صحابی حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن

رواحہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ جنگ ہم لڑیں گے۔ چنانچہ ان تینوں نے شاعری کے محاذ پر جبکہ ایک اور انصاری صحابی حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے خطابت کے محاذ پر یہ جنگ لڑی اور اس شان سے لڑی کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ مسجد نبوی ﷺ میں منبر پر کھڑے ہو کر کفار کے ادبی حملوں کا جواب دیا کرتے تھے اور حضور ﷺ کی مدحت کے ساتھ ساتھ اسلام کی خوبیاں بیان کرتے تھے جبکہ آپ ﷺ سامنے بیٹھے انہیں داد بھی دیتے تھے اور ان کے لیے دعا بھی فرماتے تھے۔

اسی طرح یہ واقعہ بھی بخاری شریف میں مذکور ہے کہ عمرۃ القضا کے موقع پر حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑے جب مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے تھے تو احرام باندھے ہوئے تلبیہ پڑھنے کی بجائے رزمیہ اشعار پڑھتے جا رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے رک جانے کے لیے اشارہ کیا تو حضور ﷺ نے انہیں آواز دی کہ دعہ یا عمر، عمر! اسے پڑھنے دو! اس کے اشعار تمہارے تیروں سے زیادہ کافروں کے سینوں میں نشانے پر لگ رہے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ بنو تمیم کا وفد جب مدینہ منورہ آیا تو انہوں نے جناب نبی اکرم ﷺ کو شعر و خطابت میں مقابلہ کی دعوت دے دی جو آپ ﷺ نے قبول فرمائی۔ اس کے لیے باقاعدہ مجلس بپا ہوئی جس میں بنو تمیم کے شاعر و خطیب نے اپنی خطابت اور شاعری کے جوہر دکھائے جس کے جواب میں حضرت ثابت قیس رضی اللہ عنہ نے خطابت اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے شاعری میں اسلام کی دعوت اور حضور ﷺ کی مدحت و تعارف پر بات کی، چنانچہ ان کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے تمیم نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس لیے ایک بات تو میں یہ عرض کروں گا کہ شعر و خطابت اس دور میں ابلاغ کے موثر ترین ذرائع تھے جنہیں جناب رسول اللہ ﷺ نے نظر انداز نہیں کیا بلکہ بھرپور طریقہ سے استعمال کیا، آج اس کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور ابلاغ کے دیگر موثر ترین ذرائع بھی سامنے

آ گئے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ہمیں اسلام کی دعوت اور دفاع دونوں کے لیے ان کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ حالت امن اور حالت جنگ کے قوانین میں فرق ہوتا ہے، بہت سی باتیں جو حالت امن میں درست نہیں ہوتیں مگر حالت جنگ میں انہیں مجبوراً اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص محاذ جنگ پر دشمن کے سامنے کھڑا ہے تو اسے یہ دیکھنا ہے کہ دشمن کے ہاتھ میں کون سا ہتھیار ہے اور اس کے مقابلہ میں کون سا ہتھیار اختیار کر کے دشمن کو زیر کر سکتا ہے، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اس کی مثال عرض کروں گا کہ ایٹم بم کو اسلام کی جنگی اخلاقیات کی رو سے ایک جائز ہتھیار قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ اور جہاد کے جو تقاضے اور دائرے بیان فرمائے ہیں کہ عورت کو قتل نہیں کرنا، بوڑھے کو قتل نہیں کرنا، غیر متعلقہ شخص کو قتل نہیں کرنا، بچے کو قتل نہیں کرنا اور دشمن کے اموال اور ملکیتوں کو بلاوجہ نقصان نہیں پہنچانا وغیرہ۔ ایٹم بم کے استعمال میں ان میں سے کسی بات کا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا، اس لیے میری طالب علمانہ رائے میں اگر جنگ میں اسلامی اخلاقیات کا لحاظ رکھا جائے تو ایٹم بم ایک جائز ہتھیار نہیں ہے، لیکن ہم سب ایٹم بم کے بنانے پر زور دیتے ہیں اور ہم نے ایٹمی صلاحیت حاصل کی ہے اس لیے کہ جب دشمن کے پاس یہ ہتھیار موجود ہے تو ہمارے پاس اس کا موجود ہونا ضروری ہے ورنہ ہم دشمن سے مار کھا جائیں گے۔ اسے اضطراری حالت کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح حالت اضطرار میں جان بچانے کے لیے حرام کھانا جائز ہو جاتا ہے اسی طرح جنگ میں جان بچانے کے لیے ایسے ہتھیار کا استعمال جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے جو اسلامی اصولوں کی رو سے شاید جائز ہتھیار نہ ہو۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح ہتھیاروں کی جنگ ہے اسی طرح میڈیا کی جنگ بھی ہے بلکہ آج کے دور میں میڈیا کی جنگ کا دائرہ ہتھیاروں کی جنگ سے زیادہ وسیع ہے اور میڈیا ہتھیار سے زیادہ دشمن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے جہاں ابلاغ کے ذرائع کا وقت کی ضرورت کے مطابق استعمال ضروری ہے وہاں اضطرار اور حالت جنگ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ آج عالمی سطح پر جس طرح "میڈیا وار" جاری ہے اور اسلام،

حضرت محمد ﷺ کی ناموس و حرمت اور اسلامی تعلیمات و روایات جس طرح بین الاقوامی پروپیگنڈے اور کردار کشی کے ہتھیاروں کی زد میں ہیں، اس کے پیش نظر ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ اس "میڈیا وار" کو نظر انداز کرنے کی بجائے اس میں پوری قوت کے ساتھ شریک ہوں اور اسی طرح اس میں حصہ لیں جس طرح غزوۂ خندق کے بعد ذرائع ابلاغ، ادب و خطابت اور شاعری کی جنگ میں جناب نبی اکرم ﷺ کے نامور صحابہ کرام حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے کردار ادا کیا تھا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسی زندگی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزمرہ معمولات کا آغاز بھی مجلس سے ہوتا تھا اور اختتام بھی مجلس پر ہی ہوتا تھا، صبح نماز کے بعد عمومی مجلس ہوتی تھی اور رات کو عشاء کے بعد خواص کی محفل جمتی تھی جبکہ دن میں بھی مجلس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سیرت اور حدیث کی مختلف روایات میں بتایا گیا ہے کہ نماز فجر کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ہی اشراق کے وقت تک تشریف فرما ہوتے تھے، اس دوران وہ ساتھیوں کا حال احوال پوچھتے تھے، کسی نے خواب دیکھا ہوتا تو وہ بیان کرتا تھا اور تعبیر پوچھتا تھا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو تعبیر کے ساتھ وہ خواب بیان فرماتے تھے، کوئی تازہ وحی نازل ہوتی تو اس کا ذکر کرتے تھے، کوئی اعلان کرنا ہوتا تو کرتے تھے۔ اس موقع پر مجلس میں دور جاہلیت کے واقعات کا تذکرہ ہوتا تھا اور شعر و شاعری کا دور بھی چل جاتا تھا جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم شریک نہیں ہوتے تھے لیکن سن کر مسکرا دیتے تھے۔ پھر سارا دن مجالس چلتی رہتی تھیں، احکام و مسائل کا تذکرہ ہوتا تھا، ہدایات ہوتی تھیں اور تلاوت اور ذکر و اذکار کا سلسلہ بھی ہوتا تھا جبکہ عشاء کے بعد خواص کی مجلس ہوتی تھی۔

اس مجلس کا تذکرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شمائل ترمذی کی ایک روایت کے مطابق یوں کیا ہے کہ خاص خاص احباب عشاء کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حجرے میں جمع ہو جاتے تھے۔ جہاں اس رات آپ کا قیام ہوتا تھا، اس میں مختلف علاقوں کی صورت حال پیش کی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبیلوں اور علاقوں کے حالات دریافت کرتے تھے اور لوگوں تک پہنچانے کے لیے پیغامات دیتے تھے، اس طرح مجموعی صورت حال پر باہمی مشاورت ہو جاتی تھی اور اگلے روز کی تیاری بھی ہوتی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بہت سے

لوگ جو اپنی حاجات اور ضروریات خود جناب رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش نہیں کر پاتے تھے، ان کی ضروریات اور مسائل ہم لوگ رات کی مجلس میں پیش کر دیتے تھے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کی مجالس میں ہر طرح کی باتیں ہوتی تھیں اور بے تکلفی کے ماحول میں ہوتی تھیں۔ رسول اکرم ﷺ کا ادب و احترام صحابہ کرامؓ کے دلوں میں حد سے زیادہ تھا لیکن اس کے باوجود مجلس کا ماحول کھلا رہتا، حضور ﷺ خود بھی طبعی اور دل لگی فرماتے تھے اور صحابہ کرامؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ بے تکلفی اور خوش طبعی کر لیتے تھے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کے ایک صحابی کا نام حضرت نعیمان رضی اللہ عنہ ہے، بدری صحابی تھے اور بہت خوش طبع آدمی تھے، ان کی دل لگی کے بہت سے واقعات ان کے تذکرہ میں ملتے ہیں حتیٰ کہ حضور ﷺ کے ساتھ بھی دل لگی کر لیتے تھے، ایک بار وہ مسجد میں آرہے تھے کہ راستہ میں ایک ریڑھی پر انگور دیکھے، بیچنے والے سے کچھ انگور لیے اور کہا کہ یہ مسجد میں لے جارہا ہوں اگر پسند نہ آئے تو واپس کر دوں گا ورنہ تھوڑی دیر کے بعد تم مسجد میں آکر پیسے لے لینا، مسجد میں جناب نبی اکرم ﷺ تشریف فرما تھے۔ نعیمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! انگور کھائیں گے؟ فرمایا کھالیں گے۔ اس نے انگور حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیے، آپ ﷺ نے کھائے اور مجلس میں بیٹھے دوسرے لوگوں نے بھی کھائے۔ تھوڑی دیر میں انگوروں والے نے آکر پیسے مانگے تو نعیمان رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اس کو پیسے دے دیں۔ فرمایا کس بات کے؟ کہا یہ جو انگور کھائے ہیں ان کے پیسے۔ فرمایا کہ میں نے تو نہیں منگوائے تھے، نعیمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کھائے تو ہیں نا! آپ ﷺ نے پیسے دے دیے تو نعیمان رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کہ اس کے بغیر آپ ﷺ نے انگور کھانے نہیں تھے۔ غرضیکہ نبی اکرم ﷺ کی مجلس سب دوستوں کے ساتھ بے تکلفانہ ہوتی تھی اور ہر قسم کا ذوق رکھنے والے کو اس میں اپنی تسکین کا سامان مل جاتا تھا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

نعتیہ شاعری اور ادب و احترام کے تقاضے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب نبی اکرم ﷺ کا تذکرہ نثر میں ہو یا نظم میں، باعث برکت و سعادت ہے اور ذکر رسول ﷺ کے ہزاروں پہلو ہیں جن پر مختلف حوالوں سے علمی کاوشوں کا سلسلہ جاری ہے۔

نعتیہ شاعری کے بعض پہلوؤں پر میرے پیش رو مقررین نے خوبصورت خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ میں اس کی مقصدیت کے حوالے سے عرض کرنا چاہوں گا کہ ذکر رسول ﷺ کا مقصد اپنے جذبات اور محبت و عقیدت کا اظہار تو ہوتا ہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی نسبت کا اظہار بھی کرتا ہے اور محبت و عقیدت بھی پیش کرتا ہے۔ لیکن نعتیہ شاعری کا ایک اہم پہلو ہمارے پیش نظر ضرور ہونا چاہیے کہ خود جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کا کس حوالہ سے تقاضہ کیا تھا؟ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ اب قریش کو ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوگی، البتہ وہ خطابت و شعر کا محاذ گرم کریں گے اور تمہارے خلاف عربوں کو بھڑکائیں گے۔ یہ جنگ جو زبان کے ساتھ لڑی جائے گی اس میں کون کون سامنے آئے گا؟ اس پر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سامنے آئے جو اپنے وقت کے بڑے شعراء تھے۔ جبکہ خطابت کے محاذ پر حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے مورچہ سنبھالا اور شعر و خطابت کی یہ جنگ کامیابی کے ساتھ لڑی گئی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ اسلام کے دفاع کی جنگ تھی اور جناب رسول اللہ ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ کی جنگ تھی۔ ان خطباء و شعراء نے حضور اکرم ﷺ کی مدح اور اسلام کی خوبیوں کے بیان کے ساتھ ساتھ کفار کی طرف سے کی جانے والی ہجو اور

اٹھائے جانے والے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جواب دیا اور کفار کے پروپیگنڈے کا رخ پھیر دیا۔ آج بھی ہمیں یہی صورت حال درپیش ہے۔ عالمی سطح پر اسلامی احکام و قوانین، قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر طرح طرح کے اعتراضات دہرائے جا رہے ہیں اور اسلام کے ساتھ ساتھ دیندار لوگوں کی کردار کشی کی مہم بھی ہر سطح پر جاری ہے۔ ان حالات میں نعتیہ شاعری کو بھی اسلام کے دفاع اور حضور اکرم ﷺ کی حرمت و ناموس کے تحفظ کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور حالات کے تقاضے کے پیش نظر اس پہلو کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

دوسری بات جو میں اس ضمن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نعتیہ شاعری میں اظہار جذبات کے لیے جس احتیاط کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے اس کی ضرورت آج زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرنا چاہوں گا کہ جب ان کے سامنے حضور ﷺ نے قریش مکہ کے شاعروں کی طرف سے کی جانے والی ہجو کا ذکر کیا تو انہوں نے اپنی زبان ہاتھ میں پکڑ کر کہا کہ میں اس زبان کے ساتھ ان کو چیر کر رکھ دوں گا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی قریش میں سے ہوں، میرے نسب کا کیا کرو گے؟ یعنی قریش کی مذمت کرتے ہوئے مجھے زد میں آنے سے کیسے بچاؤ گے؟ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کو درمیان سے اس طرح نکال لوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر میرے نسب کی تفصیلات معلوم کر لو تاکہ تم قریش کی ہجو کا جواب دیتے وقت اس کا لحاظ کر سکو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس بات کی تلقین فرمائی ہے کہ ان کی مدح و نعت میں ادب و احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

اس سلسلہ میں مجھے اپنے طالب علمی کے دور کا ایک واقعہ نہیں بھولتا کہ گوجرانوالہ میں بہت سے شعراء کرام تھے جو ادبی اور شعری محفلوں کا اہتمام کیا کرتے تھے جن پر اثر لدھیانوی، عزیز لدھیانوی، بیکس فتح گڑھی، راشد بزمی اور دوسرے شعراء شامل تھے۔ یہ سب اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

یہ 1964 اور 1965 کے لگ بھگ کی بات ہے، میں بھی ان کی محفلوں میں جایا کرتا تھا۔ میں شعر کہتا تو نہیں تھا البتہ ادبی محفلوں کا ذوق ضرور رکھتا تھا۔ ان دنوں پل لکڑ والا کے قریب ایک بزرگ ٹیلر ماسٹر تھے اور شہید جالندھری کے نام سے شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے ہاں شعراء کی محفل تھی اور مولانا ظفر علی خان مرحوم کی مشہور نعت کا مصرعہ

دل زندہ جس سے ہے وہ تمنا تم ہی تو ہو

کو طرح مصرعہ بنا کر بہت سے شعراء نے اس محفل میں نعتیہ کلام پیش کیا مگر شہید جالندھری مرحوم نے اس مصرع سے اختلاف کیا اور کہا کہ "تم ہی تو ہو" کا انداز خطاب بہت زیادہ بے تکلفانہ ہے اور میرا جی نہیں چاہتا کہ حضور ﷺ کو اس لہجے میں خطاب کروں۔ انہوں نے اپنی نظم یا نعت میں اسے "آپ ہی تو ہیں" کے جملہ سے تبدیل کر دیا اور اس کے مطابق آپ ﷺ کی بارگاہ میں ہدیہ نعت پیش کیا۔ یہ بات انہوں نے اس انداز سے کہی کہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی اور نصف صدی گزر جانے کے باوجود ان کا انداز بلکہ ان کا سراپا اب تک ذہن میں نقش ہے۔ مجھے ان کی یہ بات بہت اچھی لگی اور میں ایسے موقع پر اس کا تذکرہ ضرور کیا کرتا ہوں۔

اس لیے گزارش ہے کہ نعتیہ شاعری میں اسلام اور جناب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں منفی پروپیگنڈے کے جواب کا پہلو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ادب و احترام کے تقاضوں کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے کہ

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہم اپنی نسبت کے اظہار اور شناخت کے لیے کرتے ہیں کہ اس سے انسانی سوسائٹی کی رنگا رنگ تقسیم میں ہمار التعارف ہو جاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کے اظہار کے بعد مزید کسی تعارف کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہم یہ تذکرہ محبت کے اظہار کے لیے بھی کرتے ہیں کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کا ذکر بھی اکثر زبان پر رہتا ہے۔ اور یہ ذکر کرنا نہیں پڑتا بلکہ خود بخود ہو جاتا ہے کہ محبت اپنا اظہار خود کرتی ہے اور اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے ساتھ ہم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ برکتوں اور رحمتوں کے حصول کے لیے کرتے ہیں کہ جہاں آقائے نامدار کا ذکر ہوتا ہے وہاں رحمتوں اور برکتوں کا صرف نزول نہیں ہوتا بلکہ بارش ہوتی ہے۔ جبکہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بھی کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نثر میں ہو یا نظم میں، مدح و نعت کی صورت میں ہو یا رہبری وراہنمائی کے حوالے سے ہو، ہر طرح باعث برکت ہے۔ لیکن اس مبارک تذکرہ کے کچھ آداب ہیں جنہیں ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ آداب اور تقاضے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی بیان کیے ہیں اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے دو تین کا تذکرہ کرنا اس وقت مناسب سمجھتا ہوں۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا۔ (سورہ النور ۲۴۔ آیت ۶۳)

"رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کے بلانے جیسا نہ سمجھو۔"

اس کے مختلف معانی مفسرین کرام نے بیان کیے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی دعا عام آدمی کی دعا کی طرح نہیں ہے۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ حضور ﷺ کسی کو بلائیں تو ان کا بلانا عام آدمی کے بلانے کی طرح نہیں ہے۔ اور تیسرا معنی یہ ہے کہ حضور ﷺ کو اس طرح بے تکلفی سے نہ پکارو جس طرح ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ یہ مقام ادب ہے حتیٰ کہ اس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ اگر مجلس میں تمہاری آواز رسول اللہ ﷺ کی آواز سے بلند ہو گئی تو یہ سوء ادب تصور ہو گی اور تمہاری نیکیاں اس طرح برباد ہو جائیں گی کہ تمہیں شعور تک نہ ہو گا۔

لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروله بالقول (سورۃالحجرات آیت نمبر 2)

اس پر مجھے اپنا بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا ہے کہ ہمارے طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ میں ایک نعتیہ مشاعرہ تھا جس میں طرح مصرعہ یہ تھا

دل زندہ جس سے ہے وہ تم ہی تو ہو

یہ مولانا ظفر علی خان مرحوم کی ایک معروف نعت کا مصرعہ ہے۔ مگر ایک شاعر شہید جالندھری مرحوم نے یہ کہہ کر مصرعہ بدل لیا کہ میرا حضور ﷺ کو "تم ہی تو ہو" کہہ کر خطاب کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں اسے "آپ ہی تو ہیں" میں تبدیل کر رہا ہوں۔ اس شاعر کی یہ بات میرے دل میں ایسی پیوست ہوئی کہ آج تک وہ منظر آنکھوں کے سامنے زندہ ہے۔ اس لیے نعت میں یا خطابت میں آنحضرت ﷺ کا تذکرہ اس طرح کی بے تکلفی کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے جیسی ہم آپس میں روا رکھتے ہیں اور ادب و احترام کے تقاضوں کو ہر طرح سے ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اسی طرح بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ ایک عید کے موقع پر انصار مدینہ کے کسی گھر میں گئے، وہاں چھوٹی بچیاں اپنے بڑوں کو یاد کر کے نظمیں گا رہی تھیں۔ حضور ﷺ سنتے رہے لیکن جب ایک بچی نے یہ پڑھا وفینا نبی یعلم ما فی غد کہ ہمارے درمیان ایک پیغمبر موجود ہیں جو آنے والے کل کی بات بھی جانتے ہیں تو

آپ ﷺ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ بیٹی! اس کو چھوڑ دو اور باقی جو کچھ پڑھ رہی ہو، پڑھتی رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے عقائد کا بالخصوص عقیدہ توحید کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور کوئی ایسی بات آپ ﷺ کے حوالہ سے نہیں کہنی چاہیے جو عقیدہ کے منافی ہو اور اس سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر زد پڑتی ہو۔

اس کے ساتھ ہی یہ روایت ہے کہ جب جناب نبی اکرم ﷺ کے خلاف نعوذ باللہ عرب شاعروں کی طرف سے کی جانے والی ہجو کا جواب دینے کے لیے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عزم کا اظہار کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنی زبان کے ساتھ قریش کے شاعروں کو چمڑے کی طرح چیر کر رکھ دوں گا تو حضور ﷺ نے فرمایا کیف وفیھم نسبی؟ کہ ان کی مذمت کیسے کرو گے جبکہ میرا نسب بھی ان میں ہے؟ تو حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں قریش کی ہجو کرتے ہوئے آپ ﷺ کو ایسے نکال لوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے انہیں ہدایت کی کہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مل کر ان سے نسب نامے کی تفصیل معلوم کر لیں تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قریش کی مذمت کرتے ہوئے آپ ﷺ کی ذات گرامی بھی غیر شعوری طور پر زد میں آجائے۔

اس لیے میں نعت خوان حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نعت رسول اللہ ﷺ کا ناگزیز تقاضہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی عقائد بالخصوص توحید کا خیال رکھا جائے۔ اور حضور ﷺ کا تذکرہ اس طرح بے تکلفانہ انداز میں نہ کیا جائے جیسے ہم آپس میں ایک دوسرے کا کرتے ہیں اور آپ ﷺ کے تذکرہ میں سوءِ ادب کے ہر ممکنہ پہلو سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

سیرت طیبہ اور امن عامہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ○

مجھ سے پہلے اپنی گفتگو میں حضرت مولانا مفتی محمد طیب صاحب نے امن عامہ کے حوالہ سے جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے اس پہلو پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دس سالہ مدنی زندگی میں جہاں بہت سے غزوات کی قیادت فرمائی ہے اور جہاد و قتال کیا ہے وہاں دوسری قوموں کے ساتھ بہت سے معاہدات بھی کیے ہیں۔ اور باہمی صلح و امن کے معاملات بھی فرمائے ہیں جن کا آغاز میثاق مدینہ سے ہوا تھا اور اس کے بعد درجنوں اقوام کے ساتھ وقتاً فوقتاً معاہدے کیے گئے۔ میں بھی اسی گفتگو کو آگے بڑھاؤں گا اور یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ہمیشہ امن کو ترجیح دی ہے۔ معاشرہ میں منافرت اور فساد کو پھیلنے سے روکا ہے اور عام لوگوں کے امن کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات و احساسات کا بھی پوری طرح لحاظ رکھا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی میں فساد کا ذریعہ بننے والی باتوں کی جناب رسول اللہ ﷺ نے سختی کے ساتھ نفی فرمائی ہے اور ان کی مذمت کی ہے۔ اس حوالے سے بیسیوں واقعات میں سے ایک دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

قبیلہ بنو مصطلق کی طرف زکوٰۃ و عشر کی وصولی کے لیے آنحضرت ﷺ کی طرف سے تشریف لے جانے والے عامل کا استقبال کرنے کے لیے قبیلہ کے لوگ مسلح ہو کر گاؤں سے باہر جمع ہوئے تو مدینہ منورہ سے تشریف لانے والے بزرگؓ انہیں ہتھیار بکف دیکھ کر مغالطہ

کا شکار ہو گئے کہ یہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی واپس مدینہ کی طرف لوٹ گئے، انہوں نے جب کچھ لوگوں کو بتایا کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں تو مدینہ میں کھلبلی مچ گئی اور لوگ رد عمل میں اس قبیلہ کے خلاف کارروائی کا تقاضہ کرنے لگے۔ اتنے میں قبیلہ کے سردار بھی مدینہ منورہ پہنچ گئے اور وضاحت کی کہ ہم قتل کرنے کے لیے نہیں بلکہ استقبال اور پروٹوکول کے لیے ہتھیار بکف ہو کر جناب رسول اللہ ﷺ کے قاصد کے انتظار میں بستی سے باہر کھڑے تھے۔

اس موقع پر قرآن کریم میں یہ حکم نازل ہوا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ○ اے ایمان والو! جب اس قسم کی کوئی خبر آئے تو رد عمل میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے خبر کی تحقیق کر لیا کرو، تاکہ کسی قوم کے خلاف کارروائی کر ڈالنے کے بعد یہ معلوم کر کے تمہیں شرمندگی نہ ہو کہ وہ خبر تو صحیح نہیں تھی۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ کوئی جھوٹی سچی خبر سنتے ہی موبائل فونوں کا میسج سسٹم متحرک ہو جاتا ہے اور ٹی وی چینلوں پر پٹیاں چل جاتی ہیں۔ چند گھنٹوں میں وہ خبر ہر طرف پھیل کر اپنا کام دکھا چکتی ہے، اور فساد و جدال کے معرکے بپا ہو چکتے ہیں تو دوسرے دن پتہ چلتا ہے کہ وہ میسج درست نہیں تھا اور وہ ٹی وی کی پٹی تحقیق کے بغیر تھی۔ آج معاشرے میں ہر طرف پھیلنے والے فساد و قتال پر قابو پانے کے لیے ہمیں خبر کی تحقیق کی طرف توجہ دینا ہو گی۔ میسج اور پٹی کی اس وبا کو کنٹرول کرنا ہو گا اور حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا ہو گا کہ:

"کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو تحقیق کے بغیر آگے بیان کر دے۔"

ہمارے ہاں ایک اور بیماری پھیلتی جا رہی ہے کہ تکفیر اور اس کی بنیاد پر قتل کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ فلاں کافر ہے اسے قتل کر دو، اور فلاں مرتد ہے اس لیے واجب القتل ہے۔ جبکہ اس حوالہ سے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ میں علماء کرام کو جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے اس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ آپ ﷺ کو مدینہ منورہ میں عبد

اللہ بن ابی اور اس کے ساتھ اس کے سینکڑوں ساتھیوں کی ریشہ دوانیوں کا مسلسل سامنا رہا۔ ان لوگوں پر خود قرآن کریم نے وماھم بمؤمنین کہہ کر کفر کا فتویٰ لگایا۔ اسلام اور رسول اکرم ﷺ کے خلاف ان کی متعدد سازشیں ثابت ہوگئیں مگر آپ ﷺ نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی درخواست کے باوجود انہیں قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور قتل نہ کرنے یا اس کی اجازت نہ دینے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمد ﷺ تو اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنے لگے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اقدام کا اپنی جگہ صحیح ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی دیکھنا سنت نبوی ﷺ ہے کہ اس کے عمومی اثرات کیا ہوں گے اور دنیا والے اس کا کیا مطلب سمجھیں گے۔

اسی طرح قریش کی طرف سے خانہ کعبہ کی تعمیر کے دوران بیت اللہ کی ابراہیمی بنیادوں کو نظر انداز کر دینے پر حضور ﷺ خوش نہیں تھے۔ انہوں نے اس خواہش کا برملا اظہار فرمادیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی عمارت کو شہید کر کے اسے دوبارہ ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کروں۔ لیکن ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ قوم قریش نئی نئی مسلمان ہوئی ہے، یہ اس بات کو محسوس کریں گے کہ ان کا تعمیر کردہ بیت اللہ شہید کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ کسی بھی کام کے عمومی اثرات کا لحاظ رکھنا اور عام لوگوں کے جذبات واحساسات کا احترام کرنا بھی جناب نبی اکرم ﷺ نے ہمیں سکھایا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو اسوۂ نبوی ﷺ کے اس پہلو کو سامنے رکھنے کی صورت میں ہم معاشرتی فساد اور باہمی قتل وقتال کے بہت سے معاملات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

علماء کرام سے گزارش ہے کہ آج کے حالات کے تناظر میں حضور ﷺ کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کے ان پہلوؤں کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ کیونکہ جس دلدل میں قومی سطح پر ہم بری طرح پھنس چکے ہیں اس سے نکلنے کا راستہ یہی ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

حالات کا اتار چڑھاؤ اور اسوۂ نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

حالات کے اتار چڑھاؤ سے یقیناً پریشانی ہوتی ہے لیکن یہ اتار چڑھاؤ تاریخ کا ناگزیز حصہ ہے اور اہل حق کے سفر کے سنگ میل ہی مسائل و مشکلات اور مصائب و آلام ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اور میں اس سلسلہ میں دور نبوی ﷺ کے دو تین واقعات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا کہ ایسے حالات میں ہمیں کیسے کام کرنا چاہیے؟

جناب نبی اکرم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ کی طرف جا رہے تھے تو ظاہری کیفیت یہ تھی کہ چھپتے چھپاتے مدینہ منورہ پہنچنے کی کوشش تھی۔ عام راستے سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے، اور زیادہ تر سفر رات کو کرتے تھے۔ اہل مکہ کی طرف سے بھیجی جانے والی بہت سی ٹولیاں تعاقب میں تھیں جن سے بچنے کے لیے تین دن غار ثور میں روپوش بھی رہے تھے۔ مگر جب دوران سفر سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کا سامنا ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انہیں فرمایا کہ میں تمہارے ہاتھ میں کسریٰ بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔ اپنے وقت پر یہ کنگن انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں پہنا بھی دیے۔ یہ جناب رسول اللہ ﷺ کا معجزہ تھا مگر اس کے ساتھ اس میں یہ سبق بھی ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی کسی مسلمان کو اپنے مشن اور پروگرام سے غافل نہیں رہنا چاہیے اور اپنے حوصلہ کی سطح کو قائم رکھنا چاہیے۔ غزوۂ خندق میں جب مدینہ منورہ کی آبادی پر خوف و ہراس کی کیفیت طاری تھی اور دشمن کے پہنچنے سے قبل خندق کو کھود لینا ہی سب سے اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک چٹان پر کدال سے ضرب لگائی تو اس سے چنگاریاں پھوٹیں جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس چمک سے قیصر کے محلات

دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی سبق تھا کہ حالات کی سنگینی وقتی بات ہے۔ ان کا حوصلے کے ساتھ سامنا کرو اور اپنے مقصد اور منزل کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔

اس کے ساتھ ہی علماء کرام کو ایک اور واقعہ کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے جرنیل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جناب نبی اکرم ﷺ نے سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا خطاب دیا تھا۔ مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ خطاب انہیں کون سے کارنامے پر ملا تھا؟ موتہ کی جنگ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی یکے بعد دیگرے شہادت کے بعد جب مسلمانوں کے لشکر کی کمان حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سنبھالی تو آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ میں اپنے ساتھیوں کو اس کی خبر دی اور فرمایا کہ اب مسلمانوں کی کمان اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ) نے سنبھال لی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حضور ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لیے سیف اللہ کا لقب ارشاد فرمایا تھا۔ اس وقت ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے دشمن کی فوج کے نرغے میں گھیرے ہوئے اپنے ساتھیوں کو بحفاظت وہاں سے نکال کر مدینہ منورہ میں ان کے گھروں تک پہنچا دیا تھا۔ اور اس عظیم خدمت پر سیف اللہ کے خطاب کے مستحق قرار پائے تھے۔ جبکہ ان کی واپسی پر مدینہ منورہ کے عام لوگوں نے انہیں انتم الفرارون (تم بھگوڑے) ہو، کہہ کر پکارا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد صرف لڑنے اور ہر حال میں لڑتے رہنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اپنے ساتھیوں کی حفاظت اور انہیں نرغے سے نکال کر گھر واپس لے آنا بھی جہاد کہلاتا ہے۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ اور صحابہ کرامؓ کے اسوۂ حسنہ سے راہنمائی حاصل کر کے حالات کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل طے کرنا چاہیے۔ اس پس منظر میں بطور مشورہ میں علماء کرام سے گزارش کروں گا کہ آج کے حالات کے دائرے میں رہتے ہوئے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ:

☆ ہر قسم کے تصادم سے گریز کریں اور قانون و دستور کی حدود میں رہتے ہوئے دینی جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔

☆ دینی جدو جہد سے بالکل لاتعلق رہنا میرے نزدیک کسی بھی عالم کے لیے جائز نہیں ہے۔ علماء کرام کو دینی جدوجہد میں کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کرتے رہنا چاہیے۔

☆ دینی جدوجہد کے تمام شعبے مثلاً نفاذ شریعت، دعوت و تبلیغ، جہاد، تحفظ ناموسِ رسالت، عقیدۂ ختم نبوت کی حفاظت، دفاع صحابہ کرامؓ، دفاع حنفیت، دفاع مسلک وغیرہ سب دین کے شعبے ہیں۔ ان میں جس شعبہ کے ساتھ ذوق وابستہ ہو اس میں کام کرنا چاہیے۔

☆ جبکہ ایک دوسرے کے کام کی نفی اور مخالفت سے ہر قیمت پر گریز کرنا چاہیے۔ آپ اپنے ذوق کے شعبہ میں کام کرتے ہوئے دوسرے کسی شعبہ کے ساتھیوں سے تعاون کر سکیں تو یہ بہت اچھی بات ہوگی، ورنہ مخالفت نہ کریں، ان کے کام کو ہلکا مت سمجھیں اور کسی کا مذاق نہ اڑائیں۔ کیونکہ ہمارا یہ باہمی تعاون واحترام ہی دینی جدوجہد میں مثبت پیش رفت کا ضامن ہوگا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

رسول اکرم ﷺ بطور سیاست دان

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کائنات کی سب سے بڑی صاحب کمالات شخصیت ہیں اور آپ کو کمال کی ہر صفت عروج کے اعلیٰ ترین درجہ پر عطا ہوئی ہے۔ آپ سب سے بڑے رسول و نبی ہیں، سب سے بڑے قانون دان ہیں، سب سے بڑے جرنیل ہیں، سب سے اعلیٰ حکمران ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑے سیاست دان بھی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی سیاسی زندگی کے مختلف اور متنوع پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک پر مستقل کام کی ضرورت ہے اور ہمارے ہاں سیرت نبوی ﷺ کے ان پہلوؤں پر سب سے کم کام ہو رہا ہے۔ ہم نے قرآن کریم کی طرح جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت کو بھی صرف برکت و رحمت اور اجر و ثواب کے حصول کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کا تذکرہ فیوض و برکات، رحمتوں اور اجر و ثواب کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن اس کا اصل مقصد راہنمائی حاصل کرنا ہے اور اپنے مسائل و مشکلات کا حل اس میں سے تلاش کرنا ہے، جس کی طرف ہماری توجہ بہت ہی کم ہے۔

سیاسیات کے حوالہ سے آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کا ایک حصہ وہ ہے جن میں اسلام کے سیاسی نظام کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اسلامی ریاست کی بنیادوں کا تعین کیا گیا ہے اور ایک مسلم حکومت کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی سینکڑوں احادیث اس سلسلہ میں موجود ہیں۔ جبکہ دوسرا حصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک سیاستدان اور حاکم وقت کے طور پر سینکڑوں فیصلے کیے ہیں جن میں سے ہر فیصلہ ہمارے لیے سرمہ بصیرت اور راہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ بشرطیکہ ہم ان فیصلوں اور واقعات کو سیاسی حکمت

و تدبر کے تناظر میں دیکھیں اور ان میں اپنے دور کی مشکلات و مسائل کا حل تلاش کرنے کا ذوق ہم میں بیدار ہو جائے۔

آج کی محفل میں سیرت طیبہ کے اول الذکر پہلو کے بارے میں چند معروضات پیش کرنا چاہوں گا جس میں رسالت مآب ﷺ نے اسلام کے سیاسی اصولوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور اسلامی ریاست و حکومت کے فرائض اور حقوق کی وضاحت کی ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے سیاسی نظام کا تعارف بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس طرح کرایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاست و حکومت کے فرائض حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سر انجام دیتے تھے۔ ایک نبی چلا جاتا تو دوسرا اس کی جگہ آجاتا۔ یعنی سیاست و حکومت کی بنیاد وحی الٰہی پر ہوتی تھی۔ لیکن میرے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور کوئی نیا نبی اب نہیں آئے گا۔ اس لیے میرے بعد سیاست و حکومت کا نظام خلفاء کے سپرد ہو گا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے بعد خلافت کا یہ نظام قائم ہوا اور مسلمانوں کی ریاست و حکومت کی بنیاد بنا۔ اسلامی خلافت کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں ملک کا نظام چلایا جائے اور امت مسلمہ کے اجتماعی امور سر انجام دیے جائیں۔ جیسا کہ خلفاء راشدین اور ان کے بعد خلفاء کرام کرتے رہے ہیں۔

خلافت کے بارے میں ایک اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ خلافت کیسے قائم ہو گی اور خلیفہ کا تقرر کون کرے گا؟ اس کے لیے میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیا کرتا ہوں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے بعد وہ اسلامی ریاست و حکومت کے سربراہ کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ منصب نہ تو طاقت کے زور پر حاصل کیا تھا اور نہ ہی بادشاہی نظام کی طرح خاندانی استحقاق کی بنیاد پر انہیں حکومت ملی تھی۔ بلکہ امت کی اجتماعی صوابدید اور عمومی مشاورت ان کے منصب خلافت کی اساس تھی۔ اس لیے خلافت کا قیام امت کی اجتماعی صوابدید کی بنیاد پر ہی عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ میں ہمیں نمائندگی کا اصول بھی ملتا ہے کہ ایک موقع پر بنو ہوازن کے قیدی واپس کرنے کے لیے جب ہزاروں افراد سے براہ راست رائے

لینا مشکل نظر آیا تو آپ ﷺ نے عرفاء کو درمیان میں ڈالا کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کی رائے معلوم کر کے بتائیں تا کہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جا سکے۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے عوام کی اجتماعی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعے معلوم کی۔ عرفاء اور نقباء کی یہ اصلاح قدیم سے چلی آ رہی ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے نمائندگی کا یہ طریقہ بھی اسلامی ریاست کی ایک اہم بنیاد بن جاتا ہے۔

لیکن میں اس وقت سب سے زیادہ توجہ اسلامی ریاست کے اس پہلو کی طرف دلانا چاہوں گا کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک فلاحی اور رفاہی ریاست کا نظام دیا ہے جسے آج کی دنیا میں ویلفیئر سوسائٹی کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث کے مطابق ارشاد فرمایا کہ معاشرہ میں جو لوگ بوجھ تلے دبے ہیں یا بے سہارا ہیں، وہ میری ذمہ داری میں ہیں ۔ یعنی ان کی کفالت بیت المال کرے گا۔ چنانچہ جناب نبی اکرم ﷺ کے دور میں اور پھر خلفاء راشدین کے دور میں بیت المال کا یہ نظام کفالت اس قدر مستحکم ہو گیا تھا کہ پورے ملک کے بے روزگاروں، معذوروں اور بے سہارا لوگوں کی کفالت بیت المال کے ذمہ سمجھی جاتی تھی اور یہ ضروریات بطریق احسن پوری کی جاتی تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد جناب رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کے مطابق تین اصولوں پر ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی اطاعت ریاست وحکومت کی سب سے بڑی اساس ہے۔ دوسرا یہ کہ حکومت کا قیام امت مسلمہ کی صوابدید پر عوامی مشاورت کے ذریعہ ہو گا۔ اور تیسرا یہ کہ اسلامی حکومت نظم مملکت کو چلانے کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اجتماعی کفالت اور تمام شہریوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔ اگر ہم ان اصولوں کو سامنے رکھ کر پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی طرف پیش رفت کریں تو قیام پاکستان کے اس مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے جس کے لیے لاکھوں مسلمانوں کی بے پناہ قربانیوں کے بعد وطن عزیز وجود میں آیا تھا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

رسول اکرم ﷺ کا منافقین کے ساتھ طرزِ عمل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور اسے اپنا مرکز بنایا تو یہود اور مشرکین کے مختلف قبائل کے ساتھ ساتھ آپ کو ایک ایسے طبقہ سے بھی واسطہ پڑا جو کلمہ پڑھ کر بظاہر مسلمانوں میں شامل ہو گیا تھا لیکن دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا اور اس کی تمام تر ہمدردیاں اور معاونتیں کفار کے ساتھ تھیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر موجود ہے۔

غزوہ احد میں یہ لوگ تین سو کی تعداد میں عبد اللہ بن ابی کی سرکردگی میں میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے جس سے آبادی میں اس وقت ان کے تناسب کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر مختلف اوقات میں ان کی شرارتیں اور منافقانہ حرکات سامنے آتی ہیں جن میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جھوٹی تہمت بھی شامل ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اس شرپسندانہ الزام کی صفائی قرآن کریم نے پیش کی۔ ایک موقع پر انہوں نے مل بیٹھ کر یہ سازش بھی کی کہ وہ مدینہ منورہ سے مہاجرین کو واپس چلے جانے پر مجبور کر دیں گے۔ اس سازش کی خبر جب آنحضرت ﷺ کو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے دی تو ان لوگوں نے قسمیں اٹھا اٹھا کر حضور ﷺ کے سامنے اپنی سچائی کا اتنی شدت سے اظہار کیا کہ آپ ﷺ نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ دیا۔ اس پر قرآن کریم کی سورۃ المنافقون نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی رپورٹ سچی ہے اور یہ لوگ جھوٹی قسمیں اٹھا رہے ہیں۔ ایک مرحلہ میں ان منافقین نے مدینہ منورہ میں ''مسجد'' کے نام سے اڈہ قائم کر لیا جسے قرآن کریم نے مسجد ضرار سے تعبیر کر کے رسول

اکرم ﷺ کو وہاں جانے سے منع کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسجد کے نام پر قائم ہونے والا یہ مرکز مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے اور دشمنوں کو گھات فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اسے مسمار کرنے کا حکم دے دیا۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی دس سالہ مدنی زندگی کے دوران منافقین کی اس قسم کی شرارتیں اور سازشیں عام ہیں جن کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے اور احادیث میں بھی ان کی بہت سی تفصیلات مذکور ہیں۔ جبکہ قرآن کریم نے وما ھم بمؤمنین اور انھم لکاذبون کہہ کر واضح طور پر کہہ دیا کہ یہ مسلمان نہیں ہے اور ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان سے بچ کر رہنے کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ کو سورۃ التحریم میں یہ کہہ کر ان کے خلاف سخت جہاد کرنے کا حکم بھی دیا گیا جاھد الکفار و المنافقین واغلظ علیھم کہ ان کے ساتھ جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔

لیکن یہ بات توجہ طلب ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے منافقین کے خلاف "جہاد" کا کونسا طریقہ کار اختیار کیا؟ یہ لوگ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے ساتھ رہے، مسجد نبوی میں نمازیں پڑھتے تھے، حضور ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے، اور معاشرتی زندگی میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ پوری طرح شریک کار رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان میں سے کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی اجازت مانگی مگر آپ ﷺ نے اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ بظاہر کلمہ پڑھتے ہیں اس لیے انہیں قتل کرنے سے دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ محمد ﷺ اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنے لگے ہیں۔ ان میں سے کسی کو قتل کرنا تو درکنار حضور ﷺ نے ایک درجن سے زائد ان منافقین کے نام ظاہر کرنے سے انکار کر دیا جنہوں نے ایک سفر سے واپسی پر آپ ﷺ کو شہید کرنے کے لیے ویرانے میں گھات لگائی تھی اور ننگی تلواروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان کا یہ حملہ ناکام ہوا مگر حضور ﷺ

نے ان سب کو پہچان لیا تھا اور اپنے ساتھی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو اس شرط پر سب کے نام بتا بھی دیے تھے کہ وہ کسی اور کو ان میں سے کسی کا نام نہیں بتائیں گے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شدید اصرار کے باوجود انہوں نے زندگی بھر ان میں سے کسی کا نام افشاء نہیں کیا۔

یہ جناب نبی اکرم ﷺ کی حکمت عملی تھی کہ منافقین کی تمام تر شرارتوں اور سازشوں کے باوجود ان کے خلاف "جہاد اور سختی" کے قرآنی حکم کی تکمیل کے لیے آنحضرت ﷺ نے تدبر اور حکمت کا راستہ اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ منورہ میں کوئی معاشرتی خلفشار پیدا نہیں ہوا اور منافقین رفتہ رفتہ بے اثر ہو کر سوسائٹی میں تحلیل ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ خلفاء راشدین کے دور میں ایک طبقہ کے طور پر ان کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا اور وہ نسیا منسیا ہو کر رہ گئے تھے۔

منافقین کے ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ کے اس حکیمانہ طرز عمل سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جہاد صرف لڑنے کا نام نہیں بلکہ حکمت عملی کے ساتھ دشمن کو ناکام بنا دینا بھی جہاد کہلاتا ہے اور کھلے کافروں کے ساتھ جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان کا "کلمہ گو کافروں" کے ساتھ اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ یہ بات نقصان دہ اور اسلام کی دعوت و تبلیغ میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہے۔ اس لیے آج کے حالات میں ہمیں حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے ان معاملات پر اپنے طرز عمل کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

تذکرہ نبوی ﷺ کے چند آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

بزرگان دین کا تذکرہ محبت و برکت کے علاوہ راہنمائی کے لیے بھی ہوتا ہے۔ بلکہ قرآن کریم نے ہمیں احکام و قوانین پر براہ راست عمل کرنے کی بجائے بزرگان دین کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے نقش قدم پر چلنے کو صراطِ مستقیم قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ کہ ان لوگوں کے راستے پر چلو جو میرے سامنے جھک گئے۔ اس لیے بزرگان دین کا تذکرہ ہمارے لیے ایک دینی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے اور ہماری مجالس و محافل میں ان کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ گزشتہ ماہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے حوالہ سے ان کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اس ماہ کے آغاز میں سیدنا حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کی فضیلت و منقبت موضوع گفتگو رہی۔ اور آج کل سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کر کے ان کے ساتھ محبت و عقیدت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

بزرگوں کے دن منانا یا کچھ ایام کو ان کی یاد کے لیے مخصوص کر دینا تو کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا لیکن انہیں یاد کرنا اور ان کی خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ کرتے رہنا رحمتوں اور برکتوں کا ذریعہ بنتا ہے اور اس سے راہنمائی ملتی ہے۔ اس مناسبت سے میں اس کے ایک پہلو پر کچھ عرض کر رہا ہوں کہ بزرگوں کے تذکرہ کے کچھ آداب اور کچھ تقاضے ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اسلام کے مسلمہ عقائد کا لحاظ:

ہم سب سے زیادہ تذکرہ حضرت سرور کائنات ﷺ کا کرتے ہیں اور انہی کا سب سے زیادہ تذکرہ کرنا چاہیے۔ مگر قرآن کریم نے اس کے کچھ آداب بیان کیے ہیں اور خود

حضور ﷺ نے بھی چند آداب کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے صرف دو تین کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ اس وجہ سے کہ آج کل حمد و نعت اور منقبت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے کے مطابق اس سلسلہ میں افراد و تفریط کا رنگ غالب ہو گیا ہے جس کی طرف توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ عید کے روز جناب رسول اللہ ﷺ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں آرام فرما رہے تھے کہ انصار کی کچھ بچیاں اپنے ان بزرگوں کو شعروں کی صورت میں یاد کرتے ہوئے ترنم کے ساتھ اشعار پڑھ رہی تھیں جو گزشتہ جنگوں میں قتل ہو گئے تھے۔ عید خوشی کا دن بھی ہوتا ہے اور بچھڑے ہوئے بزرگوں کو یاد کرنے کا دن بھی ہوتا ہے کہ اس دن بچھڑے ہوئے لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ وہ بچیاں اپنے اس شغل میں مصروف تھیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور یہ منظر دیکھ کر بچیوں کو منع کرنا چاہا مگر آپ ﷺ نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ رہنے دیں بچیاں ہیں اور عید کا دن ہے۔ لیکن جب انہی بچیوں نے اشعار پڑھتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا کہ وفینا نبی یعلم مافی غد کہ ہمارے درمیان ایسا نبی موجود ہے جو آنے والے کل کے حالات بھی جانتا ہے، تو جناب نبی اکرم ﷺ نے خود انہیں روک دیا کہ یہ بات نہ کہو اور باقی جو کچھ کہہ رہی ہو کہتی رہو۔

حضور ﷺ نے بچیوں کو یہ مصرعہ کہنے سے اس لیے روک دیا تھا کہ اس سے عقیدہ توحید پر زد پڑتی تھی۔ اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ بزرگوں کے تذکرہ حتیٰ کہ حضور ﷺ کی مدح میں بھی اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اس سے اسلام کے کسی مسلمہ عقیدہ پر زد نہ پڑتی ہو۔

بزرگوں کا ادب واحترام

دوسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں مذکور ہے کہ قریش کے شاعروں نے جب غزوۂ احزاب میں ناکامی کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ کی مخالفت اور نعوذ باللہ ہجو میں اضافہ کر دیا تو ان کے جواب کے لیے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سامنے آئے اور ایک موقع پر

اپنے جذبات کا اظہار اس طرح فرمایا کہ میں اپنی زبان کے ساتھ ان قریشیوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ حسان! میں بھی قریشی ہوں، تو حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں قریش کی مذمت کرتے ہوئے آپ کو درمیان سے ایسے نکال دوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکال دیا جاتا ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے صرف اتنی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھ کر ان سے میری رشتہ داریوں کی تفصیل معلوم کر لو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کہیں انجانے میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دو جس سے جناب نبی اکرم ﷺ کے لیے سوء ادب کا پہلو نکلتا ہو۔

یہ بات میں نے اس لیے عرض کی ہے کہ ہم مدح و منقبت میں اور کافروں کی مذمت میں بھی اس بات کے پابند ہیں کہ انتہائی احتیاط سے بات کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ کہیں انجانے سے اور بے دھیانی میں بھی کوئی بے احتیاطی نہ ہو جائے۔ جبکہ ہمارے ہاں شعر و شاعری اور خطابت دونوں دائروں میں اس امر کا لحاظ رکھنا کم ہوتا جا رہا ہے اور ہم ہر وہ بات کہہ دیتے ہیں جو کسی طرح ہمارے ذہنوں میں آجاتی ہے۔ ہمیں اس طرف توجہ دینی چاہیے اور حد درجہ احتیاط کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نبیوں کے آپس میں تقابل سے گریز

جبکہ تیسری بات بھی بخاری شریف کے حوالہ سے ہی ذکر کروں گا کہ ایک موقع پر ایک انصاری صحابی نے ایک یہودی کو اس بات پر تھپڑ مار دیا تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق سارے انسانوں پر فضیلت کی بات کہہ دی تھی۔ انصاری صحابی کو غصہ آیا کہ یہ شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت محمد ﷺ پر بھی فضیلت دے رہا ہے اور اس غصے میں انصاری صحابی نے اس یہودی کو تھپڑ مار دیا۔ وہ یہودی جب شکایت لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ اس لیے کہ قیامت کے دن جب سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے تو میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہوں

گے۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آچکے ہوں گے یا بے ہوش ہی نہیں ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ دنیا میں کوہ طور پر ایک بار اللہ تعالیٰ کے نور کی تجلی کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے تھے، اس لیے شاید قیامت کے دن کی بے ہوشی سے مستثنٰی کر دیے گئے ہوں۔ یہی بات حضور ﷺ نے ایک موقع پر حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں بھی فرمائی کہ مجھے ان پر فضیلت نہ دو۔ بلکہ ایک موقع پر فرمایا لا تخیرونی من بین الانبیاء کہ مجھے انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان فضیلت نہ دو۔

اس پر سوال اٹھتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان فضیلت کی بات تو خود قرآن کریم کہتا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کہ ہم نے بعض انبیاء کو بعض دوسرے انبیاء پر فضیلت دی ہے۔ اور سب انبیاء کرام پر اپنی فضیلت اور برتری کا ذکر خود جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جو بیسیوں احادیث میں موجود ہے۔ اور ہم اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ کو علی الاطلاق تمام انبیاء کرام پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر آپ ﷺ نے خود کو انبیاء کرام بالخصوص حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام پر فضیلت دینے سے منع کیوں فرمایا ہے؟ شارح بخاری حضرت علامہ قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ مطلق فضیلت بیان کرنے سے منع نہیں کیا بلکہ ایسی فضیلت بیان کرنے سے روکا ہے کہ جس سے دوسرے بزرگ کی اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی نبیوں کا آپس میں تقابل نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ تقابل کی صورت میں دوسری طرف کچھ نہ کچھ اہانت یا تخفیف کا پہلو ضرور نکل آتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں یہ ذوق عام ہوتا جا رہا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ ہوں یا حضرات صحابہ کرامؓ ہوں، ہم دو بزرگوں یا دو گروہوں کو آمنے سامنے کھڑا کر کے تولنا شروع کر دیتے ہیں اور بسا اوقات وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے بزرگوں کا تذکرہ صحیح طریقہ سے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

رسول اکرم ﷺ کی معاشرتی اصلاحات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب رسالت مآب ﷺ کے ساتھ نسبت اور عقیدت و محبت کا اظہار ہمارے ایمانی تقاضوں میں سے ہے اور ہر مسلمان کسی نہ کسی انداز میں اس کا اظہار ضرور کرتا رہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی بعثت کن مقاصد کے لئے ہوئی تھی؟ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ﷺ نے انسانی معاشرہ کو خیر کے کن کاموں کی تلقین کی تھی، شر کے کن کاموں سے روکا تھا، اور بھرپور محنت کے ساتھ انسانی سوسائٹی کو کن تبدیلیوں اور اصلاحات سے روشناس کروایا تھا جن کی وجہ سے انہیں پیغمبر انقلاب کہا جاتا ہے۔ اور مورخین اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی میں اتنی کم مدت میں اتنے مکمل انقلاب کی اور کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ کل امر الجاہلیۃ موضوع تحت قدمی کہ آج جاہلیت کی ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے جاہلی معاشرہ کی اقدار کو پاؤں کے نیچے روند کر ایک پاکیزہ اور مثالی سوسائٹی کی طرف نسل انسانی کو گامزن کر دیا تھا۔

آیئے اس بات کا ہم تھوڑا سا جائزہ لے لیں کہ وہ کون سی اقدار تھیں جنہیں نبی اکرم ﷺ نے جاہلیت کی قدریں قرار دے کر ختم کیا تھا اور پھر یہ دیکھ لیں کہ کیا وہ جاہلی قدریں پھر سے انسانی سوسائٹی کا حصہ تو نہیں بن گئیں؟ اس کا ایک سرسری سا منظر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے:

☆ کفر و شرک اور بت پرستی کو جزیرۃ العرب میں اپنے دور میں مکمل طور پر ختم کر دیا تھا۔

☆ عریانی اس حد تک عام تھی کہ بہت سے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کا طواف بھی عریاں حالت میں کرتے تھے۔ مگر نبی اکرم ﷺ نے عریانی اور فحاشی کو ختم کر کے نہ صرف بیت اللہ کے عریاں حالت میں طواف پر پابندی لگادی تھی بلکہ عام معاشرتی زندگی میں بھی ستر اور حجاب کے احکام لاگو کر دیے تھے۔

☆ جوا سرِ عام کھیلا جاتا تھا حتیٰ کہ حرم پاک کی حدود میں اور عبادت کی بعض صورتوں میں بھی جوئے کا رواج تھا جسے نبی کریم ﷺ نے ممنوع قرار دے دیا۔

☆ سود کا لین دین عام تھا، تجارت اور قرض دونوں میں سود کا کاروبار چلتا تھا مگر نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سود کا خاتمہ کر کے سودی کاروبار کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے مترادف قرار دے دیا۔

☆ شراب نوشی پر فخر کیا جاتا تھا اور شراب لوگوں کی گھٹی میں شامل سمجھی جاتی تھی مگر نبی اکرم ﷺ نے اس کی مکمل ممانعت فرمادی اور عملی طور پر معاشرے کو شراب سے پاک کر دیا۔

☆ نسل، زبان، علاقہ اور قومیت کا تفاخر اس معاشرہ کا امتیاز تھا۔ اس بنیاد پر ایک دوسرے پر برتری جتائی جاتی تھی اور ایک دوسرے پر غلبہ اور تسلط قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے انہیں جاہلی عصبیت کی علامات قرار دے کر ختم کیا اور اعلان کیا کہ شرافت اور برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہوگی۔

☆ بیٹی کو عار اور بوجھ سمجھا جاتا تھا، اس کا زندہ رہنے کا حق باپ کے رحم و کرم پر ہوتا تھا اور اس دور میں ہزاروں بیٹیاں صرف اس وجہ سے زندہ دفن کر دی گئیں۔ مگر نبی اکرم ﷺ نے بیٹی کو نہ صرف زندہ رہنے کا حق دیا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دے کر عزت و توقیر بخشی۔

ناچ گانا عام تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے ممنوع قرار دیا بلکہ اپنی بعثت کے مقاصد میں یہ فرما کر اس بات کو شامل کیا کہ مجھے ناچ گانے کے آلات توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

☆ حلال و حرام کا کوئی فرق نہیں تھا۔ لوگوں نے اپنے اپنے ضابطے بنا رکھے تھے اور دوسروں کا مال ہضم کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تراش لیے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے کھانے پینے، لین دین اور دیگر معاملات میں حلال و حرام کے مکمل ضابطے دیے اور فرمایا کہ حرام کھانے والے اور حرام طریقہ سے دوسروں کا مال کھانے والے جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

☆ یتیم بچے اور عورت بطور خاص معاشرہ میں مظلومیت کا شکار تھے، ان کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا اور بالادست افراد ان پر کسی قسم کا ظلم روا رکھنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں طبقوں کو معاشرتی ظلم اور ناانصافی سے نجات دلائی اور ان کے حقوق کا تعین کیا۔

یہ ان وسیع تر معاشرتی اصلاحات میں سے چند باتیں ہیں جو جناب رسول اللہ ﷺ نے ۲۳ سالہ محنت کے ساتھ معاشرہ میں لاگو کی تھیں۔ اور یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا بپا کردہ انقلاب انسانی تاریخ کا کامیاب ترین انقلاب تھا۔ مگر بدقسمتی سے ان میں سے بہت سی جاہلی قدریں آج پھر انسانی معاشرے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ معاشرہ کو ان سے نجات دلانے کے لیے جناب رسول اللہ ﷺ کی طرح ہم بھی محنت کریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔

حکمت عملی کا جہاد

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب سرور کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ کے حوالہ سے ایک پہلو پر آج چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا، قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے جناب نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَ الْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ۔ (سورۃ التحریم ۶۶۔آیت ۹) کہ ”اے نبی! کافروں اور منافقین کے ساتھ جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔“ چنانچہ آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے دس سالہ دور میں کافروں کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔ طبقات ابن سعدؒ کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ کے غزوات کی تعداد ستائیس ۲۷ ہے جو دس سال کے اندر ہوئے اور سارے جہاد کفار کے خلاف تھے جبکہ یہ بات غور طلب ہے کہ منافقین کے خلاف کون سا جہاد ہوا؟ اس لیے کہ دس سالہ مدنی دور میں منافقوں کے خلاف ایک بار بھی ہتھیار نہیں اٹھایا گیا، وہ مدینہ منورہ میں رہے اور سارے معاملات میں شریک رہے، شرارتیں بھی کرتے رہے اور بڑے بڑے فتنے انہوں نے کھڑے کئے مگر ایک بار بھی ان کے خلاف تلوار استعمال نہیں ہوئی۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ” حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر کہا حضرت ہم کافروں کے ساتھ لڑنے کے لیے دور دراز کے محاذوں پر جاتے ہیں اور یہ منافق لوگ ہمارے قریب ہیں ہم ان کے ساتھ جہاد کر کے ان کا صفایا نہ کر دیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:” ان کے ساتھ تلوار کا جہاد نہیں کرنا اِنَّ النَّاسَ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَہٗ لوگ کہیں گے کہ بیشک محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جناب نبی اکرم ﷺ سے بعض سرکردہ منافقوں کو قتل کرنے کی اجازت مانگی گئی مگر جناب سرور کائنات ﷺ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

منافقوں نے اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف جو بڑی بڑی حرکتیں اور شرارتیں کیں ان میں سے چند کا ذکر کروں گا۔ غزوۂ احد کے موقع پر حضور ﷺ ایک ہزار کا لشکر لے کر احد کے دامن میں آئے تھے جن میں سے تین سو افراد رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کی سربراہی میں میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے، یہ صریح غداری تھی اور وفاداری سے انحراف تھا۔ بعد میں وہ میدان احد میں مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات پر طعنے بھی دیتے رہے جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ غزوۂ احد سے فارغ ہونے کے بعد مسلمانوں میں سے ایک گروہ نے اس بات کی تحریک کی کہ میدان احد سے واپس آجانے والے ان منافقوں کے خلاف جنگ لڑنی چاہیے اور جب اس پر باہمی اختلاف رائے ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ فرما کر اس جنگ سے روک دیا کہ فَمَالَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ (سورۃ النساء ۴ آیت ۸۸) کہ "تم منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں کیوں بٹ گئے؟" انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حرکات کا قرآن میں تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا، ان کی مذمت بھی کی مگر مسلمانوں کو ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر قذف و تہمت کے حوالہ سے عبد اللہ بن ابی اور دیگر منافقین کا طرز عمل سب کے سامنے ہے، انہوں نے ایک ماہ تک مدینہ منورہ میں فتنہ بپا کیے رکھا۔ خود جناب رسول اللہ ﷺ وحی آنے تک پریشانی کا شکار رہے، مسجد نبوی میں اس مسئلہ پر صحابہ کرامؓ میں جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ قرآن کریم میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کا اعلان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کی مذمت کی مگر ان کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کھلے اجتماع میں عبد اللہ بن ابی کو قتل کر دینے کی بات کی مگر اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

ایک موقع پر عبد اللہ بن ابی اور اس کے چند ساتھیوں نے سفر کے دوران مہاجرین کے خلاف باتیں کیں اور یہاں تک کہہ دیا کہ اب مدینہ منورہ واپس پہنچنے پر لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (سورۃ المنافقون ۶۳۔ آیت ۸) کہ "ہم میں سے جو طاقتور ہو گا وہ دوسروں کو مدینہ منورہ سے نکال دے گا۔" حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ یہ باتیں سن رہے تھے۔ انہوں

نے حضور ﷺ کو بتایا تو طلب کرنے پر منافقین نے آپ ﷺ کے سامنے اتنی قسمیں کھائیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ دیا اور ان کی رپورٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس پر قرآن کریم میں سورۃ المنافقون نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو بتایا کہ منافقوں کی قسمیں جھوٹی ہیں اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔

یہ چند شرارتیں ہیں جو میں نے ذکر کی ہیں جبکہ مدینہ منورہ میں منافقوں نے شرارتوں اور فتنوں کا ماحول مسلسل قائم رکھا۔ حتیٰ کہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر ایک جگہ چودہ پندرہ منافقین گھات لگائے کھڑے تھے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت عمارؓ تھے آنحضرت ﷺ نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ ہیں آپ نے حضرت عمارؓ سے فرمایا کہ دیکھو حضرت عمار نے جب آگے بڑھ کر دیکھا تو حضرت عمارؓ نے ان کو للکارا وہ منافق بھاگ گئے وہ جو جناب رسول اللہ ﷺ کے وہاں سے گزرنے پر ان کو شہید کرنے کے ارادے سے کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنے منہ لپیٹ رکھے تھے۔ وہ اپنے ناپاک منصوبے میں کامیاب نہ ہوسکے مگر حضور ﷺ نے ان سب کو پہچان لیا۔ وہ سب کے سب مدینہ منورہ میں رہنے والے منافقین تھے، ان کے نام آپ ﷺ نے اپنے ساتھی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اس شرط کے ساتھ بتادیے کہ وہ کسی اور کو اس سے آگاہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان ناموں کو مرتے دم تک راز میں رکھا جس کی وجہ سے وہ صاحب سر رسول اللہ یعنی رسول اللہ ﷺ کے رازدار کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

اس قسم کی حرکتوں پر بعض منافقوں بالخصوص عبد اللہ بن ابی کو قتل کرنے کی اجازت مانگی اور اجازت مانگنے والوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں مگر آنحضرت ﷺ نے اجازت دینے سے انکار فرمادیا۔ اور اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ:

"اس طرح لوگ یہ کہیں گے کہ محمد ﷺ نے اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔"

ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن کریم میں منافقوں کے خلاف جہاد کرنے کے صریح حکم کے باوجود عملی صورت حال یہ رہی کہ حضور ﷺ نے نہ ان کے خلاف تلوار اٹھائی اور نہ ہی ان میں سے کسی کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کو شہید کرنے کے لیے گھیر لینے والے چودہ منافقوں کے ناموں کو بھی خفیہ رکھا جن کا حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو پتہ نہیں چل سکا، یہ وہ کلمہ گو کافر ہیں جنہیں خود قرآن کریم نے کافر قرار دیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں تو اس کی بنیاد کسی استدلال واستنباط پر ہوتی ہے جس میں خطا کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے۔ لیکن ان کلمہ گو منافقوں کو قرآن کریم نے وماھم بمئومنین اور انھم لکاذبون کہہ کر کافر قرار دیا مگر انہیں قتل کرنے اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں دی اس لیے کہ وہ کافر ہونے کے باوجود "کلمہ گو" تھے۔

سوال یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ان کلمہ گو کافروں کے خلاف جنگ نہیں لڑی اور ان میں سے کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی تو منافقوں کے خلاف جہاد کرنے اور ان پر سختی کرنے کے اس حکم کا کیا ہوا جو قرآن کریم میں آج بھی موجود ہے؟ کیا یہ سوچا بھی جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے اس قرآنی حکم پر عمل نہیں کیا؟ ایسا نہیں ہے بلکہ رسول اکرم ﷺ نے اس حکم پر پورا عمل کیا، منافقوں کے خلاف جہاد کیا، لیکن وہ جہاد تلوار کا نہیں بلکہ حکمت عملی کا تھا جس کے نتیجے میں حضور ﷺ کے دور میں ہی یہ منافقین ختم ہو گئے تھے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ان منافقوں کا تاریخ میں کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

یہ حکمت عملی کا جہاد کیا تھا اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو وہی ہے جو میں نے ذکر کی ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ دنیا کو یہ تاثر اور پیغام نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں اس لیے کہ اس سے اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچتا ہے اور باقی دنیا کے سامنے مسلمانوں کا تعارف صحیح نہیں رہتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی حکمت عملی یہ تھی کہ منافقین کا یہ گروہ مدینہ منورہ میں اپنا

الگ تشخص قائم نہ کر سکے، اس کا امکان سب سے پہلے غزوۂ احد کے موقع پر پیدا ہوا تھا جب منافقین تین سو کی تعداد میں الگ ہو گئے تھے۔ ایک ہزار میں سے تین سو کا الگ ہو جانا ان کی طرف سے قوت کا اظہار تھا اور اپنے الگ تشخص کی علامت بھی تھی۔ اگر اس موقع پر ان کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے جاتے تو مدینہ منورہ کے اندر ایک مستقل محاذ قائم ہو جاتا اور مسلم سوسائٹی لوگوں کی نظروں میں دو حصوں میں بٹ جاتی۔ آنحضرت ﷺ نے اس صورت حال سے بچنے کے لیے ان کی اتنی بڑی حرکت کو نظر انداز کر دیا اور ان کے خلاف کوئی عملی کاروائی نہیں کی گویا ان کے اس وار کو حکمت عملی سے ناکام بنا دیا۔

دوسرا موقع "مسجد ضرار" کی تعمیر کا تھا۔ یہ بھی منافقین کی طرف سے اپنے الگ تشخص کے اظہار کی کوشش تھی جسے قرآن کریم نے كُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (سورہ التوبہ ۹۔ آیت ۱۰۷) سے تعبیر کیا ہے۔ حضور ﷺ نے کمال حکمت عملی سے یہ مسجد تو ختم کر دی مگر ان منافقین کے خلاف کوئی ایکشن نہ لے کر ان کے الگ تشخص اور گروہ بندی کے امکانات بھی ناکام بنا دیے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد جس طرح تلوار سے ہوتا ہے اسی طرح حکمت عملی سے بھی ہوتا ہے۔ جہاں تلوار کی ضرورت ہے وہاں ہتھیار اٹھانا جہاد ہے اور جہاں حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں حکمت و دانش سے کام لینا اور ہتھیار نہ اٹھانا بھی جہاد ہی کہلاتا ہے۔ آج کے دور میں اور دنیا کے موجودہ حالات میں اس حکمت نبوی کو سمجھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

معاہدہ حدیبیہ کے اہم سبق

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

آج کے حالات کے تناظر میں جناب سرور کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کا ایک اہم پہلو ذکر کیا جا رہا ہے جو یقیناً ہمارے لیے راہ نمائی کا باعث ہے، خدا کرے کہ ہم اس سے صحیح طور پر استفادہ کر سکیں۔ صلح حدیبیہ کے معاہدہ میں جہاں یہ طے ہوا تھا کہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان دس سال تک جنگ نہیں ہوگی، وہاں دوسری شرائط کے ساتھ ایک یہ شرط بھی تھی کہ اگر مکہ مکرمہ سے قریش کا کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرے گا تو جناب نبی اکرم ﷺ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان نبی اکرم ﷺ کا (نعوذ باللہ) ساتھ چھوڑ کر مکہ مکرمہ چلا جائے گا تو اس کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔

اس شرط پر مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب کا پیدا ہونا فطری امر تھا کہ یہ برابری کی شرط نہیں تھی اور معاہدات کی روح کے خلاف تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اس اضطراب کا کھلم کھلا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن حضور ﷺ نے نہ صرف اس شرط کو منظور کر لیا بلکہ اس موقع پر قریش کی طرف سے مذاکرات کرنے والے نمائندہ سہیل بن عمرو کا اپنا بیٹا ابو جندل رضی اللہ عنہ زنجیروں میں جکڑا ہوا مسلمانوں کے ساتھ جانے کے لیے کسی طرح حدیبیہ تک آ پہنچا تو سہیل بن عمرو کے مطالبہ پر آنحضرت ﷺ نے اسے اسی طرح پا بجولاں اس کے والد کے ساتھ مکہ مکرمہ واپس بھجوا دیا۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر مسلمانوں کی اس حوالہ سے بے چینی اور اضطراب میں انہیں تسلی دیتے ہوئے حضرت ابو بکر

صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں، اس لیے اسی میں خیر ہو گی۔

اس معاہدہ کو تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ ایک قریشی نوجوان ابو بصیر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچ گئے جس پر مکہ مکرمہ والوں نے اُن کی واپسی کا مطالبہ کیا اور دو آدمی انہیں واپس لانے کے لئے بھجوائے۔ آنحضرت ﷺ نے معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو ان دو نمائندوں کے ہمراہ واپس بھجوا دیا، راستہ میں ایک جگہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور انہی میں سے ایک کی تلوار لے کر اُسے قتل کر دیا دوسرا بھاگ نکلا ابو بصیرؓ نے مدینہ منورہ واپس آکر حضور ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ نے تو معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے، اب میں ان سے جان چھڑا کر واپس آگیا ہوں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے شدید رد عمل کا اظہار فرمایا اور اس کے بارے میں کہا کہ ویل لامہ مسعر حرب اس کی ماں کے لیے ہلاکت ہو یہ لڑائی کی آگ بھڑکائے گا۔ اتنے میں راستہ میں ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے وار سے بچ جانے والا دوسرا شخص بھی بھاگ کر مدینہ منورہ آگیا اور حضور ﷺ کو سارا ماجرا سنایا۔ جب حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے اپنی کاروائی پر حضور ﷺ کا سخت رد عمل دیکھا تو چپکے سے وہاں سے نکل گئے اور مکہ مکرمہ واپس جانے کی بجائے راستہ میں "سیف البحر" کے مقام پر ڈیرہ لگالیا۔ یہ مکہ مکرمہ سے شام جانے والے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ میں تھا۔ چند دنوں کے بعد حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ بھی کسی طرح جان بچا کر ان کے پاس وہاں آگئے جنہیں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے سہیل بن عمرو کے ساتھ پا بجولاں واپس کر دیا تھا۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ مکہ مکرمہ کے علاقہ سے جو شخص مسلمان ہوتا وہ مدینہ منورہ جانے کی بجائے حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں پہنچ جاتا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد ستر تک پہنچ گئی، جبکہ بعض روایات میں تین سو کی تعداد بھی مذکور ہے۔ انہوں نے قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنا اور ان کا سامان چھیننا شروع کر دیا اور کچھ افراد ان کے

ہاتھوں قتل بھی ہوئے۔ اس پر قریش میں تشویش پیدا ہوئی مگر وہ جناب نبی اکرم ﷺ سے شکایت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے اس لیے کہ حضور ﷺ نے ان میں سے کسی شخص کو قبول نہیں کیا تھا، بلکہ مدینہ منورہ پہنچنے والوں کو واپس کر دیا تھا اور ڈانٹ بھی پلائی تھی۔ یہ کیمپ آزاد علاقہ میں تھا جس کی ذمہ داری آنحضرت ﷺ پر عائد نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی ان لوگوں سے نمٹنا قریش کے بس میں رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ اس ساری صورت حال کی اصل وجہ معاہدہ حدیبیہ کی وہ شرط ہے جو یک طرفہ تھی اور جس کے نتیجے میں یہ حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے قریش نے جناب نبی اکرم ﷺ کے پاس وفد بھجوا کر پیش کش کی کہ اگر یہ کیمپ ختم ہو جائے تو وہ معاہدہ کی اس شق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے قریش کی پیش کش قبول کر کے حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو خط بھجوایا کہ انہیں معاہدہ حدیبیہ کی جس شق کی وجہ سے پریشانی تھی وہ اب ختم ہو گئی ہے اس لیے وہ احتجاجی کیمپ ختم کر کے مدینہ منورہ آجائیں، انہیں قبول کر لیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں جناب رسول اللہ ﷺ نے کیمپ ختم کر کے واپس آنے والوں کے لیے "عام معافی" کا اعلان کر دیا تھا۔

تاریخی روایات میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ گرامی نامہ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو پہنچا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کر کے انہیں سنایا، لیکن ابھی وہ خط پڑھ ہی رہے تھے کہ اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا اور وہ اس کیفیت میں فوت ہوئے کہ نبی اکرم ﷺ کا نامہ مبارک ان کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ ان کے جنازہ اور تدفین کے بعد حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مدینہ منورہ آگئے اور دوسرے سب ساتھی بھی کیمپ ختم کر کے اپنی اپنی محفوظ جگہوں پر چلے گئے۔ جناب نبی اکرم ﷺ نے ان سب کو مسلمان سوسائٹی کے حصہ کے طور پر قبول فرمایا اور کسی کو دوبارہ سرزنش نہیں کی۔ جبکہ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ خلافت راشدہ کے دور میں ایک جہاد کے دوران شہید ہوئے۔

سیرت النبی ﷺ کے اس اہم واقعہ اور اسوۂ نبوی ﷺ کے اس اہم پہلو سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

1. آنحضرت ﷺ نے قریش کے ساتھ معاہدہ کی مکمل پاسداری کی اور اس میں کوئی لچک نہیں دکھائی۔
2. معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں اور ان کے کسی عمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا، ڈانٹ پلائی اور لاتعلقی کا اظہار کیا۔
3. معاہدہ کی ناجائز اور یک طرفہ شق کا فریق مخالف میں احساس پیدا ہونے پر ان کی طرف سے اس شق سے دست برداری کو قبول فرمایا۔
4. خراب ہو جانے والے حالات کو صحیح سمت لے جانے کے لیے ان کے اسباب و عوامل کو بھی سامنے رکھا گیا اور ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔
5. کیمپ ختم کر کے مدینہ منورہ اپنے اپنے محفوظ ٹھکانوں پر چلے جانے والوں کو واپسی کا راستہ دیا گیا اور ان سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔
6. اس قسم کے حالات میں اسوۂ نبوی ﷺ میں ہمارے لیے یہ راہ نمائی موجود ہے لیکن کیا ہمارے پالیسی ساز اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے؟

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

دفاع وطن اور اسوۂ نبوی ﷺ(1)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ
وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ

6 ستمبر کو ملک بھر میں "یوم دفاع پاکستان" منایا جا رہا ہے۔ 1965ء میں اس روز انڈیا کی فوجوں نے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا جس کا مسلح افواج اور پوری قوم نے متحد ہو کر منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اُن دنوں قومی جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ میری عمر اس وقت سترہ سال تھی، میں جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں درس نظامی کا طالب علم تھا اور اس جنگ میں سول ڈیفنس کے رضاکار کے طور پر عملاً شریک ہونے کے ساتھ ساتھ میں نے گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں روزنامہ وفاق لاہور کے نامہ نگار کی حیثیت سے جنگ کے مختلف واقعات کی رپورٹنگ بھی کی تھی۔ محکمہ شہری دفاع میں علماء کا ایک مستقل ونگ ہوتا تھا جس کے چیف وارڈن اس وقت ملک کے معروف خطیب مولانا عبد الرحمٰن جامی تھے جبکہ میں ایک رضاکار کے طور پر اس کا حصہ تھا۔ آج یوم دفاع پاکستان کے حوالہ سے کچھ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیا تو ذہن میں خیال آیا کہ "دفاع وطن" کے بارے میں جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کی کچھ جھلکیاں قارئین کے سامنے پیش کر دی جائیں تاکہ اس سے برکت کے ساتھ ساتھ راہنمائی بھی ملے اور نسبت بھی تازہ ہو جائے۔

نامور مؤرخ و محدث امام ابن سعد کی تحقیق کے مطابق جناب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کی دس سالہ زندگی میں ستائیس کے لگ بھگ غزوات میں خود شرکت فرمائی۔ ان میں اقدامی جنگیں بھی تھیں اور دفاعی جنگیں بھی شامل تھیں۔ مثلاً (۱) بدر (۲) خیبر (۳) بنو مصطلق اور (۴) فتح مکہ کی جنگیں اقدامی تھیں کہ آنحضرت ﷺ ان جنگوں میں دشمن پر خود

حملہ آور ہوئے تھے۔ جبکہ (۱) احد (۲) احزاب اور (۳) تبوک کی جنگیں دفاعی تھیں کہ حملہ آور دشمنوں سے مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے حضور ﷺ میدان جنگ میں آئے تھے اور دشمنوں کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی تھی۔

احد کی جنگ میں قریش کا لشکر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہا تھا جس پر آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ شہر کے اندر محصور ہو کر دفاع کرنا چاہیے یا شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرنا چاہیے؟ خود حضور ﷺ کی رائے شہر میں محصور ہو جانے کی تھی مگر اکثریت کا رجحان کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اکثریتی رائے کو قبول کرتے ہوئے شہر سے باہر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا مگر زیادہ دور نہیں گئے بلکہ اس وقت کے مدینہ منورہ کی آبادی سے تین میل کے فاصلے پر احد کے میدان میں دشمن سے نبرد آزما ہوئے۔ اس میں ایک سبق یہ بھی ہے کہ ملکی دفاع میں رائے عامہ کو اعتماد میں لینا اور قوم کو مشاورت میں شریک کرنا بھی سنت نبوی ﷺ ہے۔

غزوۂ احزاب میں جناب نبی اکرم ﷺ نے شہر میں محصور ہو کر قریش اور ان کے اتحادیوں کی مشترکہ فوجوں کا راستہ روکا۔ شہر میں ان کے داخلہ کو روکنے کے لیے آبادی کے ارد گرد گہری خندقیں کھدوائیں جس کی وجہ سے دشمن افواج کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود مدینہ میں داخل نہ ہو سکیں اور کم و بیش ایک ماہ کا ناکام محاصرہ کرنے کے بعد نامراد واپس لوٹ گئیں۔

تبوک کا غزوہ بھی رومی افواج کی مدینہ منورہ کی طرف یلغار کی مسلسل خبروں کے باعث منظم کیا گیا تھا۔ حضور ﷺ مسلمانوں کے بھاری لشکر کے ساتھ روم کے زیر نگیں صوبہ شام کی طرف بڑھے مگر شام کی سرحد پر تبوک سے آگے بڑھنے کی بجائے وہیں رک کر رومی فوجوں کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب واضح ہو گیا کہ رومی فوجیں پیش قدمی کا حوصلہ نہیں کر رہیں تو تقریباً ایک ماہ تک وہاں انتظار کرنے کے بعد آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف واپسی کا سفر کیا۔

مدینہ منورہ جناب نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ایک باقاعدہ ریاست کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اس کے حاکم اعلیٰ خود جناب رسول اللہ ﷺ تھے۔ اس ریاست کو ہر وقت کسی نہ کسی دشمن کے حملہ کا خطرہ درپیش رہتا تھا اور اس کے مقابلہ کے لیے حضور ﷺ خود بھی تیار رہتے تھے اور ساتھیوں کو بھی چوکنا رہنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ جناب نبی اکرام ﷺ کی دفاعی حکمت عملی کی ایک جھلک یہ ہے کہ انصار مدینہ کا قبیلہ "بنو سلمہ" مسجد نبوی کے راستے میں ایک فاصلے پر آباد تھا۔ ایک موقع پر انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے مکانات فروخت کر کے مسجد نبوی کے قریب جگہ خرید کر مکان بنالیں تاکہ مسجد کے قریب ہو جائیں اور آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہو سکیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بنو سلمہ اگر مکانات بیچ کر مسجد نبوی کے قریب منتقل ہو جاتے تو وہ راستہ اور علاقہ مسلمانوں کے وجود سے خالی ہو جاتا جو کہ دفاعی نقطہ نظر سے مناسب نہیں تھا، اس لیے حضور ﷺ نے دفاعی حکمت عملی کے تحت بنو سلمہ کو وہ علاقہ خالی کرنے سے منع فرمایا۔

دفاعی سرگرمیوں میں صحابہ کرامؓ کو ہوشیار رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ خود بھی عملی طور پر ان میں پیش پیش رہتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ایک مرحلہ میں مدینہ منورہ پر بیرونی حملہ آوروں کی دراندازی کا خطرہ بڑھ گیا تھا اور لوگوں کو خدشہ رہتا تھا کہ دشمن کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس دوران ایک رات نصف شب کے لگ بھگ ایک طرف سے شور کی آواز آئی تو بہت سے لوگ بیدار ہو کر صورتحال معلوم کرنے کے لیے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ مگر یہ لوگ ابھی مدینہ کی آبادی سے باہر نکل رہے تھے کہ سامنے سے آنحضرت ﷺ واپس آتے دکھائی دیے جو گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار مدینہ میں یہ اعلان کرتے ہوئے داخل ہو رہے تھے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چاروں طرف گھوم پھر کر آیا ہوں اس وقت خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دشمن کے حملہ کے ہر وقت خطرہ کے ماحول میں آدھی رات کو اکیلے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر آبادی کے

چاروں طرف چکر لگانا اور واپس آکر ساتھیوں کو تسلی دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حوصلہ تھا جو دفاع وطن کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات اور طرز عمل کی صرف ایک جھلک ہے۔

آج وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان کو دفاعی حوالہ سے جن خطرات کا سامنا ہے ان کے سدباب کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ سے مسلسل راہنمائی کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

دفاع وطن اور اسوۂ نبوی ﷺ (2)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

مولانا مفتی شاہد مسعود صاحب نے آج کی تقریب کے ایک پہلو پر بہت اچھی گفتگو کی ہے کہ ایک دینی مدرسہ کا آغاز ہو رہا ہے جس میں قرآن و سنت و دیگر دینی علوم کی تعلیم سے علاقہ کے عوام کو بہت فوائد حاصل ہوں گے۔ جبکہ میں دوسرے پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ مدرسہ ایک شہید کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے جس نے 1965ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر وطن عزیز کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا اور اس کے خاندان نے اپنے شہید سپوت کی یاد کو تازہ رکھنے کا بہت خوبصورت اہتمام کیا ہے۔ آج کل پاک بھارت سرحد پر کشیدگی کا ماحول پھر سے دکھائی دے رہا ہے اس لیے میں اس موقع پر وطن کے دفاع کے حوالہ سے جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ کی چند جھلکیاں آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جناب رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور ایک ریاست کا ماحول بنا تو آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مدینہ منورہ اور ارد گرد کے سب قبائل کو جمع کر کے مشترکہ حکومتی نظام کے ساتھ ساتھ مشترکہ دفاع کے معاہدہ کا اہتمام فرمایا۔ "میثاق مدینہ" میں سب نے مل کر طے کیا کہ مدینہ منورہ پر حملہ کی صورت میں اس کے دفاع کی ذمہ داری سب پر ہوگی اور مسلمان و کافر مل کر اس وطن کا تحفظ کریں گے۔ اس طرح آپ ﷺ نے دنیا کو یہ اصول دیا کہ وطن کا دفاع سب اہل وطن کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کے بعد دس سال کے دوران جناب نبی اکرم ﷺ نے دو درجن سے زائد جنگیں لڑیں جن میں صرف دو ایسی تھیں جن میں مدینہ پر حملہ کیا گیا تھا اور وہ مدینہ منورہ کے

ماحول میں لڑی گئی تھیں۔ ایک احد کی جنگ اور دوسری احزاب کی جنگ تھی جن میں مدینہ منورہ دشمن کی یلغار کا نشانہ بنا تھا اور ان جنگوں میں دشمن کے ساتھ یہودیوں کی ساز باز کو "میثاق مدینہ" کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے اس کا ایکشن لیا گیا تھا۔

احد کی جنگ کے حوالہ سے دو باتوں کا بطور خاص ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی بات کہ نبی اکرم ﷺ نے جنگ کے میدان میں جانے سے قبل مسلم سوسائٹی کو اعتماد میں لیا تھا اور سب کے مشورہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے باہر جا کر جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن مدینہ سے زیادہ دور نہیں گئے تھے بلکہ آبادی سے باہر اس کے ساتھ ہی احد پہاڑ کے دامن کو میدان جنگ بنایا تھا جو کہ مشورہ میں پیش کی جانے والی دو مختلف تجویزوں کو جمع کرنے کی ایک صورت تھی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک ہزار کا لشکر لے کر احد کے میدان میں گئے تھے جن میں سے تین سو افراد ساتھ چھوڑ کر واپس آ گئے تھے جو عین حالت جنگ میں سنگین جرم اور غداری کے مترادف تھا۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ تجویز سامنے آئی کہ ان سے بھی جنگ کی جائے مگر حضور ﷺ نے اس موقع پر داخلی محاذ کھولنے سے گریز کیا اور کسی قسم کا کوئی ایکشن نہ لے کر مدینہ منورہ کے اندرونی ماحول کو خلفشار سے بچا لیا۔ جبکہ قرآن کریم نے بھی فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ والی آیات میں حضور ﷺ کی اس حکمت عملی کی حمایت کر دی۔ یہ جناب رسول اللہ ﷺ کی حکمت و تدبر کا شاہکار تھا کہ بیرونی جنگ کے ساتھ ساتھ اندرونی جنگ کا ماحول قائم نہ ہونے دیا اور داخلی وحدت کی ہر ممکن حفاظت فرمائی۔

مدینہ منورہ پر دوسرا حملہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا تھا جس کے جواب میں حضور ﷺ نے جنگ کے روایتی طریقوں سے ہٹ کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا جو فارسیوں کا طریقہ تھا کہ شہر کے دفاع کے لیے اردگرد خندق کھودی جائے۔ اس سے آنحضرت ﷺ کی یہ سنت اور ذوق سامنے آیا کہ جنگ کے لیے جو طریقہ بھی وقت کی ضرورت ہو اسے اختیار کیا جائے اور دنیا کے تجربات سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

اس کے ساتھ ایک بات شہید اعجاز حسین کے حوالہ سے کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چونڈہ کی جنگ میں جام شہادت نوش کیا تھا جب انڈیا نے سینکڑوں ٹینکوں کے

ذریعہ خوفناک یلغار کی تھی۔ ظاہری طور پر ٹینکوں کی اتنی بڑی یلغار کا راستہ روکنا ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر پاک فوج کے بہادر جوان اپنے سینوں پر بم باندھ کر ان ٹینکوں کے نیچے گھس گئے اور اپنی قیمتی جانوں کی قربانیاں دے کر اس یلغار کو ناکام بنا دیا۔ اس موقع پر یہ سوال اٹھا تھا کہ کیا یہ خودکشی نہیں ہے؟ اس کا جواب علماء کی طرف سے دیا گیا تھا کہ اس قسم کے خودکش حملے بسا اوقات جنگ کی ناگزیر ضرورت بن جاتے ہیں اس لیے یہ بھی جنگ کا ہتھیار ہیں جو میدان جنگ میں ہوں تو جائز اور ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ میدان جنگ سے ہٹ کر کسی اور مقصد کے لیے اور پر امن ماحول میں اس قسم کی کاروائیاں بلاشبہ حرام ہیں اور ان کا کوئی جواز نہیں ہے۔

آج وطن عزیز کو پھر جنگ کی صورتحال کا سامنا ہے اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا کے ساتھ ساتھ اس کے لیے ہر وقت تیار بھی رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ وطن عزیز کی حفاظت فرمائیں اور پوری قوم کو وحدت اور عزم کے ساتھ اس صورتحات کا سامنا کرنے کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

کفار کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا معاشرتی رویہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی معاشرتی زندگی کے اس پہلو پر آج کی محفل میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ﷺ نے کافروں کے ساتھ معاشرتی زندگی میں کیا معاملہ کیا ہے اور ان کے ساتھ زندگی کیسے گزاری ہے؟ اس حوالہ سے جناب سرور کائنات ﷺ کی حیات مبارکہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ اس چالیس سالہ دور کا ہے جو نبوت سے پہلے مکہ مکرمہ میں گزرا، نبی اکرم ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اس لیے کفر و شرک، بت پرستی اور جاہلانہ رسوم سے آپ ﷺ کی نفرت طبعی تھی۔ حضور ﷺ ان امور میں معاشرے کے ساتھ شریک نہیں تھے اور ایسی تمام باتوں سے الگ تھلگ رہتے تھے لیکن عمومی معاشرت میں باقی لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ بھی اسی معاشرے کا حصہ تھے۔ سوسائٹی کے معاملات میں شریک ہوتے تھے، رشتہ داریاں قائم تھیں اور لین دین کے معاملات بھی جاری رہتے تھے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کی معاشرتی زندگی کا دوسرا حصہ نبوت ملنے کے بعد کا ہے۔ جب نبوت ملی اور آنحضرت ﷺ نے توحید کی دعوت کا آغاز کیا تو صورت حال مختلف ہو گئی۔ اس سے قبل اخلاق حسنہ اور خدمت خلق کے باعث آپ ﷺ کو سوسائٹی کی پسندیدہ ترین شخصیت کی حیثیت حاصل تھی، صادق و امین کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور مختلف امور میں آپ ﷺ سے راہنمائی لی جاتی تھی۔ لیکن توحید کے اعلان اور عام محفلوں میں قرآن کریم کی تلاوت کو ناپسند کیا گیا اور مخالفت کا دور شروع ہو گیا جو تیرہ سال جاری رہا۔ یہ تیرہ سالہ دور مخالفت کا دور تھا، آزمائش و ابتلاء کا دور تھا اور اذیت و تکلیف کا دور تھا۔ اس دور میں جہاں نبی

اکرم ﷺ نے دین کی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اپنی جماعت کی توسیع کی محنت کرتے رہے، ساتھ دینے والے حضرات کی تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور صبر و حوصلہ کے ساتھ اپنے مشن کو مسلسل آگے بڑھاتے رہے وہاں مکہ مکرمہ کی عمومی معاشرت کا حصہ رہے اور معاشرتی معاملات میں برابر شریک ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر قریش کے مختلف خاندانوں نے اجتماعی فیصلہ کر کے آنحضرت ﷺ اور ان کے ساتھیوں کا معاشرتی بائیکاٹ کر دیا جو تین سال جاری رہا، اس دوران شعب ابی طالب میں انہیں محصور کر دیا گیا اور بائیکاٹ کی نگرانی کے لیے ناکہ بندی کا اہتمام بھی کیا گیا لیکن یہ بائیکاٹ یکطرفہ تھا۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے اس دور میں بھی دعوت و تبلیغ کے تقاضوں کی تکمیل کی اور بائیکاٹ کی پروانہ کرتے ہوئے تعلقات اور دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دور میں کافروں کا غلبہ تھا اور مسلمان اقلیت میں تھے بلکہ وہ اکثریت کے مظالم اور اذیتوں کا نشانہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے مزاحمت کا راستہ اختیار نہیں کیا، نہ اجتماعی مزاحمت کی اور نہ ہی انفرادی طور پر کسی ساتھی کو اس کی اجازت دی بلکہ حوصلہ اور صبر کے ساتھ مظالم برداشت کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ قائم رکھا۔ البتہ اس دوران مکہ مکرمہ کی آبادی سے ہٹ کر مختلف اطراف سے دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ کافر قبائل میں اپنی حمایت و حفاظت کے مواقع بھی تلاش کرتے رہے۔ طائف کا سفر جناب رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے کیا تھا کہ بنو ثقیف کے سرداروں کو قریش کے مظالم کے خلاف اپنی حمایت کے لیے آمادہ کر سکیں۔ حبشہ کی طرف صحابہ کرامؓ کی ہجرت کا بھی ایک اہم مقصد مسلمانوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ مہیا کرنا تھا جو حاصل ہو گئی۔ جبکہ حج کے لیے یثرب سے آنے والے قافلوں کے خیموں میں حضور ﷺ کا بار بار جانا اور انہیں دعوت دینا بھی اسی لیے تھا کہ وہ مسلمان ہو کر مکہ مکرمہ کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھی بنیں اور انہیں محفوظ ٹھکانہ مہیا کریں جیسا کہ عملاً ہو بھی گیا۔ یثرب سے آنے والے لوگوں کے ساتھ بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی ہجرت کی راہ ہموار ہوئی اور اس ہجرت پر مکہ مکرمہ کے تیرہ سالہ مظلومانہ دور کا اختتام ہوا۔

اس کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ کی معاشرتی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا جو دس سال جاری رہا اور یہ سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور تھا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے یثرب اور اردگرد کے قبائل ایک علاقائی حکومت کے قیام پر متفق ہو چکے تھے اور بادشاہ کے طور پر عبد اللہ بن ابی کے نام کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا، صرف تاج پوشی کی رسم باقی تھی کہ حضور ﷺ کی تشریف آوری سے ساری صورت حال بدل گئی، وہ حکومت جو عبد اللہ بن ابی کی سربراہی میں قائم ہونا تھی وہ آپ ﷺ کی قیادت میں تشکیل پا گئی۔ میری طالب علمانہ رائے میں اس ریاست و حکومت کے خدوخال طے کرنے کے لیے قبائل کے درمیان جو مذاکرات ہو چکے تھے وہی میثاق مدینہ کا ہوم ورک اور اساس بنے جس میں حضور ﷺ نے بنیادی تبدیلی یہ کی کہ اسے ایک نظریاتی ریاست کی شکل دے دی جو آگے چل کر خلافت راشدہ اور عالمی اسلامی خلافت کی صورت میں دنیا میں پھیلتی چلی گئی۔ ابتداء میں اس حکومت و ریاست میں مسلمان بھی شامل تھے، یہودی قبائل بھی اس کا حصہ تھے اور اردگرد کے دیگر قبائل بھی اس میں شریک تھے جبکہ اس نظم میں آنحضرت ﷺ کو حاکم اعلیٰ جبکہ "میثاق مدینہ" کو دستور کی حیثیت حاصل تھی، بعد میں یہودی قبائل اسی "میثاق مدینہ" کی خلاف ورزی کے باعث یکے بعد دیگرے مدینہ منورہ سے جلاوطن ہوتے گئے اور بنو قریظہ کی جلاوطنی کے بعد مدینہ منورہ مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہودیوں کو مدینہ منورہ سے نکالنے میں مسلمانوں نے پہل نہیں کی تھی بلکہ خود یہودیوں نے ان کی جلاوطنی کے فیصلے اس وقت کے عام عرف کے مطابق جرگوں اور ثالثوں کے ذریعہ کیے اور یہودیوں نے ان فیصلوں کو تسلیم کیا۔

مدینہ منورہ میں جناب نبی اکرم ﷺ کو ایک اور طبقہ سے بھی سابقہ درپیش رہا جس کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر وما ھم بمؤمنین وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ منافقین تھے جن کی قیادت عبد اللہ بن ابی کر رہا تھا، میری طالب علمانہ رائے میں عبد اللہ بن ابی کو حکومت کا چانس ختم ہو جانے پر غصہ تھا وہ باقی ساری زندگی اس کا

بدلہ ہی لیتا رہا، اس نے مدینہ منورہ میں بڑے بڑے فتنے کھڑے کیے اور کہیں بھی مسلمانوں کو پریشان کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ احد کی جنگ میں وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان سے نکل گیا، اس وقت جنگ کے لیے احد تک جانے والے لشکر کی تعداد ایک ہزار تھی جن میں سے تین سو افراد عبد اللہ بن ابی کی قیادت میں میدان چھوڑ کر واپس آگئے تھے۔ اس سے ان کا تناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کم وبیش تیس فی صد تھے۔ غزوۂ احد کے بعد مسلمانوں میں ان منافقین کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے، بعض کی رائے تھی کہ ان کے خلاف کاروائی کی جائے جبکہ دوسرے حضرات کا خیال تھا کہ انہیں اسی طرح ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کا ذکر قرآن کریم نے فمالکم فی المنافقین فئتین الخ کی آیت کریمہ میں کیا ہے۔ ان منافقین نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جھوٹی تہمت کا بازار گرم کیا، انہوں نے مدینہ منورہ سے مہاجرین کو نکال دینے کی سازش بھی کی جس کا تذکرہ قرآن کریم کی سورۃ المنافقون میں ہے لیکن اس سب کے باوجود حضور ﷺ نے ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی بلکہ وہ معاشرتی زندگی حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی مسلمانوں کے ساتھ مسلسل شریک رہے۔ ان کے خلاف نہ کوئی احتجاجی کاروائی ہوئی اور نہ ہی انفرادی طور پر ان میں سے کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی کسی کو اجازت ملی۔ عبد اللہ بن ابی کو قتل کرنے کی اجازت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بھی مانگی تھی مگر آپ ﷺ نے کسی کو اجازت نہیں دی اور یہ فرمایا کہ اس سے دنیا کے دوسرے لوگوں کو یہ تاثر ملے گا کہ حضرت محمد ﷺ تو اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

یہ جناب نبی اکرم ﷺ کی کمال حکمت عملی تھی کہ ان منافقین کی الگ گروہی شناخت قائم نہ ہونے دی جائے اور انہیں مدینہ منورہ کے اندر کوئی داخلی محاذ بنانے کا موقع نہ دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن چودہ منافقین نے نبی اکرم ﷺ کو راستے میں گھیر کر قتل کرنے کی ناکام کاروائی کی تھی، آپ ﷺ نے ان کے نام تک حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو

نہیں بتائے اور انہیں بھی سختی کے ساتھ تاکید کی کہ ان میں سے کسی کا نام ظاہر نہ ہونے پائے۔ اور یہ بھی اسی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ انہیں مسجد کے نام پر الگ مرکز بنانے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ ان کی بنائی ہوئی مسجد کو "مسجد ضرار" قرار دے کر منہدم کرا دیا گیا۔

ان منافقین کے بارے میں جنہیں قرآن کریم نے وماھم بمؤمنین کہہ کر کافر قرار دینے کا اعلان کر دیا تھا، آنحضرت ﷺ کی حکمت عملی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں معاشرتی طور پر الگ کر کے اپنا تشخص قائم کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور داخلی طور پر اپنے لیے کوئی محاذ کھڑا نہ ہونے دیا جائے۔ اس کامیاب حکمت عملی کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ وہ لوگ جو غزوۂ احد کے وقت کم و بیش تیس فیصد دکھائی دے رہے تھے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ والے واقعہ تک (تبوک سے واپسی) ان کی تعداد درجن بھر رہ گئی تھی اور اس کے بعد تاریخ میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ وہ کدھر گئے؟ ظاہر بات ہے کہ سارے مر کھپ تو نہیں گئے تھے بلکہ آہستہ آہستہ توبہ تائب ہو کر مسلمانوں کے عمومی معاشرے میں تحلیل ہو کر رہ گئے تھے جو جناب رسول اللہ ﷺ کی کمال حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔

اس دس سالہ مدنی دور میں کفار کے ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ کی معاشرتی حکمت عملی کا جائزہ لیا جائے تو اس میں جہاں کافر قوموں کے ساتھ دو درجن سے زیادہ جنگیں موجود ہیں وہاں معاہدات بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ مل جل کر رہنے کی روایت بھی میثاق مدینہ کی صورت میں واضح دکھائی دیتی ہے، اور داخلی دشمنوں کو صف آرائی کا موقع نہ دیتے ہوئے آہستہ آہستہ انہیں بے اثر کر دینے کی کامیاب حکمت عملی کے ثمرات بھی نظر آتے ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

سفر معراج کے دو پہلو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

اسراء و معراج کا واقعہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا اہم واقعہ ہے اور بڑے معجزات میں سے ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے ایک حصے میں جسم اطہر کے ساتھ بیداری کی حالت میں یہ مقدس سفر کرایا جس کا ایک حصہ اسراء کہلاتا ہے جو مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک تھا۔ جبکہ دوسرا حصہ معراج کہلاتا ہے جو زمین سے عرش بلکہ اس سے بھی آگے کی منازل تک تھا اور اس کا مقصد قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا ہے لِنُرِیَہٗ مِنْ آیَاتِنَا کہ ہم اپنے پیغمبر کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی نشانیاں دیکھیں اور ان میں سے بہت سی بیان بھی فرمائیں جو سینکڑوں احادیث میں محفوظ ہیں اور جن کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔

اسراء و معراج کی حکمتوں اور اس کے اسباق پر مفسرین و متکلمین نے بے شمار باتیں لکھی اور کہی ہیں۔ میں ان میں سے دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ایک حکمت کے حوالہ سے اور دوسری سبق اور پیغام کے حوالہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَا اٰتَیْتُکُمْ مِنْ کِتَابٍ وَّ حِکْمَۃٍ ثُمَّ جَاءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْہَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰہِدِیْنَ

اس آیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام سے لیے گئے ایک میثاق کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرامؑ سے وعدہ لیا کہ میں تم سب کے بعد ایک رسول بھیجوں گا جو تمہاری

تعلیمات کی تصدیق کرے گا، تم سب اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ سب پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ سے اس بات پر پکا عہد کیا اور اس کی گواہی دی۔

یہاں ایک اشکال سامنے آیا کہ تمام پیغمبروں نے نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری پر ان پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا جبکہ سارے کے سارے پیغمبر آپ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اپنا اپنا زمانہ نبوت پورا کر کے واپس جا چکے تھے تو یہ ایمان اور نصرت کا وعدہ کیسے اور کب پورا ہوا؟ اس پر مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ ایمان والا وعدہ تو معراج کی رات پورا کرایا گیا کہ تمام انبیاء کرامؑ کو بیت المقدس میں جمع کر کے آنحضرت ﷺ کی امامت میں نماز کے لیے کھڑا کر دیا جس سے ایمان لانے کا وعدہ پورا ہو گیا جبکہ نصرت کے وعدہ کی تکمیل کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کے نمائندہ کے طور پر سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ وہ قیامت سے پہلے دوبارہ تشریف لائیں گے اور امام مہدی علیہ السلام کے ساتھ مل کر اسلامی خلافت کو پوری دنیا میں بحال کرائیں گے۔ یہ ان کی مدد ہو گئی جو تمام انبیاء کرامؑ کی طرف سے ہو گی اور اس طرح وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا اس کی تفصیل حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کی کتاب "مشکلات القرآن" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سفر معراج کی ایک اہم بات نماز کا فرض ہونا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس سفر میں ایک اور بات کی تلقین بھی ہوئی ہے جسے معراج کے سبق اور پیغام کے حوالہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امام ترمذیؒ نے ایک روایت میں ذکر کیا ہے کہ معراج کے سفر میں جناب نبی اکرم ﷺ کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جنت میں بھی ہوئی۔ اس ملاقات کے اختتام پر نبی اکرم ﷺ کو رخصت کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ "اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہہ دیں اور یہ پیغام دے دیں کہ "ان الجنۃ ارضھا طیبۃ وماءھا عذب" کہ جنت کی زمین عمدہ ہے اور پانی میٹھا ہے"

یعنی یہ رہائش کے لیے اچھی ہے اس لیے کہ جس جگہ بستی آباد کرنی ہو یا کالونی بسانی ہو سب سے پہلے یہی دیکھتے ہیں کہ زمین کیسی ہے اور پانی کیسا ہے۔ ہمارے سائنس دان آج کل کائنات کے سیاروں میں یہی چیزیں تلاش کر رہے ہیں کہ رہنے کے قابل کونسا سیارہ ہے۔ ایک عرصہ چاند کی خاک چھاننے کے بعد اب ہم نے مریخ کا رخ کر رکھا ہے اور وہاں آبادی کے امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں اور مٹی و پانی وغیرہ چیک کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہمیں چودہ سو برس قبل یہ بات بتادی تھی کہ رہنے کی بہترین جگہ جنت ہے، اس کی تیاری کرو۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ بتا کر کے جنت کی زمین عمدہ اور پانی میٹھا ہے ایک اور بات بھی سمجھادی جس کو میں وارننگ سے تعبیر کیا کرتا ہوں کہ ولکنھا القیعان وہ چٹیل اور صاف میدان ہے جسے خود آباد کرنا ہوگا جسے آباد کرنے کے لیے دنیا میں محنت کرنا ہوگی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ قبر میں سوال وجواب کے بعد جس نے جنت میں جانا ہو اس کے لیے پہلے دوزخ کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر تم ایمان اور عمل صالح کی زندگی نہ گزارتے تو تمہارا ٹھکانہ یہ ہوتا۔ اس کے بعد یہ کھڑکی بند کر کے اس کے لیے جنت کی کھڑکی کھولی جاتی ہے جبکہ دوسری طرف (جہنم) والے کے لیے پہلے جنت کی کھڑکی کھولی جاتی ہے کہ اگر تم دنیا کی زندگی ایمان کے ساتھ گزارتے تو تمہارے لیے یہ جگہ تھی لیکن اب یہ کھڑکی بند کی جارہی ہے۔ اور دوزخ کی کھڑکی کھولی جارہی ہے اس حدیث کی بنیاد پر میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ہر انسان کے لیے جنت اور دوزخ دونوں جگہ پلاٹ مخصوص کر دیے جاتے ہیں پھر اسے دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے کہ تمہاری مرضی ہے کون سا پلاٹ آباد کرتے ہو اور کونسا کینسل کرادیتے ہو۔

سیدنا حضرت ابراہیمؑ نے یہ فرما کر کہ جنت کا پلاٹ خالی ہے اس کی آبادی کا طریقہ بھی بتادیا کہ غرسھا سبحان اللہ والحمد للہ وغیر ذالک اس میں شجرکاری دنیا میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے ہوگی۔ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ تعالیٰ کے دیگر اذکار کروگے تو اس سے جنت میں درخت لگیں گے اور آبادکاری ہوگی۔

ایک اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ تم دنیا میں سبحان اللہ کہتے ہو تو جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے اور یہی بات حضرت ابراہیمؑ نے فرمائی ہے کہ جنت میں تمہاری جگہ تو مخصوص ہے لیکن اس کی آبادکاری اور اسے پکا کرنے کے لیے تمہیں دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑ کر رکھنا ہوگا اور اپنے مالک کا بار بار ذکر کرنا ہوگا۔

چنانچہ معراج کا ہمارے لیے سبق جہاں نماز ہے وہاں ذکر الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

معراج النبی ﷺ: ایک سبق، ایک پیغام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

معراج واسراء جناب نبی اکرم ﷺ کے معجزات میں سے ہیں۔ اسراء اس سفر کو کہتے ہیں جو نبی اکرم ﷺ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کیا، اور معراج وہ سفر ہے جو زمین سے ساتوں آسمانوں اور اس سے آگے سدرۃ المنتہیٰ تک ہوا، اور اس میں رسالت مآب ﷺ نے سات آسمانوں، عرش و کرسی اور جنت و دوزخ کے بہت سے مناظر دیکھے جن کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی ہے اور سینکڑوں احادیث میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں۔ عام طور پر روایات میں آتا ہے کہ یہ دونوں سفر ایک ہی رات میں ہوئے اور نبوت کے گیارہویں سال ۲۷ ویں رجب کو اس عظیم الشان معجزے کا ظہور ہوا، اور اسی کو جناب نبی اکرم ﷺ کے عظیم الشان معجزات میں شمار کیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ دونوں سفر بیداری کی حالت میں جسم مبارک کے ساتھ ایک ہی رات میں ہوئے۔ چونکہ یہ سب کچھ عام حالات واسباب میں ممکن نہیں ہے اس لیے یہ سفر معجزہ کہلاتا ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار معجزات عطا فرمائے ہیں اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے بھی سینکڑوں معجزات کا ظہور ہوا ہے۔ معجزات کے بارے میں اہل سنت والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ کسی معجزاتی واقعہ کے ثبوت کے لیے روایت میں تو بحث واختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ رونما ہوا ہے یا نہیں، اس کی سند درست ہے یا نہیں لیکن اگر کوئی واقعہ صحیح روایت اور سند کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس کے بعد اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو عقل اور مشاہدہ کے خلاف ہے، وغیرہ۔ اس لیے کہ معجزہ اگرچہ پیغمبر کے

ہاتھ پر اس کی صداقت کے اظہار کے لیے ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار اور فعل سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی وقت اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اس لیے ہمارا ایمان اور عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جناب نبی اکرم ﷺ کو معراج کی شب مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور زمین سے سات آسمانوں، عرش و کرسی اور جنت و دوزخ کی سیر کرائی اور یہ سارا سفر حالت بیداری میں جسم مبارک کے ساتھ ہوا، اس کی تفصیلات خود آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائیں جو سینکڑوں احادیث مبارکہ میں مذکور و محفوظ ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ متعدد مواقع پر خواب میں بھی آپ ﷺ کو جنت و دوزخ اور کائنات کے مختلف مناظر دکھائے گئے جن کا تذکرہ احادیث میں خواب کے حوالہ سے موجود ہے اور یہیں سے کچھ حضرات کو مغالطہ ہوا ہے کہ معراج بھی شاید خواب کا واقعہ ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے خواب کے واقعات بھی ہوئے اور معراج و اسراء کا معروف واقعہ بیداری کے ساتھ جسمانی طور پر ہوا۔ اور اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے ورنہ خواب کی بات ہو تو اسے معجزہ کا عنوان دینے کی ضرورت نظر نہیں آتی اس لیے کہ خواب میں تو ہم بھی خدا جانے کہاں کہاں کی سیر کرتے رہتے ہیں اور اس میں کوئی معجزاتی بات نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے خواب میں اور حضرات انبیاء کرامؑ کے خواب میں فرق ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارا خواب ضروری نہیں کہ سچا اور درست ہو شیطانی خیالات بھی ہوسکتے ہیں۔ نفسیاتی خیالات بھی ہوسکتے ہیں اور فرشتوں کی طرف سے بھی ہوسکتے ہیں۔ اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر کے سوا کسی کا خواب حجت اور دلیل نہیں بن سکتا جبکہ پیغمبر کا خواب حجت اور دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نبی کے خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں ہے اور بیداری کی طرح خواب کی وحی بھی حجت اور دلیل ہے۔ پیغمبر کا خواب اس درجہ کی وحی اور حجت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے پر تیار ہوگئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی والد محترم کے سامنے اپنی گردن ذبح کرنے کے لیے پیش کردی بلکہ اپنی طرف سے باپ نے ذبح

کر دیا اور بیٹا ذبح ہو گیا، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح ہونے سے اپنی قدرت کے ساتھ بچالیا۔ اس سارے واقعہ کی بنیاد خواب پر ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر کا خواب بھی اس کی بیداری کی طرح وحی کا درجہ رکھتا ہے۔

اس بنیاد پر یہ عرض کرنا شاید نامناسب بات نہ ہو کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے حوالہ سے توان کے خواب کے اسفار اور بیداری کے سفر میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں قسم کے مشاہدات حقیقی اور واقعاتی ہیں۔ البتہ ہمارے لیے دونوں کی حیثیت اس پہلو سے الگ الگ ہے کہ حضور ﷺ کا بیداری کی حالت میں معراج واسراء کا سفر معجزہ ہے۔ جبکہ خواب کے اس قسم کے اسفار کو معجزات میں شمار نہیں کیا جاتا۔

اس تمہید کے ساتھ یہ گزارش کروں گا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے معراج واسراء کا ہمارے ساتھ تعلق ایک تو اس حوالہ سے ہے کہ یہ ہمارے ایمان وعقیدہ کا حصہ ہے، اور دوسرا تعلق اس پہلو سے ہے کہ ان میں ہمارے لیے سبق اور عمل کے بہت سے پہلو ہیں۔ ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم ان واقعات سے سبق حاصل کریں اور ان میں ہمارے لیے جو پیغامات اور تعلیمات ہیں ان پر عملدرآمد کا اہتمام کریں۔ چنانچہ خواب اور بیداری کے ان واقعات میں سے، جو سینکڑوں احادیث مبارکہ میں بکھرے ہوئے ہیں، دو واقعات کا تذکرہ کروں گا۔ ایک واقعہ خواب کا ہے اور دوسرا بیداری کے معراج کا ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد اشراق کے وقت تک مسجد میں ہی تشریف فرما ہوتے تھے اور اس دوران مختلف نوعیت کی باتیں ہوتی رہتی تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ کسی صحابی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو وہ اپنا خواب بیان کرتا تھا اور آنحضرت ﷺ اس کی تعبیر بتادیتے تھے بسا اوقات آپ ﷺ پوچھ بھی لیتے تھے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو تو بیان کرے، کبھی حضور ﷺ اپنا خواب بیان فرماتے تھے کہ میں نے یہ خواب میں دیکھا ہے اور اس کی تعبیر بیان فرماتے تھے۔ بخاری شریف میں حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت سے جناب نبی اکرم ﷺ کا ایک طویل خواب مذکور ہے جس کا ایک حصہ عرض کر رہا ہوں۔

رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ دو شخص میرے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا، ہم چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچے جو بہت خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت بستی میں نے اس سے قبل نہیں دیکھی تھی، خوبصورت عمارتیں، کشادہ راستے، صاف ستھرا ماحول، غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ عمارتیں سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ میں نے ساتھ والے دو شخصوں سے پوچھا کہ یہ بستی کون سی ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ آگے چلیں بعد میں بتائیں گے ہم آگے چلے تو بستی کے ایک طرف صاف ستھرے پانی کی ایک بڑی نہر ہے جس میں روانی کے ساتھ پانی چل رہا ہے میں نے دیکھا کہ بستی کی دوسری طرف لوگوں کا ایک بڑا ہجوم ہے جو بستی کی طرف بڑھ رہا ہے مگر ان کے چہرے عجیب ہیں "نصفهم کاحسن ما رایت و نصفهم کاقبح ما رایت" چہرے کا نصف حصہ اتنا خوبصورت ہے جتنا خوبصورت تم دیکھ سکو اور چہرے کا باقی نصف اتنا بدصورت ہے جتنا بدصورت تم دیکھ سکو۔ میں نے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا آگے چلیں بعد میں بتائیں گے۔ اتنے میں میرے ساتھیوں نے ہجوم والوں کو آواز دی کہ سب اس نہر میں کود جاؤ وہ سب نہر میں کود گئے اور اس میں دو دو چار چار غوطے لگاتے ہوئے تیر کر دوسرے کنارے سے بستی میں داخل ہونا شروع ہو گئے میں نے دیکھا کہ نہر میں چھلانگ لگانے اور غوطے کھانے سے ان کے چہروں کی ساری بدصورتی غائب ہو گئی اور وہ انتہائی خوبصورت چہروں کے ساتھ اس بستی میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد میرے ان دو ساتھیوں نے جو مجھے لے کر آئے تھے بتایا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں اور ہماری آج کی ڈیوٹی آپ کو یہ مناظر دکھانے کی ہے۔ یہ بستی عدن ہے جو جنت کا وہ حصہ ہے جہاں آپ کا قیام ہو گا۔ یہ بستی کی طرف بڑھنے والے لوگوں کا ہجوم آپ کی امت کے ان لوگوں کا ہے جو "خلطوا عملاً صالحاً وآخر سیئا" نیکی اور بدی کے کام گڈمڈ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اچھے اعمال بھی کیے اور برے اعمال بھی کرتے رہے اور ان کے معمولات میں نیکی اور گناہ کے اعمال خلط ملط چلتے رہے۔ ان کے چہروں پر ان کے اپنے اعمال کا پرتو ہے، نیکی اور خیر کے اعمال حسن کی صورت میں جبکہ گناہ اور شر کے اعمال قبح کی صورت

میں ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اور جس نہر میں چھلانگ لگا کر انہوں نے قبح اور بد صورتی سے نجات پائی ہے یہ توبہ و استغفار کی نہر ہے جس میں نہانے سے ان کے چہروں سے ساری بدصورتی صاف ہو گئی اور وہ خوبصورت چہروں کے ساتھ جنت میں داخل ہو گئے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کے خواب کا یہ قصہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں گناہوں سے نجات اور اعمال شر کے اثرات ختم کرنے کے لیے توبہ اور استغفار کا راستہ بتایا ہے اور تلقین فرمائی ہے کہ ہم توبہ اور استغفار کرتے رہیں تاکہ گناہوں سے اور ان کے اثرات سے پاک ہو سکیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے جسم پر میل کچیل جمتی ہے، پسینہ آتا ہے اور بدبو پیدا ہوتی ہے، جس کا علاج یہ ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً غسل کرتے رہیں۔ اگر غسل کرتے رہیں گے تو جسم کی بدبو، پسینہ اور میل کچیل ساتھ ساتھ صاف ہوتی رہے گی اور اگر غسل کی عادت اور معمول نہیں ہو گا تو رفتہ رفتہ یہ میل کچیل جسم کا حصہ بن جائے گی اور ایک وقت آئے گا کہ غسل بھی فائدہ نہیں دے گا، یا جیسے استعمال ہونے والے کپڑے ہیں کہ ان پر گرد بھی لگے گی، داغ بھی جمیں گے، پسینہ اور میل کچیل بھی ان کو میلا کرے گی اور ان سے بدبو بھی آئے گی۔ ان سب کا علاج یہ ہے کہ ان کو وقفہ وقفہ سے دھویا جاتا رہے، کپڑے استعمال تو ہو رہے ہیں مگر دھل نہیں رہے تو یہ میل کچیل اور داغ ان کے ساتھ پختہ ہوتے چلے جائیں گے اور ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ کپڑوں کو دھونے کا بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہمارا جسم اور اس کے ساتھ روح ہے۔ اور ہمیں ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ اگر روح کا کنکشن ہے تو یہ انسان ہے ورنہ خالی جسم تو کباڑ کی طرح ہے کہ اسے کوئی بھی گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ باپ بیٹے کو دفن کر دیتا ہے اور بیٹا اپنے ہاتھوں باپ کو سپرد خاک کرتا ہے، بیوی خاوند کو گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہے اور خاوند بیوی کو گھر میں نہیں رکھتا۔ جیسے موبائل فون میں کنکشن ہو تو وُہ رابطے کا کام کرتا ہے۔ اور ہم اپنے موبائل فون کو کار آمد رکھنے کے لیے سیٹ اور کنکشن دونوں کی حفاظت کرتے ہیں اور دونوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ سیٹ کی ضرورت یہ ہے کہ اس کی مشینری صحیح کام کرے اور اس کی بیٹری چارج ہوتی رہے جبکہ کنکشن کی

ضرورت یہ ہے کہ وہ برقرار رہے اور اس کو ضرورت کے مطابق بیلنس ملتا رہے۔ اسی طرح انسان ہے جو جسم اور روح دونوں سے مرکب ہے، جسم کی ضروریات کی طرف تو ہماری توجہ ہوتی ہے اور ہم اس دنیا میں اس کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہو کرتے رہتے ہیں لیکن روح کی ضروریات کی طرف ہماری توجہ نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ جسم کے ساتھ کنکشن رکھتے ہوئے بھی ڈیڈ ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح جسم میلا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ گرد اور بدبو لگتی ہے جس کا علاج ہم غسل کے ساتھ کرتے ہیں، اسی طرح روح بھی میلی ہوتی ہے نفسانی خواہشات، گناہ، شیطانی خیالات اور برے اعمال انسان کی روح کو میلا کر دیتے ہیں، اسے بدبو دار بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کا غسل بھی اگر ساتھ ساتھ ہوتا رہے تو وہ صاف رہتی ہے ورنہ میل اور بدبو رفتہ رفتہ اسے اس حال میں کر دیتی ہے کہ میل اور بدبو کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے اسی حالت کو قرآن کریم نے دلوں کے گرد غلاف چڑھ جانے سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ پھر دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور ان میں حق اور خیر کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ روح کا غسل نماز کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت سے ہوتا ہے جناب نبی اکرم ﷺ پر درود شریف پڑھنے سے ہوتا ہے اور توبہ و استغفار کی کثرت سے ہوتا ہے۔ اور جناب رسول اکرم ﷺ کے اس خواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسی بات کی تعلیم دی ہے۔

دوسرا واقعہ جناب رسول اللہ ﷺ کے اس تاریخی سفر معراج و اسراء کا بیان کروں گا جو ایک بڑا معجزہ ہے، بیداری کی حالت میں ہوا ہے، جسم مبارک کے ساتھ ہوا ہے اور اس کی مختلف تفصیلات آنحضرت ﷺ سے سینکڑوں احادیث مبارکہ میں منقول ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے جب جنت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی تو حضرت ابراہیمؑ نے آنحضرت ﷺ کی امت کے لیے آپ کو دو پیغام دیے۔ وہ دو پیغام میں آج کی اس محفل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ حضرات کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی اس سفر معراج و اسراء میں تین بار ملاقات ہوئی۔ پہلی بار جب تمام انبیاء کرام بیت المقدس

میں جمع ہوئے اور سب نے نبی اکرم ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ دوسری بار فرشتوں کے قبلہ بیت المعمور کے پاس ان دو بزرگوں کی ملاقات کا ذکر روایات میں ملتا ہے۔ اور تیسری ملاقات کا ذکر ترمذی شریف کی اس روایت میں ہے جو جنت میں ہوئی ہے اور اس میں حضرت ابراہیمؑ نے جناب نبی اکرم ﷺ کے ذریعے آپ ﷺ کی امت کے لیے دو پیغامات دیے۔

ایک یہ ہے کہ اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہہ دیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ ہمیں سلام بھیج رہے ہیں، اور وہ بھی جناب نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ سے۔ اس لیے یہ سلام سن کر ہم سب کو سنت کے مطابق اس کا جواب دینا چاہیے۔

دوسرا پیغام یہ ہے کہ اپنی امت سے فرما دیجئے کہ "ان الجنة ارضها طيب و ماءها عذب وانما هي القيعان، غرسها سبحان الله والحمد لله والله اكبر ولا اله الا الله" بے شک جنت کی زمین عمدہ ہے اور پانی میٹھا ہے لیکن وہ چٹیل میدان ہے، اسے ذکر الٰہی کے ذریعے خود آباد کرنا ہوگا۔

یعنی جنت انسانوں کے رہنے کے قابل ہے لیکن خالی پلاٹ ملے گا اور وہاں تعمیر اور آبادی خود کرنا ہوگی۔ دنیا میں کسی بھی جگہ آبادی کے لیے اور بسنے کے لیے سب سے پہلے زمین اور پانی کو چیک کیا جاتا ہے اور پھر وہاں بستی بسانے اور انسانوں کو آباد کرنے کا پلان کیا جاتا ہے۔ آج کل ہمارے سائنسدان مختلف سیاروں میں انسانی زندگی کے امکانات تلاش کر رہے ہیں۔ پانی آکسیجن اور ہوا کی تلاش جاری ہے اور اس بات کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ انسانوں کو اگر کسی دوسرے سیارے میں آباد ہونا پڑے تو اس کے لیے کون سا سیارہ مناسب رہے گا۔ ویسے بھی ہم نے اس سیارہ ارضی کا خود اپنے ہاتھوں جو حشر کر دیا بلکہ مسلسل کیے جا رہے ہیں اس کے پیش نظر متبادل جگہ کی تلاش نسل انسانی کی ضرورت بھی ہے کہ ہماری بد اعمالیوں اور حرکتوں کی وجہ سے یہ سیارہ ارضی خدانخواستہ کسی وقت بھی تباہی کا شکار ہو سکتا ہے۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے سائنسدان تو ابھی امکانات کی تلاش میں

سرگرداں ہیں جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چودہ سو سال قبل ایک پیغام کے ذریعے یہ رپورٹ ہمیں بھجوادی ہے کہ جنت انسانوں کے رہنے کے قابل ہے اور اس کی زمین اور پانی دونوں حیات انسانی کے لیے خوشگوار ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دے دی ہے کہ جنت چٹیل میدان ہے اور جس کو بھی ملے گی، خالی پلاٹ کی صورت میں ملے گی اسے آباد خود کرنا ہو گا اور اس پر شجر کاری، باغات اور سبزہ وغیرہ کا اہتمام انسانوں کو خود کرنا پڑے گا۔

مختلف احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر انسان کو اس دنیا میں پیدائش کے ساتھ ہی دو پلاٹ الاٹ ہو جاتے ہیں ایک جنت کا اور ایک دوسرا دوزخ کا، دونوں پلاٹ اس کے ساتھ مختص ہو جاتے ہیں۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو آباد کرتا ہے اور کس کو ویران رہنے دیتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں جب سوال وجواب کا مرحلہ مکمل ہو جاتا ہے تو جنتی اور نیک شخص کے لیے پہلے جہنم کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر تو نیکی اور ایمان کا راستہ اختیار نہ کرتا تو تیرا یہ ٹھکانہ ہوتا، یہ بتا اور دکھا کر دوزخ کی وہ کھڑکی بند کر دی جاتی ہے اور اس کے لیے جنت کی کھڑکی کھولی جاتی ہے۔ اسی طرح بدکار اور دوزخی کے لیے پہلے جنت کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ نیکی اور ایمان کا راستہ اختیار کرتا تو اس کا یہ ٹھکانہ ہوتا۔ اس کے بعد وہ کھڑکی بند کر کے اس کے لیے جہنم کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ کسی بھی انسان کو دنیا میں اس کی پیدائش کے ساتھ ہی جنت اور دوزخ کا ایک ایک پلاٹ الاٹ کر دیا جاتا ہے اور فیصلہ اس کی دنیا کی زندگی اور اس کے ایمان اور اعمال کے حوالہ سے ہوتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد کون سا پلاٹ باقی رہ گیا ہے اور کون سا منسوخ ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی اپنے پیغام میں اسی بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ جنت کا خالی پلاٹ تو انسان کو مل جاتا ہے لیکن اس کی آبادی اور اس میں سبزہ کاری انسان کی دنیا کی زندگی کے اعمال وایمان پر موقوف ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ یہ فرما کر "انما ھی القیعان" جنت چٹیل میدان کا نام ہے۔ اس کی آبادکاری کا طریقہ

بھی بتاتے ہیں کہ "غرسہا سبحان اللہ والحمد للہ واللہ اکبر ولا الہ الا اللہ" جنت کے اس بے آب وگیاہ اور چٹیل میدان کو سرسبز بنانے کے لیے دنیا میں جتنا اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرو گے اور جتنا اپنے مالک اور رازق کا ذکر کرو گے اتنا ہی تمہارے جنت کے پلاٹ میں سبزہ اُگے گا اور اتنے ہی وہاں درخت پیدا ہوں گے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ نسل انسانی کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ زمین کے تباہ ہو جانے کے بعد تمہارے لیے رہنے کے قابل جگہ جنت ہی ہے لیکن اس کے لیے تمہیں محنت دنیا میں کرنی ہو گی اور مرنے سے قبل اس کی تیاری کرنی ہو گی ورنہ وہ پلاٹ کینسل بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور بات عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں جنت میں اپنے پلاٹ کو آباد کرنے کے لئے ہمیں اس دنیا میں محنت کرنی ہے اور ہمارے موت سے پہلے کے اعمال اور ایمان کے ساتھ ہی ہمارا جنت کا پلاٹ محفوظ رہے گا اور آباد ہو گا، وہاں ہمیں اس پلاٹ کے سائز کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے تاکہ محنت اس کے مطابق ہو۔ جنت کی بے پناہ وسعت اور اس کی لمبائی اور چوڑائی کا تذکرہ مختلف احادیث میں ملتا ہے۔ مثلاً جناب نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ جنت کے ایک درخت کے سائے میں تیز رفتار گھوڑا سو سال تک دوڑتا رہے تو اس کا سایہ پھر بھی ختم نہیں ہو گا۔ مگر میں اس حوالے سے ایک روایت کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو مسلم شریف میں ہے اور جس میں اس شخص کا ذکر کیا گیا ہے جو سب سے آخر میں جنت میں داخل ہو گا۔

یہ ایک لمبی روایت ہے لیکن میں اس کا صرف ایک حصہ بیان کروں گا جب جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونے والا شخص جنت کے دروازے سے اندر جائے گا تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو گا کہ جا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔ وہ ادھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد عرض کرے گا یا الٰہی مجھے تو کوئی خالی جگہ نہیں مل رہی، سب زمینیں ریزرو ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ پھر فرمائیں گے کہ جا کر اپنی جگہ تلاش کرو۔ وہ دوبارہ گھوم پھر کر واپس آئے گا اور عرض کرے گا مولائے کریم! مجھے تو کوئی خالی جگہ نظر نہیں آ رہی۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں

گے کہ بتاؤ کتنی جگہ چاہیے؟ جس زمین پر تم رہ کر آئے ہو، اس پوری زمین جتنی جگہ دے دوں؟ وہ عرض کرے گا ”اتستھزء بی وانت رب العالمین؟“ یا اللہ! رب العالمین ہو کر میرے ساتھ استہزا کر رہے ہو؟ مسلم شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ بات سن کر ہنسیں گے اور فرمائیں گے کہ میں تم سے استہزا نہیں کر رہا ”لک الارض وعشرۃ امثالھا“ بلکہ پوری زمین اور اس جیسی دس زمینیں اور میں نے تمہیں عطا کر دی ہیں۔ یعنی یہ کرۂ ارضی اور اس جیسی دس زمینیں اس شخص کو ملیں گی جو سب سے آخر میں جنت میں جائے گا۔ اسی سے جنت کے پلاٹوں کے سائز کا اندازہ کر لیں اور اس بات کا بھی اندازہ کر لیں کہ اس پلاٹ کو آباد کرنے اور اسے اپنے لیے محفوظ رکھنے کی خاطر ہمیں دنیا میں کس قدر محنت درکار ہے۔

حضرات محترم! میں نے جناب نبی اکرم ﷺ کے سفر معراج و اسراء کے دونوں پہلوؤں یعنی بیداری کے معراج اور خواب کے معراج کے حوالے سے دو مختصر واقعات آپ کے سامنے بیان کیے ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کے معجزات پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے اپنے لیے سبق اور پیغام بھی تلاش کریں اور ان پر عمل کریں تاکہ ہماری یہ دنیا کی زندگی کارآمد ہو اور ہم یہاں سے سرخرو واپس جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

مکارم اخلاق اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ
وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ

حضراتِ محترم! سب سے پہلے تو میں مدنی مسجد کی منتظمہ اور بالخصوص مولانا رضاء الحق سیاکھوی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے لیے اس سعادت میں شمولیت کا اہتمام فرمایا کہ جناب سرور کائنات، شفیع المذنبین، خاتم النبیّین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وازواجہ واصحابہ واتباعہ وبارک وسلم کی سیرت طیبہ پر چند دن مسلسل کچھ گزارشات کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس کے بعد میں آپ حضرات سے درخواست کروں گا کہ گفتگو کے باقاعدہ آغاز سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں خصوصی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں کی اصلاح فرمائیں اور یہ عمل جو ہم شروع کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ خلوص نیت کے ساتھ اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائیں۔ اس دوران سیرت طیبہ کے حوالے سے جو گفتگو ہو اللہ تعالیٰ کہنے اور سننے والوں کو جناب نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے زیادہ سے زیادہ واقفیت اور اس پر عمل کی توفیق سے نوازے، اس لیے کہ صحیح علم کا فائدہ تبھی ہے جب اس پر عمل ہو۔

سیرتِ طیبہ، بحرِ ناپیدا کنار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ایک بہت بڑا سمندر ہے، ایسا سمندر نہ جس کا کوئی کنارہ ہے اور نہ جس کی کوئی تہہ ہے۔ آج دنیا کے سمندر کی تہہ تو لوگوں نے ڈھونڈلی ہے اور کنارے بھی معلوم کر لیے گئے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی تہہ تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور قیامت تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔ گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ پر کتابیں لکھی جا

رہی ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں اور مذاکرات ہو رہے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی نئی بات اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتے ہیں، یوں آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے نئے نئے نکات، نئی نئی چیزیں اور نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں جو کہ قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج تک جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اور جتنا کچھ کہا جا چکا ہے یہ سب مل کر بھی جناب رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا حق ادا نہیں کرتے تو یہ بات خلافِ واقعہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کا احاطہ تو کسی کے بس کی بات نہیں ہے، یہ دعویٰ کہ ہم ساری سیرت بیان کر لیں گے یا ساری سیرت سمجھ لیں گے یہ بات ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرا یہ اِرادہ ہے کہ آج کے ہمارے عملی مسائل کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو ترتیب کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ ہم نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر گفتگو کے جو عنوانات منتخب کیے ہیں ان کی ترتیب یہ ہے، ان عنوانات پر ان شاء اللہ العزیز روزانہ گفتگو ہو گی اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق دے، آمین۔

1. سیرت نبوی ﷺ اور مکارم اخلاق
2. سیرت نبوی ﷺ اور سماجی خدمت
3. سیرت نبوی ﷺ اور خواتین کی معاشرتی حیثیت
4. سیرت نبوی ﷺ اور انسانی حقوق
5. سیرت نبوی ﷺ اور سیاسی قیادت
6. سیرت نبوی ﷺ اور قانون کی بالادستی
7. سیرت نبوی ﷺ اور معاشی انصاف
8. سیرت نبوی ﷺ اور دعوتِ اسلام
9. سیرت نبوی ﷺ اور خاندانِ نبوت
10. سیرت نبوی ﷺ اور تسخیر کائنات

انسانی اخلاق

ہماری آج کی پہلے دن کی گفتگو کا عنوان ہے "سیرت نبوی ﷺ اور مکارم اخلاق"۔ خُلق انسانی عادت کو کہتے ہیں، اَخلاق عادات کو کہتے ہیں۔ انسان جب اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو والدین کی تربیت، ارد گرد کے ماحول اور حالات و واقعات کے ذریعے اس کا مختلف عادات پر مشتمل ایک مزاج بن جاتا ہے۔ اخلاق اچھے بھی ہوتے ہیں اور اخلاق برے بھی ہوتے ہیں، اخلاق فاضلہ اور اخلاق رذیلہ دونوں کا ذکر آتا ہے۔ اچھی عادت ہے سچ بولنا بری عادت ہے جھوٹ بولنا، اچھی عادت ہے انصاف کرنا بری عادت ہے ظلم کرنا، اچھی عادت ہے وعدہ پورا کرنا بری عادت ہے وعدہ توڑنا۔ یہ میں نے مثال کے طور پر عرض کیا ہے کہ عادات اچھی بھی ہوتی ہیں اور عادات بری بھی ہوتی ہیں، اچھی عادات کو بھی اخلاق کہتے ہیں اور بری عادات کو بھی اخلاق ہی کہتے ہیں۔

ایک انسان کی عادات صرف اسی پر اثر انداز نہیں ہوتیں بلکہ پوری سوسائٹی پر اثر انداز ہوتی ہیں اِس لیے کہ کوئی بھی انسان دنیا میں اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ایک انسان اگر دنیا میں باقی انسانوں سے کٹ کر تنہا رہنا چاہے تو یہ بات ممکن نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگیوں کے لیے اجتماعی معاشرہ بنایا ہے اور مل جل کر رہنے والی اور ایک دوسرے کے کام آنے والی سوسائٹی بنائی ہے۔ سب انسان مل کر اجتماعی اعمال سے گزرتے ہیں تو ایک معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ مثال کے طور پر میرے ہاتھ میں یہ ایک کاغذ ہے جس پر کچھ لکھا ہے یہ مجھ اکیلے کا کام نہیں ہے۔ اس کاغذ کے بننے میں خدا جانے کتنے لوگوں کا عمل دخل ہے، جس قلم سے لکھا گیا ہے اس کے بننے میں خدا جانے کتنے لوگوں کا عمل شامل ہے، قلم میں جو سیاہی ہے خدا جانے اس کے بننے میں کن کن لوگوں کی مہارت کار فرما ہے، اور پھر میری اس کاغذ پر لکھنے کی جو صلاحیت ہے خدا جانے اس کے پیچھے کن کن لوگوں کی محنت شامل ہے۔ تو اس کاغذ پر جو تحریر ہے یہ اتنے سارے لوگوں کی محنت اور عمل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ کوئی بھی عمل دنیا میں ایسا نہیں ہے جو ایک انسان تنہا کر سکے، چنانچہ انسانوں کے اجتماعی اعمال

سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے، اگر انسانوں کے مجموعی اعمال اچھے ہوں تو ایک اچھی سوسائٹی بنتی ہے لیکن اگر انسانوں کے مجموعی اعمال برے ہوں تو ایک بری سوسائٹی بنتی ہے۔

یوں سمجھ لیں کہ انسانی معاشرہ ایک مشین ہے جس کے پرزے انسان ہیں۔ مشین کے اچھے یا برے ہونے کا دارومدار پرزوں کے معیار پر ہے، پرزے اچھے معیار کے ہوں گے اور جس انجینئر نے وہ مشین ڈیزائن کی ہے اس کی ہدایات کے مطابق ہوں گے تو ان پرزوں سے مشین بھی اچھی بنے گی، لیکن اگر مشین کے اکثر یا بنیادی پرزے خراب ہوں گے تو وہ مشین بیکار ہوگی۔ اسی طرح معاشرے کے اکثر لوگوں کی اور راہنما لوگوں کی اخلاق و عادات اچھی ہوں گی تو اس سے ایک اچھا معاشرہ بنے گا لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوگا تو ظاہر بات ہے کہ معاشرہ بھی برا ہی سامنے آئے گا۔ حضرات انبیاءؑ کی تعلیمات کی بنیاد اسی بات پر ہے کہ انسان اس مشینری کا ایک صحیح اور کار آمد پرزہ بنے اور انسان کا ایمان، یقین اور اس کی عادات اچھی ہوں۔ اگر انسان کا خدا کی ذات پر یقین پختہ ہوگا تو اس کے اخلاق و اعمال اچھے ہوں گے اور یوں وہ معاشرے کا ایک مفید فرد بنے گا۔

بہترین اخلاق کے لوگ

اس دنیا میں اخلاق اور کردار کے اعتبار سے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سب سے بہتر لوگ تھے، یہ صرف ہماری عقیدت اور محبت کی بات نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ اور حقیقت ہے۔ اسی طرح انبیاء کرامؑ میں سے سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ شخصیت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، یہ بات اپنے اور پرائے سب تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی انسانی تاریخ کی سب سے بہتر شخصیت تھی۔ اور طبقاتِ انسانی میں سب سے بہتر طبقہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طبقہ تھا، یہ تاریخی شہادت ہے کہ ایک معاشرے اور سوسائٹی کے طور پر صحابہ کرامؓ کا طبقہ سب سے مثالی اور آئیڈیل طبقہ تھا، ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنے والا ایک دوسرے کے لیے ایثار کرنے والا ایک دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا۔ ایسا طبقہ جس کی بنیاد اچھے اخلاق و عادات پر تھی اس لیے کہ یہ طبقہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تربیت یافتہ تھا اور

حضور ﷺ نے ایک ایک پرزے کی تربیت اس انداز سے کر دی تھی کہ وہ انسانی معاشرے کی مشین میں پرزے کے طور پر اپنی اپنی جگہ فٹ ہوتے چلے گئے اور یوں دنیا کا ایک بہترین معاشرہ تشکیل پایا۔

چنانچہ اخلاق فاضلہ انسانی معاشرے کی سب سے بنیادی ضرورت ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین اور ایمانیات کے بعد انسانی معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت اچھے اخلاق و عادات کا حامل ہونا ہے۔ اچھی عادات میں اللہ پر ایمان بھی ہے، عبادات بھی ہیں اور آپس کے معاملات بھی ہیں۔ لیکن شخصی مزاج اور شخصی عادات کا اچھا ہونا یہ دین اسلام کا سب سے بڑا مطالبہ اور سب سے بڑا تقاضا ہے۔ خود جناب نبی کریم ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب بندہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا کہ میرا قُرب سب سے زیادہ اسے نصیب ہو گا جو سب سے زیادہ خوش اخلاق ہو گا۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا کہ اگر تم سوسائٹی میں اچھے لوگ دیکھنا چاہو تو ان لوگوں کو دیکھو جو اَحۡسَنُهُمۡ اَخۡلَاقًا جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

نسلِ انسانی کی بہترین شخصیت

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاقِ حسنہ کے اعتبار سے پوری نسلِ انسانی میں ممتاز ترین شخصیت ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ کوئی شخص ذاتی حد تک عادات و اخلاق کے اعتبار سے اچھے مزاج کا حامل ہو، اس اعتبار سے تو آپ ﷺ اچھے مزاج کے حامل تھے ہی، لیکن آپ ﷺ نے اپنے اچھے اخلاق و عادات کو اپنے ساتھیوں، دوستوں، بچوں اور شاگردوں میں تقسیم فرمایا اور اخلاق فاضلہ کی ایک بہترین سوسائٹی دنیا کو دی۔ یہ جناب نبی کریم ﷺ کا کمال ہے کہ آپ نے اچھے اخلاق کی تربیت دے کر ایک باکمال جماعت تشکیل دی جو آج بھی ایک بہترین معاشرے کے طور پر دنیا کے سامنے مثال ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اچھے اخلاق کی تربیت کو اپنی زندگی کا مشن قرار دیتے ہوئے فرمایا بُعِثۡتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الۡاَخۡلَاقِ کہ مجھے سب سے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔ فرمایا کہ میں اس لیے

بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق میں جو سب سے بلندی والے شرافت والے اور عزت والے اخلاق ہیں انہیں اپنے کمال تک پہنچادوں اور واقعی جناب نبی کریم ﷺ نے مکارم اخلاق کو انتہا تک پہنچایا۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں قدم قدم پر اخلاقِ حسنہ کا مظاہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اخلاقِ حسنہ میں آپ کوئی بھی دو چار چیزیں منتخب کر لیں آنحضرت ﷺ کی شخصیت آپ کو ان کی انتہا پر نظر آئے گی۔ میں اس موقع پر جناب رسول اکرم ﷺ شخصیت کے حوالے سے کچھ چیدہ چیدہ باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہوں گا۔

سچائی

"سچائی" اخلاق حسنہ میں سب سے پہلی عادت ہے۔ سچ بولنا اس دنیا کی سب سے بڑی خوبی ہے اور انسانی اخلاق و عادات میں سب سے اچھی عادت سچ بولنا ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا سب سے بری عادت ہے۔ ایک کافر شخص جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میں ایمان قبول کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھ میں بہت سی بری عادات ہیں۔ میں شراب بھی پیتا ہوں زنا بھی کرتا ہوں اور نہ جانے کیا کچھ کرتا ہوں۔ میں ایمان قبول کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن سب بری عادات یک دم نہیں چھوڑ سکتا البتہ ایک ایک کر کے چھوڑ سکتا ہوں۔ جناب رسول اکرم ﷺ نے اس شخص کی اس شرط پر راضی ہوتے ہوئے اسے کلمہ پڑھوایا اور اس شخص نے ایمان قبول کر لیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس شخص سے کہا کہ میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم آج کے بعد جھوٹ نہیں بولو گے، اس نے کہا کہ ٹھیک ہے میرا آپ کے ساتھ وعدہ ہے کہ میں آج کے بعد جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اللہ کی قدرت دیکھیں کہ اس جھوٹ کے چھوڑنے سے اس شخص کی سب برائیاں یکے بعد دیگرے چھوٹتی چلی گئیں۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے برائیوں کی ترتیب میں سب سے پہلے "جھوٹ" کا ذکر فرمایا۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیم سے بتایا کہ اچھائیوں میں سب سے اچھی عادت سچائی ہے جبکہ برائیوں میں سب سے بری عادت جھوٹ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو پوری نسل انسانی میں اصدق الناس کہا جاتا ہے اور یہ کوئی مبالغے کی بات نہیں ہے کہ ہم اپنی عقیدت اور محبت کی

وجہ سے ایسی بات کہہ رہے ہیں بلکہ یہ امر واقعہ ہے جس کی بڑے سے بڑے دشمن نے بھی تصدیق کی ہے۔ حضور ﷺ کے سب سے بڑے دشمن دو تھے پہلے ابو جہل اور اس کے بعد ابو سفیان۔ رسول اللہ ﷺ کے خلاف مکہ کے معاشرے کو لڑانے والے یہی دو بڑے تھے لیکن آنحضرت کے ایک سچا انسان ہونے کے بارے میں دونوں کی گواہی تاریخ کے ریکارڈ پر ہے۔

ابو جہل سے کسی نے پوچھا کہ محمد ﷺ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ابو جہل نے اقرار کیا کہ محمد ﷺ سچے آدمی ہیں۔ اس سے پوچھا گیا کہ اگر وہ سچے ہیں تو تم مانتے کیوں نہیں ہو؟ ابو جہل نے کہا کہ یہ الگ بات ہے کہ میں نہیں مانتا یہ ہماری چودھراہٹ کا مسئلہ ہے لیکن محمد ﷺ ایک سچا آدمی ہے۔ دشمن کی شہادت ہی اصل میں سب سے بڑی گواہی ہوتی ہے۔

اس وقت کی سب سے بڑی سپر پاور رُوم کے بادشاہ قیصر کے دربار میں جب جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا خط پہنچا تو قیصر روم نے کہا کہ عرب معاشرے کا کوئی ایسا معتبر آدمی لاؤ جس کے ساتھ میں محمد ﷺ کے بارے میں بات کر سکوں۔ ابو سفیان بھی اتفاق سے ان دنوں تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے چنانچہ قیصر روم کے دربار میں حضور ﷺ کا خط پڑھا گیا اور ابو سفیان جو رسول اللہ ﷺ کے اس وقت کے سب سے بڑے مخالف تھے انہیں قیصر روم کے دربار میں بلا کر پوچھا گیا کہ تمہارے علاقے کے ایک آدمی محمد ﷺ کا خط آیا ہوا ہے، میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ قیصر روم نے ابو سفیان سے جناب نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں جو سوالات کیے ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس شخص (محمد ﷺ) کی ذاتی زندگی میں سچ اور جھوٹ کے حوالے سے تمہاری کیا رائے ہے؟ ابو سفیان نے جواب دیا کہ محمدؐ ایک سچ بولنے والا بندہ ہے۔ چنانچہ یہ بھی ایک بہت بڑی تاریخی شہادت ہے کہ آپ ﷺ کے سب سے بڑے دشمن نے بھی آپ ﷺ کے سچا اور کھرا آدمی ہونے کا اعتراف کیا۔

حضور ﷺ کی ذاتی زندگی تو سچائی ہی سے عبارت تھی، صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر پورے معاشرے سے شہادت مانگی کہ میں نے تمہارے اندر چالیس سال گزارے ہیں میرے شب و روز تم نے دیکھے ہیں میرا بچپن، جوانی، اٹھنا بیٹھنا اور میرے معاملات سب کچھ تم لوگوں

نے دیکھا ہے، تم لوگوں کی میرے بارے میں کیا رائے ہے؟ هَلْ وَجَدْتُمُونِي صَادِقاً أَوْ كَاذِباً کہ مجھے تم لوگوں نے سچا پایا یا جھوٹا؟ سب نے بیک وقت آواز کہا مَا وَجَدْنَا فِيكَ إِلاَّ صِدْقاً کہ اے محمد ﷺ تمہاری زندگی میں ہم نے کبھی سچائی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تو سچائی کا مظہر تھے ہی لیکن آپ ﷺ نے جو سوسائٹی تشکیل دی وہ کیسی تھی؟ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں غزوۂ تبوک کا لشکر سب سے بڑا اور مشکل لشکر تھا جسے جیشِ عُسرت کہا جاتا ہے۔ شام کی طرف ایک لمبا سفر تھا، ایک طُرف کا سفر ایک مہینے میں طے ہوتا تھا اور پھر یہ اندیشے بھی تھے قیصر روم سے مقابلہ ہے خدا جانے وہاں کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی۔ چنانچہ منافقین تو بہانے اور عذر کر کے مدینہ منورہ رہ گئے لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ مخلص صحابیؓ بھی اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے رہ گئے جن میں سے ایک حضرت کعب بن مالکؓ بھی تھے۔ چونکہ غزوہ میں شرکت کے لیے اعلانِ عام تھا اِس لیے رسول اللہ ﷺ غزوہ سے جب واپس تشریف لائے تو پیچھے رہ جانے والے لوگوں سے پوچھا کہ بھئی کیا بات تھی تم لوگ ساتھ کیوں نہیں گئے؟ جو لوگ منافقین تھے انہوں نے تو بہانے گھڑے کسی نے کہا کہ بیوی بیمار تھی کسی نے کہا کہ بچہ بیمار تھا کسی نے کہا کہ فلاں ضروری کام تھا وغیرہ۔ جبکہ کعب ابن مالکؓ خود کہتے ہیں کہ میں بھی غزوہ میں نہیں جا سکا تھا میں نے سوچا کہ جیسے یہ سارے لوگ عذر بہانے کر کے جان چھڑا رہے ہیں ایسے ہی میں بھی کوئی ہلکا پھلکا عذر پیش کر کے اپنا کام بنا سکتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ یہ بات ذہن میں آئی لیکن پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ کعب! ایسا نہ کرنا بلکہ سچ بولنا اور رسول اللہ کے سامنے جھوٹ مت بولنا۔ چنانچہ جھوٹ بولنے والوں نے تو وقتی طور پر اپنی جان بخشی کروالی لیکن حضرت کعب بن مالکؓ نے سچ بولا اور مسلسل پچاس روز تک سوشل بائیکاٹ کی سزا بھگتی۔

شاعر کہتا ہے کہ:

مکتب عشق کا نرالا ڈھنگ دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

یہ جناب نبی کریم ﷺ کی تربیت تھی کہ جھوٹ بول کر جان نہیں چھڑوانی بلکہ سچ بول کر سزا بھگتنی ہے، یہ جناب نبی کریم ﷺ کے اخلاق کا پرتو تھا کہ آپ کے تربیت یافتہ صحابیؓ نے مشکل وقت میں سچ بول کر دنیا کو بتایا کہ سچائی کسے کہتے ہیں۔

تحمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کے سب سے نمایاں اوصاف میں ایک صفت کا ذکر ہوتا ہے جسے تحمل، بردباری اور درگذر کہتے ہیں۔ یعنی تکلیف، مخالفت اور اذیت کو برداشت کرتے ہوئے دشمن کو معاف کر دینا۔ دنیا کی کوئی اور شخصیت جناب نبی کریم ﷺ کے تحمل اور بردباری کے کسی ایک واقعہ کی مثال بھی نہیں پیش کر سکتی۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کے بارے میں تو کوئی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ آپ ﷺ وہاں طاقت میں نہیں تھے کہ لوگ جب تکلیف دیتے تھے تو برداشت کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مکہ کی زندگی میں اختیار نہیں تھا، قوت نہیں تھی، اقتدار نہیں تھا اور آپ کی جماعت کمزور تھی، صبر کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ لیکن مدنی زندگی میں جب آپ ﷺ کے پاس اقتدار تھا جب آپ کے پاس حکومت تھی اور پھر جب آپ مکہ مکرمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو مکی زندگی کی وہ ساری تکالیف وہ ساری اذیتیں وہ ساری مشکلات آپ کے سامنے تھیں۔ جب آپ دس ہزار صحابہؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے، اللہ اکبر کی صدا بلند کی، خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا، مکہ مکرمہ میں اقتدار قائم کیا اور پھر سب کو اکٹھا کر کے یہ سوال کیا کہ آج کے دن تم لوگ مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟ اس پر مکہ والوں نے کہا کہ ہم آپ سے ایک شریف آدمی کی اور ایک شریف آدمی کے بیٹے کے سلوک کی توقع رکھتے ہیں، اِس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ کہ آج کے دن تم سے کوئی انتقام نہیں ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

حضور ﷺ کے پاس اختیار اور طاقت تھی آپ ﷺ کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ حضور ﷺ کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل کے بیٹے عکرمہؓ جن کے بارے میں کسی کو تصور بھی نہیں تھا کہ انہیں معافی مل جائے گی، عکرمہؓ نے مکہ چھوڑا اور جدہ پہنچ کر سمندر میں کشتی پر بیٹھ گئے کہ اب میرے لیے یہاں رہنا ممکن نہیں اس لیے مجھے جزیرۃ العرب سے نکل کر کہیں دور چلے جانا چاہیے۔ عکرمہؓ کی اہلیہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا عکرمہؓ کے لیے بھی معافی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ عکرمہؓ کی بیوی نے پوچھا وہ عکرمہؓ جو ابو جہل کا بیٹا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں جانتا ہوں اس کے لیے بھی معافی ہے۔ پوچھا کیا میں عکرمہؓ کو ڈھونڈ کر لے آؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں لے آؤ۔ چنانچہ وہ جدہ تک پیچھا کر کے اپنے خاوند کو واپس لائی اور وہ ایک معزز شہری کے طور پر اسلامی معاشرہ کا حصہ بنے۔

اسی طرح وحشی بن حربؓ آئے جنہوں نے حضور ﷺ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ کو احد کے میدان میں اس بے دردی سے شہید کیا تھا کہ ان کی زبان کاٹی تھی کان کاٹے تھے ناک کاٹی تھی اور سینے سے جگر نکالا تھا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ مکہ کے فاتح کی حیثیت سے لوگوں کی قسمت کے فیصلے کر رہے تھے تو وحشی بن حربؓ آئے اور بتایا کہ یا رسول اللہ! میں وحشی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں جانتا ہوں۔ پوچھا اگر میں اسلام قبول کروں تو کیا میرا اسلام قبول ہو گا؟ فرمایا، ہاں قبول ہو گا۔ بتایا، جناب میں حمزہؓ کا قاتل ہوں کیا یہ قتل مجھے معاف ہو جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں معاف ہو جائے گا۔ اَلْاِسْلَامُ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ کہ اسلام قبول کرنے سے کفر کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وحشی کا اسلام قبول کر کے جناب نبی اکرم ﷺ نے انہیں اپنے مسلمانوں اور عقیدت مندوں میں شامل کیا۔ لیکن انسانی فطرت کے پیش نظر آپ ﷺ نے ایک بات فرمائی کہ وحشی! تمہارا اسلام قبول ہے، تم صحابیؓ ہو اور تمہارے سارے گناہ معاف ہیں لیکن میں جب تمہیں دیکھتا ہوں تو اپنے چچا کی شہادت کا وہ منظر میرے سامنے آجاتا ہے۔ اس پر وحشیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! آج کے بعد آپ مجھے نہیں دیکھیں گے۔ حضور ﷺ کو تکلیف کے اوقات نہ یاد دلانے

کے لیے وحشی نے یہ وعدہ کیا ورنہ کس صحابی کا جی چاہتا ہے کہ وہ حضور ﷺ کے سامنے نہ آنے کے لیے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے پابند کر لے، چنانچہ وحشی شام چلے گئے اور انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ کیا ہوا یہ وعدہ نبھایا۔

وحشیؓ خود روایت کرتے ہیں کہ میرے دل میں ایک کھٹک تھی کہ قیامت کے دن جب حمزہؓ اپنے چاک سینے کے ساتھ پیش ہوں گے تو قاتل کا نام بھی سامنے آئے گا، وحشیؓ کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ حسرت اور تمنا تھی کہ یا اللہ! جتنا بڑا مسلمان میرے ہاتھوں شہید ہوا ہے اتنا ہی بڑا کافر میرے ہاتھوں مارا جائے تاکہ کل قیامت کے دن جب یہ کہا جائے کہ یہ حمزہ کا قاتل ہے تو دوسری طرف بھی کوئی بڑا نام ہو جس سے حساب برابر ہو جائے۔ چنانچہ وحشیؓ کے ہاتھوں نبوت کا دعوے دار مسیلمہ کذاب قتل ہوا۔ وحشی کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے تک میں نے وہی نیزہ سنبھال کر رکھا ہوا تھا جس سے میں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا کہ اِس سے کسی بڑے کافر کو قتل کروں گا، وحشی وہ نیزہ لے کر یمامہ کی لڑائی میں شریک ہوئے اور مسیلمہ کو قتل کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ مسیلمہ کو قتل کرنے کے بعد وحشیؓ میدانِ جنگ میں دیوانہ وار گھومتے تھے اور اعلان کرتے جاتے تھے کہ لوگو! میں حمزہؓ کا قاتل تھا اور میں مسیلمہ کا قاتل ہوں۔ وہ کھٹک جو وحشیؓ کے دل میں تھی نکل گئی اور ذہنی تسکین ہو گئی کہ میں نے آج اپنا حساب چکا دیا ہے۔

دنیا نے بڑے بڑے فاتح دیکھے ہیں لیکن فتح کے بعد قبضے کے بعد اور اقتدار و حکومت ملنے کے بعد اس طرح کوئی اپنے دشمنوں کو معاف کر دے اس کی مثال جناب نبی کریم ﷺ کے علاوہ کوئی اور فاتح پیش نہیں کر سکتا۔

امانت

اخلاقِ حسنہ اور اچھی عادات میں امانت و دیانت کا ذکر بھی آتا ہے۔ امانت ایک اچھی عادت ہے جبکہ بے ایمانی ایک بری عادت ہے، دیانت ایک اچھی خصلت ہے جبکہ بد دیانتی ایک بری خصلت ہے۔ کسی کی امانت میں خیانت کرنا اور کسی کے ساتھ بد دیانتی کا معاملہ کرنا یہ

انسان کے برے اخلاق میں شمار ہوتا ہے۔ جبکہ امانت کا خیال کرنا، لوگوں کے ساتھ دیانت کا معاملہ کرنا اور لوگوں کے حقوق کو محفوظ رکھنا یہ اچھے اخلاق کا مظاہرہ ہے۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس بات میں بھی انتہاء پر ہے کہ اپنوں کے ساتھ دیانت کا معاملہ کرنا آسان ہے، کمال تو یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ امانت ودیانت کا معاملہ کیا جائے۔

جب کفارِ مکہ کے ستم سے تنگ آکر آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہونے لگے تو یہ وہ وقت تھا جب مکہ کے تمام قبائل نے متحد ہو کر آپ ﷺ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماحول یہ تھا کہ قبائل نے افراد منتخب کر کے قاتلوں کا گروہ بنا دیا تھا اور اس گروہ کے سب افراد آپ ﷺ کی جان کے درپے تھے، قاتلوں نے مختلف راستوں کی ناکہ بندی کر کے آپ ﷺ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس ماحول سے اور قتل کے اس فیصلے کے نتائج سے بچنے کے لیے حضور ﷺ نے ہجرت کا راستہ اختیار کیا تھا، اس صورت حال میں جب آنحضرت ﷺ مکہ سے نکلنے لگے تو آپ کا آخری عمل کیا تھا؟ آپ ﷺ نے اپنے بستر پر اپنے چچازاد حضرت علیؓ کو سلایا اس وقت حضرت علیؓ آپ ﷺ کے داماد نہیں تھے۔ حضور ﷺ نے رخصت ہوتے وقت چند امانتیں حضرت علیؓ کے سپرد کیں اور انہیں نصیحت کی کہ یہ امانتیں فلاں فلاں تک پہنچا کر ہمارے ساتھ شامل ہو جانا، یہ امانتیں حضور ﷺ کے دشمنوں کی تھیں۔ حضور ﷺ کی دیانت کا یہ حال کہ جن دشمنوں کی تلواروں کے سائے تلے سے نکل رہے ہیں انہی کی امانتوں کو واپس کرنے کی فکر اور اہتمام کر رہے ہیں۔

جناب نبی کریم ﷺ جب جہاد کے لیے نکلتے تھے تو عام طور پر لشکر کے خاص لوگوں کے علاوہ آخری منزل سے لوگوں کو آگاہ نہیں فرماتے تھے۔ خیبر کے لیے حضور ﷺ لشکر لے کر نکلے جو کہ یہود کا علاقہ تھا، صبح کے وقت جب ان کے کاشت کار کھیتی باڑی کے لیے گھروں سے نکل رہے تھے تب انہیں پتہ چلا کہ محمد ﷺ کے لشکر نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ جب وہاں پہنچ کر آپ ﷺ کے لشکر نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تو ایک شخص اسود راعیؓ جو بعد میں صحابی ہوئے، اس علاقے میں بکریاں چرا رہے تھے، انہیں اپنے کالے رنگ کی وجہ سے اسود اور چرواہا ہونے کی وجہ سے راعی کہا جاتا تھا۔ اسود راعی کسی کے غلام تھے اور اس کی

بکریاں چرایا کرتے تھے انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کا لشکر خیبر تک پہنچ گیا ہے، وہ جناب نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا کہ میں اگر آپ ﷺ کا دین قبول کرلوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جنت ملے گی۔ اسود راعی نے پوچھا کیا مجھ کالے کو جنت ملے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایاہاں تجھے جنت ملے گی۔ پوچھا کیامیری نجات ہو جائے گی؟ فرمایا ہاں ہو جائے گی۔ اسود راعیؓ نے کہا ٹھیک ہے آپ مجھے کلمہ پڑھائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اسود راعیؓ کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کر دیا۔ مسلمان ہونے کے بعد اسود راعیؓ نے حضور ﷺ سے کہا کہ میں اب آپ کا خادم ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایاوہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بکریاں جو تم چَرا رہے ہو یہ کس کی ہیں؟ خیال فرمایئے کہ حالت جنگ میں دشمن کے قلعے کا محاصرہ کر رکھا ہے اور بکریاں بھی کسی دشمن کی ہیں۔ فرمایا کہ تمہارا اسلام قبول کرنا اپنی جگہ لیکن یہ بکریاں جس کی ملکیت ہیں جس کی امانت ہیں اسے واپس کر کے آؤ۔ اسود راعیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! اگر میں بکریاں واپس کرنے گیاتو میں خود کیسے واپس آؤں گا؟ فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ گھر جا کر انہیں دروازے سے اندر کر آؤ۔

ایفائے عہد

مکارم اخلاق اور اچھی عادات میں وعدہ نبھانا ایک اچھی خصلت ہے۔ وعدہ پورا کرنا ایک اچھی عادت ہے جبکہ وعدہ کی خلاف ورزی کرنا ایک بری عادت ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ پورا کرنے کی تلقین بھی فرمائی اور خود وعدہ پورا کرنے کی مثالیں بھی لوگوں کے سامنے پیش کیں۔

مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کے ایک ساتھی عبد اللہ تھے جو حضور ﷺ کے اعلانِ نبوت سے پہلے کے دوستوں میں سے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کی بات ہے میرا حضور ﷺ کے ساتھ ایک کاروباری سودا ہوا۔ سودے کی کچھ رقم میرے پاس تھی جو میں نے حضور ﷺ کو دے دی جبکہ باقی رقم کے لیے کہا کہ آپ یہاں رکیں میں گھر سے لے کر آتا ہوں۔ لیکن

جب میں گھر پہنچا تو میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی حتیٰ کہ اس بات کو تین دن گزر گئے، تیسرے دن مجھے یاد آیا کہ میں نے تو حضور ﷺ کو فلاں جگہ رک کر انتظار کرنے کا کہا تھا۔ کہتے ہیں کہ میں بھاگم بھاگ اس جگہ پہنچا تو حضور ﷺ وہاں کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے شکایت کا صرف ایک ہی جملہ ارشاد فرمایا کہ عبد اللہ تم نے مجھے بہت پریشان کیا۔ فرمایا کہ تم مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ اس جگہ پر کھڑے ہو کر تمہارا اِنتظار کروں اور میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ تمہارے واپس آنے تک یہاں رکوں گا۔ ایفائے عہد کی اور وعدہ پورا کرنے کی یہ مثال دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔

اسی طرح حضور ﷺ کے ایک صحابی ہیں حذیفہ بن یمانؓ۔ دونوں باپ بیٹا صحابی تھے، باپ کا نام حسیل تھا لیکن یمنی ہونے کی وجہ سے لوگوں نے یمان نام رکھ دیا تھا، بنو غطفان کے قبیلے سے ان کا تعلق تھا۔ جنگ بدر سے پہلے یہ دونوں مسلمان ہو چکے تھے اور انہوں نے یہ باتیں سن رکھی تھیں کہ مکہ والوں کا مدینہ والوں سے مقابلہ ہونے والا ہے، چنانچہ دونوں باپ بیٹا اس نیت سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے کہ وہاں جاکر مدینہ والوں کے ساتھ مل کر مکہ والوں کے خلاف لشکر میں شریک ہوں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ راستے میں ابو جہل کا لشکر مل گیا جنہوں نے بھانپ لیا کہ یہ دونوں باپ بیٹا مدینہ والوں کے لشکر میں شریک ہونے جارہے ہیں۔ انہوں نے روک لیا کہ ہم تم دونوں کو محمد ﷺ کے لشکر میں شامل نہیں ہونے دیں گے۔ اِنہوں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی کہ ہم تو صرف مدینہ جارہے ہیں، اس پر ابو جہل کے لشکر والوں نے ان سے کہا کہ اگر تم محمد ﷺ کے لشکر میں شامل نہ ہونے کا وعدہ کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ انہیں بھی اس بات پر اعتماد تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی جو وعدہ کرتے ہیں پورا کرتے ہیں، چنانچہ اس وعدہ پر حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد حضرت یمانؓ کو چھوڑا۔

جب یہ وعدہ کر کے دونوں باپ بیٹا مدینہ منورہ پہنچے تو حضور ﷺ کا لشکر بدر کے لیے پیش قدمی کر رہا تھا۔ ملاقات پر انہوں نے حضور ﷺ سے ابو جہل کے لشکر کے ہاتھوں پکڑے جانے اور وعدہ پر رہائی کا سارا قصہ ذکر کر دیا۔ کیفیت دیکھئے کہ جناب نبی کریم ﷺ کو محاذ جنگ کے لیے ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی، بوڑھے اور بچے ملا کر ۳۱۳ لوگ ہوئے

تھے، نہ تلواریں پوری نہ گھوڑے پورے اور نہ کمانیں پوری۔ جبکہ دوسری طرف جنگ کے لیے ہر طرح کے سازو سامان سے لبریز کفار کا لشکر ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ لیکن جب حذیفہ بن یمانؓ نے حضور ﷺ کو بتایا کہ ہم ابو جہل کے لشکر سے وعدہ کر کے آئے ہیں کہ آپ کے لشکر میں شامل ہو کر ان کے خلاف نہیں لڑیں گے تب انہوں نے ہمیں چھوڑا ہے، اگر آپ ﷺ حکم دیں تو ہم اب بھی حاضر ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں! تم لوگوں کو لشکر میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہے بلکہ تم اپنا وعدہ نبھاؤ گے۔ یہ ہے ایفائے عہد اور وعدے کا پورا کرنا۔ حالت جنگ میں دشمن کے ساتھ وعدہ پورا کرنے کے لیے اپنی ضرورت کی اتنی بڑی قربانی دے کر جناب رسول اکرم ﷺ نے ایفائے عہد کی جو مثال پیش کی دنیا کی تاریخ ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ جب دشمن کے ساتھ تلواریں چل رہی ہوں تب اخلاق کی تکمیل کرنا تب وعدے اور سچائی کا لحاظ رکھنا، اس کا نام ہے اخلاقِ فاضلہ۔

خوش طبعی

حضرت عمرو بن العاصؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ دھاۃ العرب یعنی چوٹی کے سیاست دانوں میں سے تھے اور فاتح مصر تھے، ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرتؓ آپ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کی تفصیلات بیان کیجیے۔ فرمانے لگے سچی بات یہ ہے کہ میں خیال نہیں کر سکا، اس کی وجہ یہ بتائی کہ حضور ﷺ کی شخصیت کا رعب ہی اتنا تھا کہ کبھی اس بات کی ہمت نہیں ہوئی کہ نظر بھر کر حضور ﷺ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھ سکوں۔ لیکن اس خداداد ہیبت و رعب کے ساتھ ساتھ حضراتِ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضور ﷺ سے زیادہ نرم کلام کرنے والا نہیں دیکھا، آپ ﷺ خوش کلامی فرماتے تھے اور آپ کے چہرے پر تبسم رہتا تھا۔ آپ ﷺ جب بات کرتے تھے تو مسکراتے تھے، اس رعب و دبدبہ کے باوجود اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوش طبعی کا معاملہ بھی فرماتے تھے۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی طبیعت میں تکلف والا رعب نہیں تھا، آپ ﷺ خواہ مخواہ رعب نہیں جماتے تھے بلکہ آپ کی ہیبت اور دبدبہ خداداد تھا لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ حسب موقع خوش طبعی فرماتے تھے۔

زاہرؓ ایک دیہاتی صحابی تھے وہ آپ ﷺ کے لیے کبھی گاؤں سے کوئی تحفہ وغیرہ بھی بھیجا کرتے تھے، اسی طرح حضور ﷺ بھی انہیں کبھی کوئی تحفہ دیا کرتے تھے۔ زاہرؓ ایک دفعہ بازار میں تھے کہ حضور ﷺ نے جا کر پیچھے سے اس طرح جھینپ (دونوں بازوؤں میں جکڑ) لیا کہ وہ حضور ﷺ کو دیکھ نہ سکیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کون ہے؟ حضور ﷺ نے جواب نہیں دیا اس خیال سے کہ وہ خود ہی بوجھیں، چنانچہ دوسری یا تیسری دفعہ پوچھنے پر حضور ﷺ نے انہیں چھوڑا۔

اسی طرح آپ ﷺ کی خدمت میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ یارسول اللہ! میرے لیے دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت دے، آپ ﷺ نے فرمایا کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی جس پر وہ پریشان ہوگئی کہ میں تو دعا کے لیے آئی تھی لیکن حضور ﷺ یہ کیا خبر دے رہے ہیں؟ لیکن اس کی پریشانی دیکھ کر حضور ﷺ نے بتایا کہ سب لوگ جوان ہو کر جنت میں جائیں گے۔

ایسے ہی ایک شخص آیا اور حضور ﷺ سے درخواست کی کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے آپ مجھے بیت المال سے ایک اونٹ عنایت کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اچھا میں تمہیں اونٹ کا بچہ دے دیتا ہوں۔ وہ فکر مند ہو کر کہنے لگا یارسول اللہ! اونٹ کا بچہ لے کر میں کیا کروں گا مجھے تو سفر کے لیے سواری چاہیے؟ آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھئی ہر اونٹ کسی اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔

تواضع

اخلاق حسنہ میں تواضع ایک اچھی عادت ہے جبکہ تکبر ایک بری عادت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع کی تعریف اور تکبر کی مذمت فرمائی ہے۔ خیال فرمائیے کہ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر قابل احترام شخصیت کونسی ہوگی اور صحابہ کرامؓ سے زیادہ آپ ﷺ کا احترام کس نے کیا ہوگا؟ خود جناب نبی کریم ﷺ کی تواضع کا حال یہ تھا کہ انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مجلس میں تشریف لاتے تھے تو ہمارا جی

چاہتا تھا کہ ہم احتراماً کھڑے ہو جائیں لیکن ہم کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ حضور ﷺ کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ایک جگہ صحابہ کرامؓ گفتگو فرما رہے تھے جس میں حضرت یونس علیہ السلام کا حضور ﷺ کے ساتھ تقابل کے انداز میں تذکرہ ہو رہا تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا لا تفضلونی علی یونس بن متّٰی کہ مجھے اس طرح حضرت یونسؑ پر فضیلت مت دو۔

ایک بات تو عقیدے کی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ افضل الانبیاء ہیں، سارے نبیوں کے سردار ہیں اور سارے انبیاء میں برتر شخصیت ہیں۔ قرآن کریم بھی یہ کہتا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ لیکن آپ ﷺ نے دو انبیاء کا آپس میں اس طرح تقابل کرنے سے منع فرمایا کہ یہ دیکھنا شروع کر دیا جائے کہ فلاں پیغمبر میں یہ بات تھی اور فلاں میں نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح تقابل نہ کرو کہ جس سے کسی پیغمبر کی توہین کا پہلو نکلتا ہو یا جس سے کسی بزرگ کی تخفیف کا پہلو سامنے آتا ہو۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ کہ مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ چڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑھا چڑھا دیا تھا۔

حضراتِ محترم! جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے آیا ہوں اور دنیا کو اخلاق کا بہترین نمونہ دکھانے آیا ہوں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنی جماعت کو اخلاقِ فاضلہ کی تربیت دے کر دنیا کے سامنے بہترین اخلاق و عادات کا حامل ایک معاشرہ پیش کیا، یہ جناب نبی کریم ﷺ کا ایک بڑا معجزہ اور اعجاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ ﷺ کی سنت پر اور آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

سماجی خدمت اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

اسلام دین فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم ﷺ کو انسانی زندگی کے لیے جو نظامِ حیات دیا ہے وہ ایک فطری نظام حیات ہے، اس نظام کے کسی شعبے میں کوئی خلاء نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، جہاں یہ محسوس ہوتا ہو کہ اسلام میں اس کے متعلق ہدایات موجود نہیں ہیں، اسلام نے اگر کسی معاملے کے متعلق براہ راست ہدایات نہیں دیں تو ایسے اصول وضوابط دیے ہیں جن سے ان معاملات کا حل اخذ کیا جا سکتا ہے اور ان کے متعلق راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے، یوں انسانی زندگی کا کوئی شعبہ خدا و رسول کی رہنمائی اور ہدایت سے خالی نہیں رہنے دیا گیا۔

باہمی حقوق کی نوعیت

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی معاشرے میں رہنے والوں کے آپس کے حقوق بیان فرمائے ہیں، یہ حقوق دو نوعیت کے ہیں، پہلی نوعیت شخصی حقوق کی ہے جبکہ دوسری اجتماعی حقوق کی ہے۔ شخصی حقوق کا معنیٰ یہ ہے کہ ایک شخص کا دوسرے شخص پر کیا حق ہے، یعنی ماں کا حق بچے پر اور بچے کا حق ماں پر، میاں کا حق بیوی پر اور بیوی کا حق میاں پر، بھائی کا حق بہن پر اور بہن کا حق بھائی پر، اُستاد کا حق شاگرد پر اور شاگرد کا حق استاد پر، یہ شخصی حقوق ہیں جن کی تفصیلات رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں۔ اجتماعی حقوق کا معنیٰ یہ ہے کہ معاشرے کا انسان پر کیا حق ہے، سوسائٹی کا جو مشترکہ حق انسان پر ہے اسے سماجی خدمت یا سوشل ورک کہتے ہیں۔ معاشرہ اجتماعی طور پر جو انسان سے تقاضا کرتا ہے اس تقاضے کو پورا کرنا سماجی خدمت کرنا کہلاتا ہے۔ اس پیمانے پر دیکھا جائے تو حضرات انبیاء کرام

علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سے بڑھ کر اور کوئی سماجی خدمت گزار نہیں رہا اور پھر انبیاء میں سب سے بڑے سوشل ورکر جناب رسالت مآب ﷺ ہیں۔

حضور ﷺ بطور سماجی خدمت گزار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بالکل آغاز میں ہی آپ ﷺ کا تعارف ایک سوشل ورکر کے طور پر سامنے آتا ہے، جب حضرت جبریل علیہ السلام غارِ حرا میں پہلی وحی لے کر آئے تو یہ حضور ﷺ کے لیے ایک اچانک بات تھی، آپ ﷺ نے وحی تو قبول کر لی لیکن اِس غیر معمولی واقعہ کی وجہ سے آپ ﷺ کی طبیعت پر بے پناہ بوجھ تھا۔ پہلی وحی کے مراحل سے گزر کر آنحضرت ﷺ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے اِس تمام واقعہ کا ذکر کیا، ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جو جناب نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ تھیں اور قیامت تک دنیا کے مسلمانوں کی محترم ماں ہیں، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھ پر شخصی احسانات کرنے والی عورتوں میں سب سے بڑھ کر خدیجہؓ تھیں۔

حضرت خدیجہؓ بڑی سمجھ دار خاتون تھیں، حضور ﷺ نے گھر آ کر زوجہ محترمہ کو غارِ حرا کا یہ واقعہ سنایا اور ساتھ ہی پریشانی کا اظہار فرمایا جو کہ ایک طبعی اور فطری بات تھی، اس پر ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ نے پہلا ردِ عمل یہ ظاہر کیا، كَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَدًا خدا کی قسم! آپ تسلی رکھیے اللہ تعالیٰ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا اس واقعے میں آپ کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے اس کی وجہ بیان فرمائی اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِي الضَّيْفَ وَ تُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری ج اول، حدیث 3) کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس لیے ضائع نہیں ہونے دے گا کہ معاشرے میں آپ کی خدمات اور کارکردگی قابلِ تعریف وستائش ہیں، آپ صلہ رحمی کرنے والے ہیں، رشتوں کو جوڑنے والے ہیں، ٹوٹے ہوئے رشتوں کو ملانے والے ہیں، بیواؤں اور لاوارث لوگوں کا بوجھ اٹھانے والے ہیں، محتاجوں کو کما کر دینے والے ہیں، مہمانوں کی

مہمانداری کرنے والے ہیں اور لوگوں پر آنے والی مشکلات میں ان کی مدد کرنے والے ہیں۔ یعنی جو آدمی سوسائٹی کے حقوق ادا کرتا ہو اور معاشرے کے نادار لوگوں کا سہارا بنتا ہو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ضائع نہیں کرتے بلکہ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایک نبی کے طور پر جناب نبی کریم ﷺ کا پہلا تعارف ہی اس بات سے ہوا کہ آپ ﷺ بیواؤں، یتیموں، مسکینوں اور غریبوں کے کام آتے ہیں۔ چنانچہ سماجی خدمت سوسائٹی کا حق ہے، معاشرے کا یہ حق جناب نبی کریم ﷺ نے خود بھی ادا کیا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔

حضرت خدیجہؓ کے یہی الفاظ عرب قبیلے کے ایک سردار ابن الدغنہ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بارے میں کہے تھے، جب مکہ مکرمہ کے مسلمانوں پر مکہ کی زمین تنگ کر دی گئی، مشرکین مکہ نے تکلیفوں اور اذیتوں کی انتہا کر دی اور اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، حضرت ابو بکر صدیقؓ جو جناب نبی کریم ﷺ کے سب سے قریبی ساتھی تھے، وہ بھی معاشرے کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئے۔ انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مکہ میں زندگی گزارنا برداشت سے باہر ہو رہا ہے، اجازت ہو تو میں بھی ہجرت کر جاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے سامان باندھا اور ہجرت کے ارادے سے مکہ سے نکل گئے اور کچھ سفر بھی طے کر لیا۔ بنو قارہ کا سردار ابن الدغنہ جو عرب قبائل کے سرداروں میں ایک بڑا سردار تھا، وہ کسی سفر سے مکہ واپس آ رہا تھا، راستے میں اس کی حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملاقات ہو گئی، ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ بتایا کہ مکہ کے لوگوں نے جینا دوبھر کر دیا ہے، اس لیے مکہ سے ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔ خود نبی کریم ﷺ نے بھی ہجرت کی رات مکہ کی طرف منہ کر کے کہا تھا کہ اے میرے شہر! اے اللہ کے گھر والے شہر، تجھے چھوڑ کر جانے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن کیا کروں، اس شہر کے مکین یہاں رہنے نہیں دیتے۔ ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا، تیرے جیسے لوگ شہر نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر ابن الدغنہ نے وہی الفاظ حضرت صدیق

اکبرؓ سے کہے جو حضرت خدیجہؓ نے پہلی وحی کے بعد حضور ﷺ سے فرمائے تھے، انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتقری الضیف وتکسب المعدوم وتعین علی نوائب الحق۔ ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ تم میرے ساتھ واپس چلو، میں تمہاری ضمانت دوں گا، چنانچہ وہ انہیں ساتھ لے کر مکہ واپس آیا اور بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا کہ لوگو! میں بنو قارہ کا سردار ابن الدغنہ ہوں، ابو بکرؓ تمہاری اذیتوں کی وجہ سے شہر چھوڑ کر جا رہا تھا، مجھ سے برداشت نہیں ہوا، اس لیے میں اسے لے کر واپس آیا ہوں، اگر کسی کو ابو بکرؓ سے کوئی شکایت ہے تو وہ مجھ سے بات کرے، میں ابو بکرؓ کی ضمانت دیتا ہوں اور وہ میری پناہ میں ہے۔ پھر کہا کہ لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ابو بکر جیسا سماجی خدمت گزار تمہارے طرزِ عمل سے شہر چھوڑ کر جا رہا ہے۔ یعنی ابن الدغنہ نے کہا کہ سوشل ورکر تو کسی معاشرے کی آبرو ہوتا ہے، ایسے آدمی کو شہر چھوڑنے پر مجبور کرنا اس معاشرے کی بدبختی کی علامت ہے۔ چنانچہ چند روز تک حضرت صدیق اکبرؓ ابن الدغنہ کی پناہ میں رہے لیکن بعد میں حسب حالات حضرت ابو بکرؓ نے ابن الدغنہ کی یہ پناہ واپس کر دی۔

راستے کے حقوق

حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راستوں میں اور کھلی گزر گاہ میں مت بیٹھا کرو۔ بعض صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تو گھروں میں جگہ نہیں ہوتی، کوئی دوست وغیرہ ملنے آ جائے تو ہم باہر کھلی جگہ میں اس کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں یا راستے میں کسی جگہ پر اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر گھر سے باہر کھلی گزر گاہ میں بیٹھنا ضروری ہو تو پھر راستے کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ وما حق الطریق کہ انسانوں کے حق تو سنے تھے، یہ راستے کا حق کیا ہے؟ چنانچہ جناب نبی کریم ﷺ نے راستے کے حقوق بیان کیے۔ غَضُّ الْبَصَرِ وَكَفُّ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَغَيْرُ ذٰلِكَ۔ (بخاری ج1-2290)

پہلا حق یہ فرمایا کہ نگاہیں نیچے رکھو اور آنے جانے والوں پر تانک جھانک مت کرو۔

دوسرا حق یہ فرمایا کہ راستے میں اس طرح کھڑے ہو کر لوگوں کو اذیت مت دو کہ آنے جانے والوں کے لیے راستہ بند ہو جائے، اور اگر کوئی اذیت والی چیز راستہ میں دیکھو تو اسے ہٹادو۔

تیسرا حق یہ فرمایا کہ گزرنے والا مسلمان بھائی اگر سلام کرے تو اس کے سلام کا جواب دو۔

چوتھا حق یہ فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو یعنی راستے میں کوئی برائی ہوتے دیکھو تو اس کی ممانعت کا اہتمام کرو۔

پانچواں حق یہ فرمایا کہ کوئی شخص راستہ گم کر بیٹھے تو اس کی راہنمائی کرو۔

دین اسلام کی دعوت

جناب نبی کریم ﷺ نے راہنمائی کا دائرہ وسیع رکھا ہے کہ ایک غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دینا یہ بھی ایک مسلمان پر معاشرے کا حق ہے۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر صورتحال یہ تھی کہ قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے کافی دن گزر گئے تھے اور قلعہ فتح کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی، ایک دن نبی کریم ﷺ نے شام کے وقت اعلان فرمایا کہ میں کل لڑائی کا جھنڈا ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جس کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ خیبر کا قلعہ فتح کروائیں گے، اس کے ساتھ یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا کہ یحبہ اللہ ورسولہ کہ اس سے اللہ اور اس کے رسول کو محبت بھی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ وہ رات ہم سب نے ایسی گزاری کہ ہر صحابی کے دل میں یہ بات تھی کہ اللہ کرے کہ کل لڑائی کا جھنڈا مجھے ملے، فرماتے ہیں کہ مجھے زندگی بھر کبھی امارت کی خواہش نہیں ہوئی لیکن اس رات یہ خواہش میرے دل میں بھی تھی اس لیے کہ اس میں ایک تو رسول اللہ ﷺ نے فتح کی خوشخبری دی، دوسرا یحبہ اللہ ورسولہ فرمایا۔

صبح ہوئی، جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ علیؓ کو بلاؤ، حضور ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ تو بیمار ہیں اور ٹھیک طرح سے دیکھ بھی نہیں سکتے، حضرت علیؓ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

کہ علیؓ آج لشکر کی کمان تم کرو گے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! اس سے بڑی سعادت کی بات کیا ہو سکتی ہے لیکن میں تو ٹھیک طریقے سے دیکھ بھی نہیں سکتا، میری آنکھوں کا برا حال ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنا لعاب مبارک حضرت علیؓ کی آنکھوں پر لگایا جس سے اُن کی آنکھیں اسی وقت ٹھیک ہو گئیں۔ حضور ﷺ کا معجزہ دیکھیں کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہر سال گرمیوں میں میری آنکھیں خراب ہو جاتی تھیں لیکن اس کے بعد زندگی میں کبھی خراب نہیں ہوئیں۔ حضور ﷺ نے جب جھنڈا حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیا تو اس کے ساتھ ایک ہدایت فرمائی کہ جا کر پہلا کام یہ کرنا کہ انہیں اسلام کی دعوت دینا۔ پھر فرمایا کہ علیؓ اگر ایک آدمی بھی تمہاری وجہ سے اسلام میں داخل ہو جائے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں کی دولت سے بھی بہتر ہے، اس زمانے میں سرخ اونٹ سب سے بڑی دولت سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دینے کو معاشرے کا حق بتایا۔

اصلاحِ دین کی دعوت

ایک آدمی نیکی کے راستے پر نہیں چل رہا، جبکہ دوسرا آدمی برائی کے راستے پر چل رہا ہے، یہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ایک آدمی نیکی بھی نہیں کر رہا اور برائی بھی نہیں کر رہا لیکن اس میں نیکی کی صلاحیت موجود ہے، ایسے آدمی کو نیکی کے راستے پر چلانا دوسرے مسلمان کا حق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک مسلمان جو غلط راستے پر چل رہا ہے اسے صحیح راستے پر لانا بھی دوسرے مسلمان کا حق ہے، اگر اِس کی غفلت کی وجہ سے دوسرا مسلمان غلط راستے پر چلتا رہا تو یہ بھی قصور وار ٹھہرے گا۔

راستہ دکھانے میں نبی کریم ﷺ نے دو باتیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی بات یہ کہ کوئی شخص اپنے گھر کا یا اپنی منزل کا راستہ بھول جائے تو اسے صحیح راستے پر چلا دینا، دوسری بات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق بیان فرمائی کہ کوئی شخص نیکی اور بدی کے معاملے میں صحیح راستے پر نہ چل رہا ہو تو اسے صحیح راستے پر چلانا۔ رسول اللہ ﷺ نے راہنمائی کو سوسائٹی کا سب سے بڑا حق قرار دیا، یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق جہاں تک ممکن ہو یہ حق ادا کرے۔

ظلم سے روکنا

عبد اللہ بن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْمُسْلِمُ اَخُوالْمُسْلِمِ لَایَظْلِمُهٗ وَلَایُظْلِمُه کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ خود اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ وہ اسے دوسروں کے ظلم کے حوالے کرتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ کسی پر دوسروں کو ظلم کرنے دیتا ہے، معاشرے کے افراد کا ہم پر صرف یہ حق نہیں ہے کہ ہم ان پر ظلم نہ کریں بلکہ یہ بھی حق ہے کہ کہیں ظلم ہوتا ہو تو حسب استطاعت اسے روکیں۔ جناب نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا اُنصر اَخاك ظالما أو مظلومًا کہ تمہارا بھائی ظالم ہو یا مظلوم، اس کی مدد کرو۔ پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے کہ اسے ظالم کے ظلم سے بچائیں لیکن ظالم کی مدد کا کیا معنیٰ ہے؟ فرمایا، ظالم بھائی کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم کرنے سے روکو۔

حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاد رکھو! جو شخص کسی دوسرے مسلمان بھائی کی ضرورت کو پورا کرے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، پھر فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان بھائی کی مشکل میں اس کے کام آئے، اللہ تعالیٰ اس کی اپنی مشکل آسان فرمادیتا ہے۔ پھر فرمایا، جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب پر پردہ ڈالیں گے۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے غیبت کی مذمت فرمائی کہ غیبت بری چیز ہے جبکہ قرآن کریم نے غیبت کو اپنے مردار بھائی کا گوشت کھانا قرار دیا ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! اگر اس شخص میں وہ عیب ہو کیا تب بھی اس کا تذکرہ منع ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، اسی کا نام تو غیبت ہے۔ ایک آدمی میں کوئی عیب ہو اور آپ بلا ضرورت اس کا تذکرہ کریں، یہی تو غیبت ہے۔ لیکن اگر آپ کسی آدمی کے ایسے عیب کا تذکرہ کریں گے جو اس میں نہیں ہے، یہ تو بہتان ہو جاتا ہے۔

جناب نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے باہمی حقوق کے متعلق ایک حدیث قدسی کا ذکر فرمایا۔ حدیث قدسی اسے کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی بات کا

مفہوم روایت کریں۔ حدیث قدسی اور قرآنی آیات میں یہی فرق ہے کہ قرآن کریم میں بات بھی اللہ تعالیٰ کی ہے اور الفاظ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، جبکہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو حضور ﷺ اپنے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں یعنی ان الفاظ کا اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے ایک بندے سے ارشاد فرمائیں گے کہ اے میرے بندے! میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کیوں نہیں کھلایا؟ بندہ کہے گا کہ یا اللہ! آپ اور بھوک؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہاں تمہارے پڑوس میں ایک آدمی بھوکا تھا اس کے لیے میں نے تم سے کھانا مانگا تھا تم نے اسے کھانا نہیں کھلایا، اسے کھلانا دراصل مجھے ہی کھلانا تھا۔ تم نے اپنے اڑوس پڑوس میں یہ خیال ہی نہیں کیا کہ کون بھوکا ہے اور کس کو کھانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک شخص سے فرمائیں گے کہ میں بیمار تھا تم نے میری بیمار پرسی نہیں کی۔ بندہ کہے گا یا اللہ! آپ بیمار تھے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہاں تمہارے پڑوس میں تمہارا فلاں بھائی بیمار تھا تم نے اس کی عیادت نہیں کی۔ میں نے تمہیں بیمار پرسی کا حکم دیا تھا تم اس کی عیادت کرتے تو دراصل میری عیادت کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک شخص سے فرمائیں گے کہ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ کہے گا یا اللہ! آپ اور پیاس؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تمہارے محلے میں فلاں شخص پیاسا تھا اسے پینے کا پانی میسر نہیں تھا تم نے اس کی اِس ضرورت کا خیال نہیں رکھا، تم اسے پانی پلاتے تو دراصل مجھے پانی پلاتے۔

خیال فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے معاشرتی حقوق کو کس انداز سے بیان فرمایا ہے اور لوگوں کے آپس کے حقوق کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدر اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ بھوکوں، بیماروں اور پیاسوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ نے تو یوں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی پیاسے کو پانی پلایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے حوضِ کوثر سے میرے ہاتھوں پانی پلائے گا، جس نے کسی بھوکے کو کھانا کھلایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے جنت کے میوے کھلائیں گے۔ مشکل میں کسی کے کام آنا، کسی مقروض کا قرضہ ادا کرنا، کسی بیمار کی دوا کا خرچہ برداشت کرنا، کسی الجھن کے شکار فرد کے ساتھ بات چیت کر کے اس کی کوئی الجھن دور کرنا، یا کسی بھی نوعیت کی مشکل آسان کرنا، ان سب کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بے حد اجر و ثواب ہے۔

انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا طرزِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول بیان فرمایا کہ قیامت کے دن کے بارے میں ہر آدمی کو اللہ تعالیٰ سے اپنے ساتھ کسی خاص سلوک کی توقع ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے اس طرح کا معاملہ فرمائیں گے۔ حضور ﷺ نے ایک بڑا جامع جملہ ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو خدا کی مخلوق کے ساتھ جو طرزِ عمل تمہارا ہو گا، خدا کا وہی طرزِ عمل تمہارے ساتھ ہو گا۔ یعنی تم لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈالو گے خدا تمہارے عیبوں پر پردہ ڈالے گا، تم لوگوں کی غلطیاں معاف کرو گے خدا تمہاری غلطیاں معاف کرے گا، تم لوگوں کی گردنیں بوجھ سے چھڑواؤ گے اللہ تعالیٰ تمہاری گردن سے بوجھ ہٹا دے گا، تم بھوکوں کو کھلاؤ گے اللہ تعالیٰ تمہاری بھوک دور کر دیں گے۔ گویا رسول اللہ ﷺ نے یہ اصول بیان فرما دیا کہ تمہارا جو طرزِ عمل اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہو گا، اللہ تعالیٰ سے بھی اسی طرزِ عمل کی توقع رکھنا، اور پھر مخلوق سے مراد صرف مسلمان نہیں ہیں۔ آپس کے حقوق بیان فرماتے ہوئے حضور ﷺ نے ایک عجیب ترتیب بتائی۔

پڑوسی کے حقوق

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پڑوسی تین قسم کے ہیں:

ایک وہ جو تمہارا پڑوسی بھی ہے، مسلمان بھی ہے اور رشتہ دار بھی ہے، ایسے شخص کے تم پر تین حق ہیں: پڑوسی کا حق، مسلمان بھائی ہونے کا حق اور صلہ رحمی کا حق۔

دوسرا وہ جو تمہارا رشتہ دار تو نہیں لیکن مسلمان ہے اور پڑوسی ہے، اس کے تم پر دو حق ہیں: مسلمان بھائی ہونے کا حق اور پڑوسی ہونے کا حق۔

پھر اس شخص کا حق جو مسلمان بھی نہیں اور رشتہ دار بھی نہیں، لیکن اس کا بھی پڑوسی ہونے کا تم پر حق ہے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ کسی خوشی کے موقع پر حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کے گھر والوں نے ایک بکری ذبح کی، گوشت پکایا اور محلے میں تقسیم کیا۔ حضرت عبد اللہؓ جب گھر تشریف لائے تو پوچھا کہ ہمارے فلاں یہودی پڑوسی کو آپ لوگوں نے گوشت بھیجا ہے یا نہیں؟ گھر والوں نے جواب دیا کہ اس پڑوسی کو بھیجنا تو یاد نہیں رہا، حضرت عبد اللہؓ نے اس پر ناراضگی ظاہر کی اور فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں کیا فرمایا ہے؟ پھر ایک حدیث نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَا زَالَ جِبْرِیْلُ یُوْصِیْنِیْ بِالْجَارِ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّہٗ سَیُوَرِّثُہٗ او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم کہ جبریل علیہ السلام بار بار مجھے پڑوسیوں کے بارے میں متعین کرتے رہے حتیٰ کہ میں نے خیال کیا کہ وہ انہیں وارث قرار دینے کا حکم لے آئیں گے۔

ایک حدیث کے مطابق جناب رسول اللہ ﷺ نے پڑوسیوں کے حقوق میں یہاں تک ارشاد فرمایا کہ اگر گوشت پکایا ہے تو شوربہ زیادہ کر لو اور پڑوسی کا خیال کرو، اکیلے مت کھاؤ۔ ایک اور حدیث میں فرمایا لَیْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یَبِیْتُ شَبْعَانَ وَجَارُہٗ جَائِعٌ فِیْ جَنْبِہٖ وَھُوَ یَعْلَمُہٗ کہ وہ شخص مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں ہے جو خود تو رات کو پیٹ بھر کر سوئے، لیکن اس کا پڑوسی بھوکا سوئے۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ گھر میں اگر کھانے کے لیے پھل لے کر آؤ تو اس میں سے اپنے پڑوسی کو بھی بھجواؤ، اگر نہیں بھجوا سکتے تو اپنے بچوں کو پھل لے کر باہر مت آنے دو، پڑوسی کے بچے دیکھیں گے تو وہ اپنے باپ سے ویسا پھل کھانے کی ضد کریں گے، اور اگر اُس غریب کی استطاعت سے باہر ہو گا تو بچوں کو مایوسی ہو گی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ چھلکے باہر مت پھینکو، پڑوسی کے بچے دیکھیں گے تو اپنے ماں باپ کو تنگ کریں گے۔

پڑوس کی حد کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک دن پوچھ لیا کہ یا رسول اللہ! آپ پڑوس کے حقوق بیان فرماتے ہیں، پڑوس کی کیا حد ہے؟ فرمایا چالیس گھروں تک۔ بعض محدثین نے آسانی فرما دی کہ کل چالیس گھر یعنی ہر طرف سے دس دس گھر لیکن بعض محدثین کہتے ہیں کہ دونوں اطراف میں چالیس چالیس گھر۔

جائز سفارش

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشکل وقت میں لوگوں کے کام آنا بظاہر معاشرے کا حق ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا حق بتایا ہے۔ کوئی آدمی کسی مشکل اور پریشانی میں ہو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اس کی یہ مصیبت دور کی جائے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ اگر خود نہیں کر سکتا تو کسی ایسے شخص سے سفارش کر دے جو یہ کام کر سکے۔ قرآن کریم نے اس بارے میں فرمایا ہے مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (سورۃ النساء: ۸۵) کہ جس نے کسی کی اچھے کام میں سفارش کی اس کا ثواب میں حصہ ہوگا اور جس نے کسی کی برے کام میں سفارش کی اس کے گناہ کا اس پر بھی بوجھ ہوگا۔

اچھی سفارش سے مراد یہ ہے کہ آدمی ضرورت مند ہو اور اس کی حاجت جائز ہو، غلط سفارش سے مراد یہ ہے کہ آدمی ضرورت مند نہیں ہے یا یہ کہ اس کی حاجت غیر قانونی اور ناجائز ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ خود سفارش کی تلقین فرمایا کرتے تھے، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اگر کام لے کر آئے تو اس کی سفارش کیا کرو، فرمایا فیصلہ تو میں نے وہی کرنا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوتا ہے لیکن تم کیوں ثواب سے محروم ہوتے ہو؟

رسول اللہ ﷺ خود بھی سفارش کیا کرتے تھے، جب حضرت جابرؓ کے والد فوت ہوئے تو یہ آٹھ بہنوں کے اکیلے کفیل تھے اور یہودیوں کے مقروض تھے۔ ایک باغ اور کچھ زمین تھی جس پر پھل اور فصل اگائی ہوئی تھی جب فصل کٹنے کا وقت آیا تو یہودیوں نے کہہ دیا کہ ہم تمہیں فصل نہیں اٹھانے دیں گے پہلے ہمارا قرضہ واپس کرو۔ جبکہ قرضہ اتنا تھا کہ ساری فصل اٹھا کر بھی قرضہ نہ چکایا جا سکتا۔ اب اگر ساری فصل وہ لے جاتے تو حضرت جابرؓ کے گھر کے لیے کیا بچتا؟ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ یا رسول اللہ! ایک تو باپ کی وفات کا صدمہ ہے دوسرا آٹھ بہنیں ہیں جن کی

کفالت کا بوجھ ہے اور اب تیسرا اس قرضہ کی پریشانی نے آن گھیرا ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے ان یہودی افراد کے پاس حضرت جابرؓ کی سفارش کی کہ اللہ کے بندو! یہ مجبور آدمی ہے اگر تم اسے سہولت دو تو یہ قسط وار تمہارا قرضہ ادا کر دے گا لیکن تم اسے ساری فصل سے محروم نہ کرو، اس نے سال کا خرچہ بھی گھر میں رکھنا ہے اور بہنوں کی کفالت بھی کرنی ہے۔ لیکن یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کی سفارش ماننے سے انکار کر دیا کہ اس کے باپ نے ہم سے قرضہ لیا تھا ہم تو جابرؓ سے وہ قرضہ لے کر ہی رہیں گے۔ اس پر شانِ رسالت جوش میں آگئی، آپ ﷺ نے جابرؓ سے فرمایا کہ اپنے باغ کا سارا پھل کاٹ کر ڈھیر لگا دو اور اس پر کپڑا بچھا دو پھر سب قرض داروں کو بلاؤ کہ آ کر اپنا قرضہ لے جائیں، چنانچہ حضرت جابرؓ نے ایسا ہی کیا۔ جناب نبی کریم ﷺ اس موقع پر تشریف لے گئے اور پوچھا کیا سب قرض دار آ گئے ہیں؟ جابرؓ نے بتایا، جی آ گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب چادر کے نیچے سے کھجوریں نکالتے جاؤ اور قرض داروں کو دیتے جاؤ۔ حضرت جابرؓ نے کھجوریں نکال کر دینا شروع کر دیں یہاں تک کہ سب قرض داروں کا قرضہ ادا ہو گیا، اس کے بعد چادر اٹھا کر دیکھا تو پھلوں کا ڈھیر ویسا کا ویسا تھا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔

جناب نبی کریم ﷺ نے سفارش کی تلقین بھی فرمائی اور اس کا اجر بھی بتایا، کسی آدمی کی کوئی ضرورت ہے جسے پورا کرنے کا طریقہ اُسے معلوم نہیں ہے یا متعلقہ محکمہ یا دفتر تک اس کی رسائی نہیں ہے جبکہ آپ اس کے معاون بن کر، اسے مطلوبہ معلومات مہیا کر کے، متعلقہ محکمہ سے اس کی واقفیت کروا کر، اسے متعلقہ آدمی سے ملوا کر اُس کا کام کروا دیتے ہیں تو یہ سفارش یا معاونت کہلاتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک اور صحابیؓ کے لیے بھی سفارش کی تھی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے اپنی لونڈی بریرۃؓ کو آزاد کر دیا، وہ ایک صحابی مغیثؓ کے نکاح میں تھی۔ شریعت میں آزاد ہونے والی لونڈی کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ پہلے خاوند کے نکاح میں رہے یا اسے ختم کر دے، خیر آج کے دور میں نہ تو غلامی کا تصور پایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی شرائط موجود ہیں۔ آزادی کے بعد بریرۃؓ نے اعلان کر دیا میں مغیثؓ سے اپنا نکاح

فسخ کرتی ہوں، مغیثؓ کو اس پر بے حد پریشانی ہوئی۔ روایات میں آتا ہے کہ مغیثؓ گلیوں میں روتے پھرتے تھے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ خدا کے لیے کوئی میری بریرہؓ سے سفارش کرے۔ حتیٰ کہ جناب نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ بریرہؓ سے میری سفارش کر دیں۔ حضور ﷺ نے بریرہؓ کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے مغیثؓ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے؟ بریرہؓ نے جواب دیا، جی کر لی ہے، اس لیے کہ شریعت مجھے اس کا حق دیتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اگر تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر کے مغیث کے پاس واپس چلی جاؤ تو کیا حرج ہے؟ بریرہؓ نے اس پر حضور ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ حضور ﷺ نے فرمایا، مشورہ ہے۔ بریرہؓ نے جواب دیا، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر یہ مشورہ ہے تو مجھے منظور نہیں ہے۔

سفارش بھی معاشرے میں ضرورت مندوں کے کام آنے والا ایک ذریعہ ہے اور جناب نبی کریم ﷺ نے اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے، آپ نے اس کی تلقین بھی فرمائی لیکن جائز کاموں میں شفاعت حسنہ۔ کوئی اگر کسی کے جائز کام میں سفارش کرے گا تو ثواب میں شریک ہو گا لیکن اگر کسی ناجائز کام میں سفارش کرے گا تو گناہ میں حصہ دار ہو گا۔

جھگڑنے والوں میں صلح کروانا

معاشرے کی ایک اور بڑی خدمت یہ ہے کہ روٹھے ہوئے لوگوں کو آپس میں ملا دینا۔ جھگڑنے والوں کی آپس میں صلح کرانا بھی ایک سماجی خدمت ہے، قرآن کریم میں ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (سورۃ الحجرات ۱۰) کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں، اگر آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کراؤ۔ دو آدمی، دو خاندان، یا دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کروانا بھی معاشرے کا حق ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں بہت سے مواقع پر جھگڑنے والوں کی آپس میں صلح کروائی، اس کی ایک یادگار مثال تو آپ کی نبوت سے پہلے کی ہے جب آپ نے عرب قبائل کے درمیان صلح کروائی۔

عرب قبائل کے درمیان صلح کا یادگار واقعہ روایات میں آتا ہے کہ خانہ کعبہ کا غلاف اور اس کے دروازے کسی عورت کی بے احتیاطی سے جل گئے، چنانچہ عرب قبائل نے خانہ کعبہ کی پرانی عمارت گرا کر نئی عمارت بنانے کا فیصلہ کیا۔ ابو جہل جو کہ ایک بڑا سردار تھا، اس نے اعلان کیا کہ اللہ کے گھر کی تعمیر کے لیے چندے کی رقم میں چوری، شراب، سود، جوے، بدکاری، اور کسی بھی قسم کی حرام کمائی کے پیسے قبول نہیں کیے جائیں گے، جس نے چندہ دینا ہے صرف حلال کی کمائی میں سے دے۔ یہ جو کعبہ کے باہر حطیم کا نامکمل حصہ ہے، مورخین اس کی وجہ یہی بتاتے ہیں کہ حلال کمائی کے اتنے پیسے جمع ہی نہیں ہو سکے کہ پورے خانہ کعبہ کی تعمیر ہو سکتی۔

چنانچہ بیت اللہ کی تعمیر کا آغاز ہوا اور جب حجرِ اسود کے نصب کرنے کی باری آئی تو وہ قبائل جھگڑ پڑے ہر قبیلے کا مطالبہ تھا کہ ہمارے قبیلے کا سردار حجرِ اسود کو نصب کرے گا، شام تک یہ لوگ اس بات پر آپس میں جھگڑتے رہے۔ شام کو ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ جھگڑا یہیں رہنے دو صبح کے وقت جو آدمی سب سے پہلے بیت اللہ میں آئے گا وہ ہمارا حکم ہو گا اسی سے ہم اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروائیں گے۔ صبح انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ سب سے پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے سارے خوش ہو گئے کہ الصادق الامین آگیا۔ آپ ﷺ پر سب کا اعتماد تو پہلے سے تھا، انہوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ ہمارے اس جھگڑے کا فیصلہ کریں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک چادر لے کر آؤ، چادر لائی گئی، آپ ﷺ نے حجرِ اسود کو اٹھا کر اُس چادر میں رکھا، پھر فرمایا کہ تمام قبیلوں کے سردار آ کر یہ چادر پکڑیں اور اسے اٹھا کر اُس جگہ کے قریب لے جائیں جہاں حجرِ اسود نے نصب ہونا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اُس کے بعد حضور ﷺ نے چادر سے حجرِ اسود اٹھا کر اُس کی جگہ پر نصب کر دیا۔ آپ ﷺ نے صلح کے عمل کے بارے میں فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس عمل کی برکت سے گناہ معاف فرما دیں گے۔

ایک دفعہ حضور ﷺ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور حضرت حسنؓ جو اس وقت چند سال کے چھوٹے بچے تھے سامنے کھیل رہے تھے، کھیلتے کھیلتے کسی وجہ سے گر گئے۔

حضور ﷺ نے دیکھا تو آپ ﷺ سے رہا نہ گیا آپ ﷺ منبر سے اترے، جا کر حسنؓ کے کپڑے جھاڑے گود میں اٹھایا اور انہیں ساتھ لے کر منبر پر کھڑے ہو گئے اور اسی طرح خطبہ ارشاد فرمانا شروع کر دیا۔ فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے، پھر فرمایا وسیصلح اللہ بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین کہ اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے کی وجہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروائے گا۔ یہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کی مصالحت کی طرف اشارہ تھا اور پیشگوئی تھی جو پوری ہوئی اور حضرت حسنؓ کی دست برداری کی وجہ سے پوری امت حضرت معاویہؓ کی خلافت پر متفق ہو کر ایک بار پھر متحد ہو گئی۔ جھگڑے کو نمٹانا اور صلح کرانا یہ بھی سماج کی خدمت ہے اور معاشرے کا حق ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب ایک مسلمان ملے تو سلام کرو، کوئی دوسرا اسلام کرے تو اس کا جواب دو، کوئی دعوت کرے تو قبول کرو، ہر مسلمان کی خیر خواہی کرو، خیر کی بات اور خیر کا عمل کرو، کوئی بیمار ہو تو عیادت کرو، کوئی چھینک مار کر الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہو، کوئی مسلمان بھائی فوت ہو جائے تو جنازے میں شریک ہو، یہ سب آپس کے حقوق ہیں۔

آج کی گفتگو کا عنوان تھا کہ سماجی خدمت بھی معاشرے کا حق ہے یعنی ضرورت مندوں کے کام آنا، لوگوں کی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹانا، بیواؤں یتیموں مسکینوں کی کفالت کرنا اور نادار لوگوں کی مدد کرنا، یہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے اجر و ثواب کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

خواتین کی معاشرتی حیثیت اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

آج دنیا میں خواتین کی معاشرتی حیثیت کے حوالے سے بہت کچھ کہا جارہا ہے۔ خواتین کا معاشرتی مقام کیا ہے، ان کے حقوق و فرائض کیا ہیں، انفرادی و اجتماعی معاملات میں ان کی رائے کی کیا حیثیت ہے اور مردوں کے ساتھ ان کی مساوات کا درجہ کیا ہے۔ آج پوری دنیا میں یہ موضوع زیرِ بحث ہے، اس پر مقالات لکھے جارہے ہیں، کتابیں چھپ رہی ہیں اور خواتین کی کانفرنسز منعقد ہو رہی ہیں جن کا موضوعِ گفتگو یہ ہے کہ مختلف معاشروں میں خواتین کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی ہیں اور انہیں اپنے معاشروں میں وہ حیثیت نہیں دی جارہی جس کی وہ مستحق ہیں۔ اس موضوع پر ہونے والی گفتگو میں بالخصوص اسلام کے احکام و قوانین پر سب سے زیادہ تنقید کی جارہی ہے کہ اسلام نے عورت کو وہ مقام نہیں دیا جو اسے ملنا چاہیے۔

انسانی زندگی ایک مشین کی مانند ہے جبکہ مرد و عورت اس کے دو کلیدی پرزے ہیں۔ دنیا میں اصول یہ ہے کہ جو کمپنی ایک مشینری بناتی ہے وہ اس کے استعمال کے لیے ہدایات بھی دیتی ہے اس لیے کہ جس کمپنی نے مشینری بنائی ہے وہی اس کی قوت اور کارکردگی کو زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ پھر جن لوگوں تک وہ مشینری پہنچتی ہے وہ ان ہدایات کی پیروی کرتے ہوئے اُسے استعمال میں لاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کی اس مشینری کا خالق ہے اور وہی اس کی کارکردگی اور نظم و ضبط کو سمجھتا ہے، اِس مشینری کی خوبیاں، اس کی کمزوریاں اور اِس کی دیکھ بھال کے تقاضے وہی جانتا ہے۔ چنانچہ ہمارا اس بات پر بھی ایمان ہے کہ انسانی زندگی کو چلانے کے جو قواعد و ضوابط اللہ تعالیٰ نے آسمانی وحی کے ذریعے طے فرما دیے ہیں وہی فطری اور صحیح ہیں۔

دورِ جاہلیت میں خواتین کی معاشرتی حیثیت

جناب نبی کریم ﷺ نے معاشرے میں خواتین کو کیا مقام دیا اور حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے معاشرے میں خواتین کی حیثیت میں کیا فرق آیا؟ اس کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ جب اللہ تعالیٰ کے نبی کے طور پر مبعوث ہوئے تو اس وقت معاشرے میں خواتین کی کیا حالت تھی۔ دورِ جاہلیت کے معاشرے میں عورت کی حالت یہ تھی کہ اس کی پیدائش پر شرمندگی محسوس کی جاتی تھی اور صدمے کا اظہار کیا جاتا تھا۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۔ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ (سورۃ النحل: ۵۸۔۵۹) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری دی جائے، اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غمگین ہو جاتا ہے (۵۸) اس خوشخبری کی برائی کے باعث لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، کہ آیا اسے ذلت کے ساتھ قبول کر کے رہنے دے یا اس کو مٹی میں دفن کر دے، دیکھو کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں (۵۹)۔

عرب معاشرے کی عام صورتحال یہ تھی کہ جب کسی کو یہ خبر دی جاتی تھی کہ تمہارے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کا چہرہ شرم کے مارے سیاہ ہو جاتا تھا، وہ اس کیفیت میں آجاتا تھا کہ کس طرح اپنے غصے اور بے عزتی کو چھپاؤں، اس خبر کی شرمندگی سے بچنے کے لیے وہ اپنا منہ چھپاتا پھرتا تھا اور پھر اِس سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ اس لڑکی کو ذلت کے ساتھ ساری زندگی برداشت کروں یا اسے ابھی سے دفن کر دوں۔ اس وقت کی عورت کی معاشرتی حیثیت یہ تھی کہ اکثر و بیشتر لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں کہ ان کا گھر مین رہنا گھر کے سربراہ کے لیے باعثِ عار اور ذلت کی بات سمجھا جاتا تھا۔

احادیث میں ایسے بہت سے واقعات آتے ہیں کہ لوگوں نے دورِ جاہلیت میں اپنی بچیوں کو زندہ دفن کرنے کا جناب نبی کریم ﷺ کے سامنے اعتراف کیا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ ہم دورِ جاہلیت میں فی الواقع عورت کو حقیر جانتے تھے کہ یہ ایک

استعمال اور غلامی کی چیز ہے اور یہ کہ اس کا معاشرے میں کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ ہمیں تو رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ مرد کی طرح عورت بھی معاشرے کا ایک قابل احترام فرد ہے، رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے ہمیں پتہ چلا کہ ایک عورت بھی انسان کی حیثیت سے اسی طرح حقوق رکھتی ہے جس طرح ایک مرد حقوق رکھتا ہے۔

مرد و عورت کے رشتے اور اسوۂ نبوی ﷺ

عورت اور مرد کے چار بنیادی رشتے ہیں۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا رشتہ۔

حضور ﷺ کا ماں کے ساتھ رشتہ: رسول اللہ ﷺ کی حقیقی والدہ تو آپ کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں لیکن حضور ﷺ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ مسلمان اور صحابیہ ہوئی ہیں، ان کے خاوند حضرت ابو کبشہؓ حضور ﷺ کے رضاعی باپ تھے، وہ بھی مسلمان اور صحابیؓ ہوئے ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ کی والدہ آپ سے ملنے کے لیے آئیں تو آپ ﷺ نے ان کے لیے اپنی چادر زمین پر بچھائی، اس پر اماں جان کو بٹھایا اور خود ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے بتایا کہ عورت کا جو بھی رشتہ ہو، اس کے ساتھ اس کے مطابق رویہّ رکھا جائے۔ بیٹی لاڈ اور شفقت کی مستحق ہے، بہن محبت و عزت کی مستحق ہے، بیوی پیار و حُسنِ سلوک کی مستحق ہے اور ماں خدمت و احترام کی مستحق ہے۔

حضور ﷺ کا بہن کے ساتھ رشتہ: جناب نبی کریم ﷺ کا نہ تو کوئی بھائی تھا اور نہ کوئی بہن۔ محدثین بیان فرماتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں گرفتار ہونے والوں کو پہلے تو قیدی بنایا لیکن جب بنو ھوازن کے وفد کے آنے پر حضور ﷺ نے سب کو رہا کر دیا۔ ان رہا ہونے والے قیدیوں میں سے ایک خاتون نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں اور کہا کہ میں آپ کی بہن ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میری بہن کیسے ہو، میری تو کوئی بہن نہیں ہے۔ خاتون کہنے لگی کہ جناب میں نے اور آپ نے حلیمہ سعدیہؓ کا دودھ پیا ہے، آپ کو شاید یاد نہیں ہے کہ آپ ﷺ اور میں بچپن میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ پھر خاتون نے حضور ﷺ کو یاد

دلانے کے لیے بتایا کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے میری کمر پر دانت گاڑ دیے تھے جس کا نشان ابھی بھی موجود ہے، کیا میں آپ کو زخم کا وہ نشان دکھادوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہاں تم میری بہن ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب کہ دودھ کا رشتہ بھی ایسے ہی ہے جیسے نسب کا رشتہ ہے۔

جو چیزیں نسب سے حلال یا حرام ہوتی ہیں، وہی چیزیں رضاعت سے بھی حلال یا حرام ہو جاتی ہیں۔ جب یہ بات طے ہو گئی کہ وہ خاتون رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن ہے تو حضور ﷺ نے خاتون سے فرمایا کہ اگر تم اپنے بھائی کے ساتھ جانا چاہو تو میرے ساتھ مدینہ منورہ چلو، تمہارا بھائی تمہاری کفالت کرے گا، لیکن اگر تم واپس جانا چاہو تو میں تمہیں خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجوں گا۔ خاتون نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس خاتون کو اپنی بہن ہونے کا اعزاز دیا اور ایک دستہ کے ساتھ تحائف دے کر رخصت کیا کہ میری بہن کو اس کے گھر پہنچا کر آؤ۔

حضور ﷺ کا بیوی کے ساتھ رشتہ :جناب نبی کریم ﷺ کی کل ۱۱ جبکہ بیک وقت ۹ بیویاں تھیں۔ علمائے امت اِس میں ایک حکمت تو یہ بتاتے ہیں کہ اس وقت عرب قبائل کو سیاسی و معاشرتی طور پر اپنے ساتھ جوڑنے کے لیے ان قبائل کے ساتھ یہ ازدواجی رشتے قائم کرنا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ دوسری حکمت یہ بتاتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کے گھر میں مختلف عمروں اور مزاجوں کی عورتیں جمع کر کے خواتین کے متعلق احکام و قوانین کی تعلیم کے بارے میں آپ ﷺ کے لیے سہولت پیدا فرمادی۔ ورنہ جناب نبی کریم ﷺ نے پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کے ساتھ پہلا نکاح کیا تو اس وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس تھی۔ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ پچیس سال تک تنہا آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ رہیں اور آپ ﷺ پچاس برس کے تھے جب حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ باقی ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، ام حبیبہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت زینب ام المساکینؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ شامل ہیں۔

آپ ﷺ کا اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ معاملہ کیسا تھا؟ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سوائے میدان جنگ کے، اپنی ساری زندگی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، نہ کسی بیوی پر، نہ کسی خادم پر اور نہ کسی غلام پر۔ ازواجِ مطہرات کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کی شہادت دیتے ہوئے حضور ﷺ خود فرماتے ہیں خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب سے اچھا ہوں۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تقریباً دس سال حضور ﷺ کی خدمت کی۔ حضرت انسؓ ۱۰ سال کی عمر میں حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور حضور ﷺ کے وصال کے وقت ان کی عمر ۲۱ برس تھی۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ذاتی خادم کی حیثیت سے حضور ﷺ کی خدمت میں تقریباً دس سال گزارے لیکن کبھی رسول اللہ ﷺ کو کسی پر ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔

حضور ﷺ کا بیٹی کے ساتھ رشتہ :رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیمات سے بتایا کہ بیٹی شفقت کی مستحق ہے، رسول اللہ ﷺ کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ جب حضور ﷺ سے ملنے آتی تھیں تو آپ ﷺ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے، یہ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے لیے آپ ﷺ کی شفقت کا اظہار تھا۔ نبی کریم ﷺ نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے والے عربوں کے اس معاشرے میں اپنی چاروں بیٹیوں کی پرورش کی، ان کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور دُنیا کو یہ دکھایا کہ بیٹیوں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا جاتا ہے۔

محدثین فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا کوئی بیٹا جوان نہیں ہوا جبکہ چاروں بیٹیاں جوان ہوئیں اور ان چاروں کی شادیاں ہوئیں۔ حضور ﷺ کے کسی بیٹے کے جوان نہ ہونے کے بارے میں محدثین یہ حکمت بیان فرماتے ہیں کہ اِس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بادشاہت اور ولی عہد کے تصور کی نفی کرنا مقصود تھی۔ حضور ﷺ کا کوئی بیٹا جوان ہوتا تو حضور ﷺ کے وصال کے بعد لامحالہ ولی عہد کے طور پر چُن لیا جاتا اور یوں نسل در نسل بادشاہت کا یہ

سلسلہ چل نکلتا۔ آپ ﷺ کی چاروں بیٹیوں کے جوان ہونے اور پھر ان کی شادیاں ہونے کے بارے میں محدثین یہ حکمت بیان فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو یہ تعلیم دینا مقصود تھی کہ بیٹیاں باعثِ شرمندگی نہیں بلکہ قابلِ شفقت ہوتی ہیں۔

عورت کا اپنے حق میں آواز اٹھانا

قرآن کریم کی سورۃ المجادلہ اسی بارے میں نازل کی گئی کہ ایک عورت نے نبی کریم ﷺ کے سامنے آکر اپنے حق میں آواز اٹھائی۔ 'مجادلہ' کا لفظی معنٰی ہے 'جھگڑا'۔ ایک عورت نے نبی کریم ﷺ سے آکر اپنے خاوند کے طلاق کے الفاظ کے متعلق بات کی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے 'جھگڑے' کے نام سے ہی سورۃ نازل فرمادی، یہ عورت حضرت اوس بن ثابت انصاریؓ کی بیوی خولہ بنت ثعلبہؓ تھیں۔ میاں بیوی میں کوئی جھگڑا ہوا، خاوند نے جاہلیت کے رواج کے مطابق کچھ الفاظ بول دیے کہ تم میرے لیے ماں کی طرح ہو۔ جاہلیت کے دور میں یہ طلاق کے الفاظ ہوا کرتے تھے، اس وقت تک ظہار کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور طریقہ یہ تھا کہ جب تک کسی معاملے میں کوئی نئی وحی نہ آتی تو پرانا رواج چلتا تھا، چنانچہ پرانے رواج کے مطابق اسے طلاق ہو گئی تھی۔ خولہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی کہ یارسول اللہ! میرے خاوند نے مجھ سے یہ بات کہہ دی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ طلاق ہو گئی ہے۔ خولہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ ! میرے بچوں کا کیا ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، طلاق تو واقع ہو گئی ہے، اب میں اس بارے میں کیا کر سکتا ہوں؟ خولہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ میں بوڑھی کہاں جاؤں گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک اس معاملے میں وحی نہیں آتی، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خولہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ! میری اِس خاوند سے بہت محبت ہے، میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔ چنانچہ وہ اسی طرح حضور ﷺ سے جھگڑتی رہی کہ کبھی اپنے بچوں کی بات کرتی ہے اور کبھی اپنے بڑھاپے کی بات کرتی ہے جبکہ حضور ﷺ یہی بات فرماتے جارہے ہیں کہ اس معاملے میں میرے پاس کوئی حکم ابھی تک نہیں آیا۔ اس پر خولہؓ نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا کہ یا اللہ! یہاں تو میرا مسئلہ حل نہیں ہو رہا، تو ہی میرا مسئلہ حل کر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز سن لی اور اِس جھگڑے کو قرآن کریم میں اِس طرح بیان فرمایا قَدْ سَمِعَ

اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِھَا وَتَشْتَکِیْٓ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (سورۃ المجادلۃ: ۱) کہ بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی تھی اور اللہ کی جناب میں شکایت کرتی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا زمانہ تھا، حضرت عمرؓ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بازار میں جا رہے تھے، ایک بوڑھی خاتون لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے سامنے آگئی اور آواز دی، عمر! بات سنو۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہو گئے۔ بڑھیا کہنے لگی، تم وہی عمر ہو جو بکریاں چرایا کرتے تھے، پھر کہا، اے عمر! اب تم امیر المؤمنین ہو گئے ہو لیکن اپنا وہ وقت یاد رکھنا اور لوگوں کے ساتھ زیادتی نہ کرنا۔ حضرت عمرؓ کے ساتھیوں نے بڑھیا کے اِس لہجے اور بات کو محسوس کیا اور کہا کہ اے اللہ کی بندی تم کس سے مخاطب ہو اور کیا کہہ رہی ہو۔ ان کے سامنے تو وہ حضرت عمرؓ تھے جو چھتیس ہزار شہروں کے فاتح تھے اور جن کا نام سن کر قیصر اپنے تخت پر لرزتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں کو منع کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ خاتون تو وہ ہے جس کی بات اللہ تعالیٰ نے آسمانوں پر سنی اس لیے میں زمین پر اس کی بات کیوں نہ سنوں گا، بخدا یہ اگر شام تک مجھے یہاں کھڑا رکھے، میں یہیں کھڑا رہوں گا۔ یہ خاتون وہی خولہؓ بنت ثعلبہ تھیں جن کے بارے میں سورۃ المجادلہ نازل ہوئی تھی۔

خاوند اور بیوی کے جھگڑے میں حکم مقرر کرنا

رسول اللہ ﷺ کے ازواج مطہرات کے ساتھ گھریلو معاملات میں مختلف کیفیات ہوتی تھیں جبکہ صحابہ کرامؓ کے گھروں میں جھگڑے ہوتے تھے اور پھر ان جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے حکم بھی مقرر ہوتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو معاشرے میں اپنے خاوندوں کے ساتھ جائز معاملات میں اختلاف کا حق بھی دیا اور انہیں ان جھگڑوں میں انصاف حاصل کرنے کے لیے حکم مقرر کرنے کا حق بھی دیا۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے مرد کو گھر کا سربراہ بتاتے ہوئے مرد اور عورت، دونوں کو گھر کا ذمہ دار بتایا اَلرَّجُلُ رَاعٍ فِی بَیْتِہٖ وَالْمَرْءَۃُ رَاعِیَۃٌ فِی بَیْتِ زَوْجِھَا کہ مرد اپنے گھر کا ذمہ دار ہے اور عورت بھی اپنے خاوند کے گھر کے معاملات کی ذمہ دار ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے جہاں مرد کو گھر کا سربراہ قرار دیا وہاں یہ تلقین بھی فرمائی خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ مِنْ اَھْلِہٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ مِّنْ اَھْلِی کہ تم میں سے بہتر آدمی وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے بہتر ہوں۔

گھریلو زندگی میں کسی تنازع یا جھگڑا کا ہو جانا فطری بات ہے، ایک دفعہ حضور ﷺ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا کسی معاملے میں کوئی تنازع ہو گیا، دونوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بلایا جائے تاکہ وہ دونوں کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ کریں۔ حضرت عائشہؓ اپنے موقف پر اڑی ہوئی تھیں جبکہ رسول اللہ ﷺ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور درمیان میں حضرت ابو بکر صدیقؓ حکم مقرر ہوئے جو کہ حضرت عائشہؓ کے والد اور نبی کریم ﷺ کے دوست تھے۔ حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے، بیٹھے اور پوچھا کہ بتائیں آپ لوگوں کا جھگڑا کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ عائشہؓ سے پوچھیں کیا معاملہ ہے، حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ بتائیں کہ جھگڑا کیا ہے، لیکن بات ٹھیک ٹھیک بتائیں۔ اِس پر حضرت ابو بکرؓ غصے میں آگئے اور حضرت عائشہؓ کو تھپڑ مار دیا، اِتنا زوردار کے ان کے منہ سے خون نکل آیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی بیٹی سے فرمایا کہ یہ جرأت کہ رسول اللہ ﷺ سے سیدھی بات کہنے کا کہہ رہی ہو۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ تو اس خیال میں تھے کہ حضرت عائشہؓ اللہ کے رسول کی طرف سے کسی غلط بات کا گمان کر رہی ہیں جبکہ حضرت عائشہؓ کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے اور اسی تصور کے ساتھ وہ روایتی انداز میں اپنے خاوند کے متعلق بات کر رہی تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے جب یہ دیکھا کہ ان کے والد اِس قدر ناراض ہو گئے ہیں تو وہ اٹھیں اور پناہ کے لیے حضور ﷺ کے پیچھے جا کر چھپ گئیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابو بکر! میں نے تو آپ کو جھگڑا نمٹانے کے لیے بلایا تھا، اِس بات کے لیے تو آپ کو نہیں بلایا تھا۔

عورت کا رائے کا حق

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مکہ اور مدینہ کے معاشروں میں کچھ فرق تھا، بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ مکہ میں کیفیت یہ تھی کہ ہم معاملات میں عورتوں سے مشورے نہیں کیا کرتے تھے اور عورتوں پر سختی کا ماحول رکھتے تھے، لیکن ہم جب مدینہ منورہ گئے تو وہاں کا معاشرہ کچھ مختلف تھا۔ انصار کی عورتیں گھر کے معاملات میں آزاد تھیں، وہ معاملات میں مشورہ بھی دیتی تھیں اور خاوند کی کوئی بات غلط ہوتی تو اسے ٹوک بھی دیتیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ کچھ دن گزرے تو انصار کی عورتوں کے دیکھا دیکھی ہماری عورتوں نے بھی جواب دینا شروع کر دیا، ہمیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہو گیا۔ ہم نے جناب نبی کریم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارا تو کلچر خراب ہو گیا ہے، ہماری عورتیں تو بڑی پابند اور چپ رہنے والی تھیں، اب یہ بھی انصار کی عورتوں کی طرح بولنے لگ گئی ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ کہ انصار کی عورتیں اچھی عورتیں ہیں۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے گھر کی عورتوں کے ساتھ مشورہ کرنے اور ان سے معاملات میں رائے لینے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ جناب نبی کریم ﷺ نے عورت کو یہ مقام دیا کہ وہ معاملات میں اپنی رائے دے سکتی ہے اور اس کی رائے کی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کی رائے کا کہاں تک احترام کیا؟ اِس بات کا اندازہ بریرہؓ کے واقعہ سے کر لیجیے۔ بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھی اور مغیثؓ کے نکاح میں تھی، ہوا یوں کہ حضرت عائشہؓ نے بریرہؓ کو آزاد کر دیا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایک لونڈی کو آزاد ہونے کے بعد یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے نکاح میں رہے یا نہ رہے، اسے خیارِ عتق کہتے ہیں۔ بریرہؓ نے آزادی کے بعد اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مغیثؓ سے اپنا نکاح توڑ دیا۔ مغیثؓ کو بریرہؓ سے بے حد محبت تھی، اِس نکاح کے ختم ہونے سے مغیثؓ کو بہت صدمہ ہوا، روایات میں آتا ہے کہ مغیثؓ مدینہ کی گلیوں میں رُوتا پھرتا تھا کہ کوئی ہے جو بریرہؓ سے

میری سفارش کرے۔ بالآخر جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ ہی بریرہؓ سے میری سفارش کر دیں، میرا تو گھر اجڑ گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بریرہؓ کو بلوایا اور پوچھا، بریرہ! تم نے مغیث کو چھوڑ دیا ہے۔ بریرہؓ نے جواب دیا، جی یارسول اللہ، چھوڑ دیا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا، کیوں چھوڑ دیا ہے؟ بریرہ نے جواب دیا، یارسول اللہ، یہ میرا شرعی حق ہے، آپ ﷺ ہی نے تو یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ مجھے آزادی کے بعد یہ حق حاصل ہے کہ میں اپنے خاوند کی بیوی رہوں یا نہ رہوں۔ پھر حضور ﷺ نے مغیثؓ کی سفارش کرتے ہوئے بریرہؓ سے کہا کہ اگر تم اپنے فیصلہ سے رجوع کر لو اور مغیثؓ کے نکاح میں واپس چلی جاؤ تو اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس پر بریرہؓ نے ایک سوال کیا کہ یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ سوال کا مقصد یہ تھا کہ اگر حضور ﷺ کا حکم ہے، پھر تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اگر مشورہ ہے تو پھر میرے پاس سوچنے کا موقع ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ میرا حکم نہیں ہے بلکہ مشورہ ہے۔ بریرہؓ نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے ہاں اپنے حقوق کے معاملے میں عورت کی رائے کو یہ درجہ حاصل تھا کہ حضور ﷺ کی اپنی سفارش ایک آزاد کردہ لونڈی نے قبول نہیں کی۔ حضور ﷺ نے بریرہؓ کا یہ حق تسلیم کیا اور کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ بریرہ تم نے میری سفارش رد کر دی تھی۔

خلفائے راشدینؓ تو عورتوں کے معاملات میں مشورہ ہی عورتوں سے کیا کرتے تھے، عورتیں اجتماعی معاملات میں ایک دائرے کے اندر رہ کر اپنی رائے دیتی تھیں۔ تاریخ میں حضرت عمر فاروقؓ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کو شہر کی گلیوں میں گشت کرتے ہوئے ایک گھر کے سامنے سے گزرے تو اندر سے ایک عورت کے اشعار پڑھنے کی آواز آئی، وہ عورت اپنے خاوند کی فرقت میں اشعار پڑھ رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پتہ کروایا کہ آخر قصہ کیا ہے، حضرت عمرؓ کو بتایا گیا کہ یہ ایک جوان خاتون ہے جس کا خاوند بڑے عرصے سے جہاد کے لیے میدان جنگ میں ہے۔ حضرت عمرؓ کو تشویش لاحق ہوگئی کہ یہ کیا معاملہ ہوا، آخر اِس عورت کی جوانی کے بھی کچھ تقاضے ہیں، اگلی صبح اپنی دختر حضرت حفصہؓ کے پاس

گئے اور بتایا کہ رات کو یہ واقعہ ہوا ہے اور میں بہت فکر مند ہو گیا ہوں کہ بحیثیت امیر میں کتنے لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہوں۔ پھر کہا کہ عورتوں سے مشورہ کر کے بتاؤ کہ ایک عورت اپنے خاوند سے زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ جدا رہ سکتی ہے، چنانچہ حضرت حفصہؓ نے مشورہ کر کے رائے دی کہ چار مہینے کے بعد مجاہد کو واپس گھر بھیجا جائے۔

ایک عورت کا جنگی مجرم کو پناہ دینا

فتح مکہ سے پہلے قریش کے ساتھ جنگوں کا زمانہ تھا، اِن جنگوں کے نتیجے میں قیدیوں کا پکڑا جانا معمول کی بات تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے جنگ کا ایک اصول یہ تھا کہ حالت جنگ میں جس طرح لشکر کا امیر کسی کافر کو پناہ دے سکتا ہے، اسی طرح ایک عام سپاہی یا ایک عام شہری بھی کسی کافر کو پناہ دے سکتا ہے۔ اگر کسی کافر کو اِس طرح پناہ مل جاتی تو پھر اسلامی لشکر کے لیے اسے قتل کرنا ممنوع ہو جاتا تھا۔ ام ہانیؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بہن تھیں، ایسے ہی کسی جنگ کے دوران ان کا ایک مشرک رشتہ دار تھا جسے مباح الدم قرار دے دیا گیا تھا، ام ہانیؓ نے اسے پناہ دے دی۔ پھر وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنے ایک رشتہ دار کو پناہ دی ہے لیکن میرے بھائی حضرت علیؓ اسے مارنا چاہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ام ہانیؓ کی پناہ کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا قد أجرنا من أجرتِ کہ جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے پناہ دی۔

اسی طرح کا ایک اور دلچسپ واقعہ محدثین نقل فرماتے ہیں، حضور ﷺ کے دامادوں میں ترتیب سے، سب سے بڑے داماد ابو العاصؓ بن ربیع تھے، دوسرے نمبر پر حضرت عثمانؓ بن عفان تھے اور تیسرے نمبر پر حضرت علیؓ بن ابی طالب تھے۔ حضور ﷺ کی بڑی بیٹی حضرت زینبؓ حضرت ابو العاصؓ کے نکاح میں تھیں، جنگِ بدر میں ابو العاص کافروں کے لشکر میں تھے اور ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے جبکہ ان دونوں کا نکاح قائم تھا کہ نکاح کے احکامات ابھی نازل نہیں ہوئے تھے، یہ حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا کہ کافر مرد اور مسلمان عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ ابو العاصؓ بدر کی جنگ میں مسلمان لشکر کے ہاتھوں قید ہو گئے، حضرت زینبؓ کو پتہ چلا کہ ابو العاصؓ بدر کی جنگ میں گرفتار ہو کر حضور ﷺ کی قید میں

ہیں اور یہ کہ فدیہ کے عوض قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ ہوا ہے۔ ابو العاصؓ کے پاس فدیہ کے لیے دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار اتار کر ابو العاصؓ کو بھیجا کہ یہ ہار فدیہ میں دے کر رہائی حاصل کرو۔ بدر کے میدان میں وہ ہار حضرت ابو العاصؓ کے پاس پہنچا اور انہوں نے وہ ہار حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا کہ میری رہائی کے لیے اسے فدیہ میں قبول فرمائیں۔ یہ وہ ہار تھا جو حضرت خدیجہؓ نے اپنی بیٹی زینبؓ کے نکاح کے موقع پر انہیں تحفہ میں دیا تھا۔ جب یہ ہار دیکھا تو نبی کریم ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، حضور ﷺ کو حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اپنی پچیس سالہ رفاقت کا وہ وقت یاد آگیا۔ حضور ﷺ نے ساتھیوں سے کہا کہ اگر تم کہو تو یہ ہار میں اسے واپس کر دوں، کہ یہ میری بیٹی کے پاس میری زوجہ حضرت خدیجہؓ کی نشانی ہے۔ چنانچہ صحابہؓ نے متفقہ طور پر وہ ہار واپس کر دیا اور ابو العاصؓ کو بھی چھوڑ دیا۔

ابو العاصؓ اس کے بعد کافی دیر مکہ میں کفر کی حالت میں رہے، ایک موقع پر مسلمانوں کے ساتھ کسی جھڑپ میں وہ ایک بار پھر پکڑے گئے، صحابہؓ انہیں ساتھ لے کر مدینہ منورہ آگئے۔ طریقہ یہ تھا کہ جو بھی قیدی پکڑا جاتا اسے لا کر مسجد نبوی میں ستون سے باندھ دیا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ صبح نماز کے بعد مسجد میں کوئی قیدی دیکھتے تو لوگوں سے مشورہ کر کے اس کی قسمت کا فیصلہ سناتے۔ رات کو ابو العاصؓ کو مسجد نبوی ﷺ میں ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا، حضرت زینبؓ کو بھی پتہ چل گیا کہ ابو العاصؓ پکڑے گئے ہیں اور انہیں مسجد نبوی میں ستون کے ساتھ باندھا گیا ہے اور یہ کہ صبح نماز کے بعد ان کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ حضرت زینبؓ نے چپکے سے چادر اوڑھی اور مسجد نبوی ﷺ کے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئیں۔ حضور ﷺ فجر کی نماز پڑھا کر جیسے ہی نمازیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے تو حضرت زینبؓ نے آواز لگا دی کہ یا رسول اللہ! اس قیدی کو میں نے پناہ دے دی۔ حضور ﷺ نے یہاں بھی یہ ارشاد فرمایا قد أجرنا من أجرت کہ جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے پناہ دی۔ چنانچہ ابو العاصؓ کو چھوڑ دیا گیا، پھر بعد میں ابو العاصؓ مسلمان ہو گئے، رسول اللہ ﷺ کے صحابی بنے اور مجاہد بن کر انہوں نے بہت سی جنگوں میں حصہ لیا۔

عورت اور تعلیم و تعلم

اسلام کی پہلی صدی میں تعلیم و تعلم کے حوالے سے عورتوں کی کیا خدمات تھیں؟ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹی سی بچی سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ آنحضرت ﷺ سے نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کم عمر تھیں، لیکن حضرت عائشہؓ کی زندگی اور جدوجہد کو دیکھیں تو اِس نکاح کا مقصد آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتا ہے اور پھر عرب معاشرے کے رواج کے مطابق ایسے نکاح میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔ تھوڑا غور فرمایئے کہ دین کا وہ حصہ جو گھر کی زندگی سے متعلق ہے، اس کی تعلیم کے لیے بھی ایک شاگرد کی ضرورت تھی، ایسا شاگرد جو ذہین ہو اور حضور ﷺ کے گھر کی زندگی کو سمجھ کر آگے روایت کر سکتا ہو۔ شاگرد کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ لائق ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ شاگردی کی عمر کا بھی ہو۔ حضرت عائشہؓ کی عمر شاگردی کے لیے بہترین تھی، پھر گھر کی زندگی کے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کی تعلیم کے لیے میاں بیوی کے درجے کی بے تکلفی کا ماحول چاہیے۔ تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ حضور ﷺ کا یہ نکاح بعد میں آنے والے دور میں دینِ اسلام کی اشاعت و تعلیم میں کس قدر مفید ثابت ہوا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ ذمہ داری کامیابی کے ساتھ نبھائی، انہوں نے اسلامی علوم میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ وہ اپنے وقت کے مجتہد صحابہؓ میں شمار ہوتی تھیں اور اپنے والد محترم حضرت صدیق اکبرؓ اور بعد کے خلفائے راشدین کے زمانے میں فتویٰ دیا کرتی تھیں۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں حضرت عائشہؓ کے براہ راست شاگردوں کی تعداد تقریباً 200 سے زائد ہے۔

حضرت عائشہؓ کے بارے میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو خود بڑے جلیل القدر فقیہ صحابی ہیں، فرماتے ہیں مَا اَشْکَلَ عَلَیْنَا اَصْحَاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم قَطُّ اِلاَّ وَجَدْنَا فِیْہِ عِنْدَ ھَا عِلْماً کہ کبھی کوئی ایسا مسئلہ ہم اصحابِ محمد ﷺ پر نہیں آیا کہ جس کا حل حضرت عائشہؓ کے پاس نہ ملا ہو۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ جو تابعین میں بڑے محدث اور فقیہ ہوئے ہیں، حضرت عائشہؓ کے سب سے بڑے شاگرد تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی

زندگی میں حدیث، فقہ، قرآن کریم کی تفسیر، اسرارِ دین، طب وو راثت کے احکام، ادب اور شعر، ان شعبوں میں حضرت عائشہؓ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد تقریباً نصف صدی تک آپؓ حیات رہیں۔ حضرت عائشہؓ کا ۵۸ھ میں انتقال ہوا اور ان کی وفات تک ان کی مسندِ افتاء مدینہ منورہ میں قائم رہی۔

حضرت عائشہؓ کا طریقہ تعلیم یہ تھا کہ اپنے حجرے کے اندر دروازے سے کچھ فاصلے پر پردہ لٹکا کر بیٹھ جاتی تھیں، پردے اور اور دروازے کے درمیان اتنی جگہ ہوتی تھی کہ آنے والے بیٹھ کر بات وغیرہ کر سکیں۔ صحابہ کرامؓ کو معلوم ہوتا تھا کہ ام المؤمنین اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر، حجرے کا دروازہ کھول کر اپنی مسند پر بیٹھ جاتی ہیں۔ لوگ آکر سلام عرض کرتے تھے اور تعارف کراتے تھے کہ ام المؤمنین میں فلاں آدمی ہوں اور یہ مسئلہ عرض کرنا چاہتا ہوں، حضرت عائشہؓ اندر آنے کی اجازت دیتیں اور بات سن کر مسئلہ بیان فرما دیتی تھیں۔ لوگ اپنے جھگڑے لے کر بھی آتے تھے اور ام المؤمنین سے فیصلہ کرواتے تھے۔ ایک طرف یہ بات ہے کہ صحابہ کرامؓ فتویٰ لینے میں، مسئلہ پوچھنے میں اور راہنمائی لینے میں حضرت عائشہؓ سے رجوع کر رہے ہیں اور اس کے لیے مستقل ایک دربار لگا ہوا ہے جبکہ دوسری طرف یہ بات کہ حضرت عائشہ کی طرف سے پردے کا اہتمام کسی طور بھی تعلیم و تعلم میں رکاوٹ نہیں بن رہا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب تک میرے حجرے میں صرف رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک تھی، میں گھر میں ننگے سر گھومتی پھرتی تھی کہ یہ میرے خاوند کی قبر تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے اڑھائی سال بعد حضرت صدیق اکبرؓ کی قبر اُسی حجرے میں بنی، فرماتی ہیں کہ میں پھر بھی تسلی سے ننگے سر گھومتی پھرتی تھی کہ ایک قبر خاوند کی ہے جبکہ دوسری والد کی ہے۔ والد کے سامنے سر کا ننگا ہونا، بالوں کا ننگا ہونا جائز ہے۔ لیکن فرماتی ہیں کہ جب حضرت عمر فاروقؓ میرے حجرے میں دفن ہوئے تو اس کے بعد میں زندگی بھر اپنے کمرے میں ننگے سر نہیں رہی، اِس جھجھک سے کہ یہ ایک غیر محرم کی قبر ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود حضرت عائشہؓ نے اپنے حجرے میں مسندِ تدریس قائم رکھی۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ

پردہ رکاوٹ ہے، میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ نے اس زمانے کی روزمرہ زندگی کی سختیوں کے باوجود پردے کا اہتمام کرتے ہوئے نصف صدی تک درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھا۔ آپؓ اتنی بڑی مفتیہ تھیں کہ اکابر صحابہؓ اپنے مسئلوں کے لیے آپؓ سے رجوع کرتے تھے اور بڑے بڑے علماء راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ پردہ بھی قائم رہا اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

جناب نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات اور صحابیات میں دوسرے نمبر پر حضرت ام سلمہؓ کا ذکر آتا ہے کہ وہ بھی اپنے وقت کی مفتیہ تھیں، فتاویٰ کی کتابوں میں ان کے فتوؤں کا مجموعہ بھی ملتا ہے۔ حضرت حفصہؓ بھی مسئلہ بیان کیا کرتی تھیں اور فتویٰ دیا کرتی تھیں۔ آپ ﷺ کی صحابیات میں شفاء بنت عبد اللہؓ کا ذکر آتا ہے، حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں بہت سے معاملات ان کے سپرد کر رکھے تھے۔

یہ وہ نقشہ ہے جو حضور ﷺ اور حضرات صحابہؓ کرام کے دور میں تھا کہ عورت مجتہد بھی ہے، عورت مفتیہ بھی ہے، عورت محدثہ بھی ہے، عورت معلمہ بھی ہے اور اجتماعی معاملات میں عورت کی رائے تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلے بھی ہو رہے ہیں۔

مرد و عورت کے درمیان حقوق و فرائض کا توازن

آج عورت کو فطرت کے حوالے سے معاشرے میں جو مقام حاصل ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہے۔ عورت کے ساتھ جو ناانصافیاں ہو رہی ہیں، اس کی جو حق تلفی ہو رہی ہے، معاشرے میں اس کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں، اس کے سدباب کے لیے قابلِ ذکر اقدامات نہیں ہو رہے۔ لیکن عورت کی معاشرتی حیثیت کے حوالے سے یہ بات پیش نظر رکھنا اور اس کی طرف عورتوں کی توجہ مبذول کرانا بہت ضروری ہے کہ ایک عورت کے معاشرتی حقوق دراصل ہیں کونسے؟

آج لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ اِسلام عورت کو وہ کچھ نہیں دے رہا جو مغرب دے رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورتوں کے حقوق کے حوالے سے مغرب ہمارا معیار ہے؟ وہ مغرب

جس نے فرائض کو حقوق کا نام دے کر عورتوں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں اور ترقی پذیر ممالک کو عورت کی آزادی کے نام پر اس بات پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ ہم ویسٹرن سولائزیشن کو قبول کریں۔ دوسروں کو آزادئ رائے کا درس دینے والوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ دُنیا کے مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگ مغربی طرزِ زندگی کے علاوہ کسی اور طرزِ زندگی پر عمل پیرا ہیں۔

گورباچوف کا تجزیہ: مغربی دانشور خود بھی مغربی ثقافت کے نتائج سے پریشان ہیں، روس کے سابق وزیر اعظم گورباچوف نے اپنی کتاب 'پرسٹرائیکا' میں لکھا ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں لاکھوں افراد قتل ہوئے جس کی وجہ سے ہمارے پاس کارخانوں اور دفتروں میں افرادی قوت کی کمی ہوگئی۔ اِس افرادی قوت کی کمی کو دور کرنے کا طریقہ ہم نے یہ سوچا کہ کسی طرح بہلا پھسلا کر عورت کو دفتروں اور کارخانوں میں لایا جائے۔ ہم عورت کو مردوں کے برابر حقوق کا، مساوات کا اور معاش کا لالچ دے کر کارخانوں اور دفتروں میں لے آئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہمارے کارخانوں اور دفتروں کا نظام تو چل گیا لیکن ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہوگیا۔ گورباچوف نے کہا کہ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو اس کے اصل مقام، یعنی گھریلو زندگی میں کیسے واپس لے جائیں۔

ہیلری کلنٹن کا تجزیہ: امریکہ کی سابق خاتون اول ہیلری کلنٹن نے ایک مرتبہ دورۂ پاکستان کے دوران مختلف سکولز اور کالجز کا دورہ کیا۔ اسلام آباد کے ایک سکول میں ہیلری کلنٹن نے طالبات سے پوچھا کہ تمہارا یہاں کا مسئلہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہاں جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل اور حصولِ تعلیم کے جدید ذرائع کا فقدان ہے۔ وہیں ایک طالبہ نے ہیلری کلنٹن سے پوچھ لیا کہ آپ کے وہاں امریکہ کا مسئلہ کیا ہے؟ ہیلری کلنٹن نے کہا کہ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان لڑکیاں بن بیاہی مائیں بن جاتی ہیں، جس کے بعد وہ زندگی کی بہت سی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہ بات تو ہیلری کلنٹن نے کہی، لیکن اگر کسی لڑکی کا بچہ نہ بھی ہو تو وہ جوانی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان گنت لوگوں کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہوتی ہے جس میں بے احتیاطی کے نتیجے میں کئی لڑکیوں کو ابارشن کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ

ایک موقع پر ہیلری کلنٹن نے کہا کہ مجھے مشرق کا خاندانی نظام دیکھ کر رشک آتا ہے کہ یہاں کی نوجوان لڑکی اپنے ماموں، چاچا، پھوپھی اور خالہ کے حصار میں ہوتی ہے۔

"بنیادوں کی طرف واپسی": سابق برطانوی وزیر اعظم جان میجر نے 'بیک ٹو دی بیسکس' کے نام سے ایک مہم چلائی کہ ہمیں "بنیادوں کی طرف واپس" جانا چاہیے اور اپنے خاندانی نظام کو اس پرانی ڈگر پر لے جانا چاہیے جو عورت کو معاشرے میں اس کے اصل مقام پر لے جائے۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل برطانوی اخبارات میں یہ خبر تھی کہ حکومت برطانیہ نے ایسی عورتوں کو اضافی سہولیات دینے کا وعدہ کیا ہے جو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھروں میں رہیں۔

اسلام کا خاندانی نظام

اسلام نے مرد و عورت کا فطری توازن قائم کرتے ہوئے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک بات یہ کہی ہے کہ عورت کو رائے دینے کا حق ضرور حاصل ہے لیکن گھر کے نظام کا سربراہ مرد ہے اس لیے کہ کنٹرول ایک ہاتھ میں ہو تو نظام صحیح چلتا ہے اور اگر اختیارات دو ہاتھوں میں برابر تقسیم کر دیے جائیں تو سسٹم تباہ ہو جاتا ہے جیسا کہ کائنات کے نظام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (سورۃالانبیاء: ۲۲) کہ زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا بھی کوئی معبود ہوتا تو دونوں درہم برہم ہو جاتے، سو اللہ تعالیٰ اِن امور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کر رہے ہیں۔

یعنی نظم کا تقاضا یہ ہے کہ سربراہی کسی ایک کی ہو۔ دوسری بات یہ کہی کہ عورت کے جتنے فرائض ہیں، ان سے ہٹ کر ان پر کوئی ذمہ داری نہ ڈالی جائے۔ مجموعی انسانی معاشرے کے حوالے سے اسلامی تعلیمات یہ کہتی ہیں کہ مرد اپنے گھر کے اخراجات کا کفیل ہے جبکہ عورت گھر کے اندرونی نظام کی ذمہ دار ہے۔ ہاں بوقت ضرورت بیوی اپنے خاوند کا ہاتھ بٹا سکتی ہے اور خاوند بھی گھر کے اندرونی معاملات میں بیوی کی مدد کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کے درمیان حقوق و فرائض کی یہ تقسیم ان کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی ہے۔ لیکن مغرب والوں نے عورتوں کو آزادی کے نام پر اِس بات پر اکسایا ہے کہ گھر کے اخراجات میں

ہاتھ بٹانے کے لیے کمانا ان کے حقوق میں شامل ہے، اس بات کو انہوں نے مرد و عورت کے درمیان مساوات کا نام دیا ہے۔ دفتر میں جا کر کام کرنا، فیکٹری میں مزدوری کرنا، یہ عورت پر اضافی ذمہ داری ہے جنہیں حقوق کا پُر فریب نام دے دیا گیا ہے۔ جبکہ عورت کی جو فطری ذمہ داریاں ہیں، یعنی بچہ جننا اور اس کی پرورش کرنا، ان میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اسی طرح اسلام مطلقاً شادی برائے جنسی تسکین کا قائل نہیں ہے بلکہ قرآن کہتا ہے اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (سورۃ النساء: ۲۴) بشرطیکہ انہیں اپنے مال کے بدلے میں طلب کرو ایسے حال میں کہ نکاح کرنے والے ہو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ یعنی اسلام کہتا ہے کہ اگر کسی عورت کو ہاتھ لگانا ہے تو پہلے مہر اور نان نفقہ کی صورت میں اس کی مالی ذمہ داری قبول کرو، پھر گھر بسانے کی نیت سے نکاح کرو جس کا مقصد صرف شہوت نہ ہو بلکہ خاندان آباد کرنا مقصود ہے۔ یعنی عورت کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کرو، اس کی اور ہونے والے بچوں کی مالی ذمہ داری قبول کرو، اس کے بعد جنسی خواہش کی طرف آؤ۔

پھر قرآن نے کہا کہ ایسی لڑکیوں سے نکاح کرو جو مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (سورۃ النساء: ۲۵) نکاح میں آنے والیاں ہوں، آزاد شہوت رانیاں کرنے والیاں نہ ہوں اور نہ چھپی یاریاں کرنی والیاں ہوں۔

میں اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ عورت اور مرد کے معاشرتی تعلقات کے توازن میں، معاشرے میں عورت کی حیثیت کے بارے میں، گھریلو زندگی میں عورت کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے اور مرد و عورت کے اختیارات و حقوق کی تقسیم میں جو دائرہ کار جناب نبی کریم ﷺ نے قائم کیا ہے وہی نیچرل ہے وہی فطری ہے اور بالآخر اسی پر واپس آئیں گے تو معاشرے میں ایک توازن قائم ہو گا، اس کے بغیر معاشرے کو اصل اور فطری سکون حاصل نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

انسانی حقوق اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

آج دنیا میں انسانی حقوق کے حوالے سے سب سے زیادہ گفتگو ہو رہی ہے۔ دنیا کی تمام اقوام کے ذرائع ابلاغ میں اصحابِ علم و دانش اس موضوع پر سب سے زیادہ گفتگو کر رہے ہیں کہ دنیا میں انسانوں کو کیا حقوق حاصل ہونے چاہئیں، کونسے حقوق انہیں حاصل ہیں اور کن حقوق سے وہ محروم ہیں۔ میں آج کی گفتگو میں تاریخی حقائق کی بنیاد پر یہ بات واضح کرنا چاہوں گا کہ انسانی حقوق کا تصور سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا تھا جس کی عملی شکل جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں ملتی ہے۔ معاشرے میں انسانی حقوق کے احترام اور تحفظ کا جو عملی نمونہ جناب رسول اللہ ﷺ اور حضراتِ خلفائے راشدینؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، دنیا کا کوئی اور نظام اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اسلام میں حقوق کا تصور

اسلام میں حقوق کا تصور کیا ہے؟ حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک موقع پر اپنے میزبان سے فرمایا ان لربک علیک حقا ولنفسک علیک حقا ولاھلک علیک حقا (وفی روایۃ: ولزورک علیک حقا)، فأعط کل ذی حق حقہ (بخاری، رقم 1968) کہ تیرے رب کے تجھ پر حق ہیں، تمہارے نفس کا تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے، آنے جانے والے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب حضرت سلمان فارسیؓ کی اس بات کا تذکرہ کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا صدق سلمان کہ سلمان نے جو کہا، سچ کہا۔ چنانچہ اسلام میں حقوق کا بنیادی تصور حضرت سلمان فارسیؓ کا یہ جملہ ہے أعط کل ذی حق حقہ کہ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو سرزمین عرب میں اس حوالے سے دو انتہائیں تھیں۔ ایک طرف رہبانیت تھی کہ اللہ کی رضا کے لیے دنیا کے تمام معاملات چھوڑ دیے جائیں، رہبانیت سے مراد یہ ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں اکیلے زندگی بسر کی جائے، یہ حقوق اللہ کا غلبہ تھا کہ صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور دنیاوی معاملات مثلاً بیوی بچوں اور معاشرت وغیرہ کو ضروری نہ سمجھا جائے، نبی کریم ﷺ نے اپنے متعدد ارشادات میں واضح طور پر رہبانیت کے تصور کی نفی فرمائی ہے۔ دوسری طرف خدا فراموشی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے وجود سے ہی انکار تھا، یا پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اور آسمانی تعلیمات کی نافرمانی اس قدر عروج پر تھی کہ وہ زمانہ اسلامی تعلیمات کی رو سے دورِ جاہلیت قرار پایا۔

اسلام نے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن قائم کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (سورۃ النساء: ۳۶) اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غرباء کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضے میں ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا اصول یہ ہے کہ فرائض میں حقوق اللہ مقدم ہیں جبکہ فرائض کے علاوہ نوافل، مستحبات اور مباحات میں حقوق العباد مقدم ہیں۔ اور اگر حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ٹکراؤ کی نوبت آجائے تو بھی بعض صورتوں میں حقوق العباد مقدم ہیں۔

رنگ و نسل، زبان، برادری اور علاقہ کی بنیاد پر امتیاز

آج یہ کہا جاتا ہے کہ رنگ، نسل، برادری، زبان اور علاقہ کی بنیاد پر انسانوں کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف معاشرت رکھنے والے اور مختلف رنگ و نسل کے لوگ یکساں سلوک کے مستحق ہیں اور بحیثیت انسان برابر ہیں۔ اسلام نے یہی بات تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل کہی تھی۔ عرب قبائل کے اس معاشرے میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ قریش اور غیر قریش کے لوگ برابر نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اگر قریش کے کسی فرد کے ہاتھوں کسی دوسرے قبیلے کا آدمی قتل ہو جاتا تھا تو قصاص میں قریش کا آدمی قتل نہیں ہوتا تھا، قریش اور غیر قریش کا خون برابر نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن اگر کسی دوسرے قبیلے کے ہاتھوں قریش کا کوئی آدمی قتل ہو جاتا تو قصاص میں دو آدمی قتل کیے جاتے۔ یہ ایسا معاشرہ تھا جہاں عرب والے عجمیوں کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے۔ "عرب" اور "عجم" کے الفاظ ہی اس معاشرے کی کیفیت پر دلالت کرتے ہیں، "عرب" کا معنیٰ ہے بولنے والا جبکہ "عجم" کا معنیٰ ہے گونگا۔ عرب کے لوگ کہتے تھے کہ زبان تو ہم لوگ بولتے ہیں باقی سب گونگے ہیں۔
جناب رسول اللہ ﷺ نے اس فرق کے خاتمے کا اعلان کیا، حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ، فَلَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ فَضْلٌ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَبْيَضَ وَلَا لِأَبْيَضَ عَلَى أَسْوَدَ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوَى (المعجم الکبیر، ۱۲/۱۸، رقم ۱۶) کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے لوگو! میں نے تمہیں ایک ہی مرد اور عورت (آدم و حوا) سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ یہ باہم تمہاری پہچان کا ذریعہ ہو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت کا مستحق وہ ہے جو زیادہ حدود کا پابند ہے۔ اس لیے کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سیاہ فام

کو کسی سفید فام پر اور کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس میں ایک تقسیم فرمائی ہے، حضور ﷺ نے لوگوں کو حقوق میں یکساں قرار دیا ہے لیکن تکریم میں برابر قرار نہیں دیا۔ اِلّا بالتقویٰ میں حضور ﷺ نے یہی بات فرمائی ہے کہ رنگ و نسل اور ذات پات کے اعتبار سے سب انسانوں کے حقوق برابر ہیں لیکن عزت و تکریم میں سارے یکساں نہیں ہیں اس لیے کہ عزت و تکریم کا مدار کردار، اعمال اور تقویٰ پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے رنگ و نسل کے امتیاز کو صرف زبان سے ہی نہیں ختم کیا بلکہ عمل سے بھی ختم کیا اور مساوات کا ایک جامع اور مکمل نمونہ پیش کیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو دس ہزار صحابہؓ کا لشکر آپ کے ساتھ تھا، ان میں بڑے بڑے اکابر صحابہ موجود تھے، اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ بھی تھے، مہاجرین بھی تھے اور انصار بھی۔ لیکن خانہ کعبہ سے بتوں کی صفائی کے بعد آپ ﷺ نے سب سے پہلی اذان کے لیے کس کا انتخاب کیا؟ حضور ﷺ نے حضرت بلال حبشیؓ سے فرمایا کہ بلال آؤ اور خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اللہ کا نام بلند کرو، آج مسلمانوں کے اِس اقتدار کا افتتاح تمہاری اذان سے ہو گا۔ حضرت بلالؓ کعبہ کی چھت پر چڑھے، اللہ اکبر کہا، اذان کے ساتھ کلمہ حق بلند کیا اور مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا اعلان کیا۔ حضور ﷺ کے حکم سے حضرت بلالؓ کے اس عمل نے مسلمانوں کی تاریخ میں کالے اور گورے کے اس فرق کو ہمیشہ کے لیے پاؤں کے نیچے روند ڈالا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل کے ساتھ دنیا کو کالے اور گورے کا امتیاز مٹا کر دکھایا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد جب حضرت بلالؓ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آیا کرتے تھے تو حضرت عمرؓ ان کا استقبال ان الفاظ سے کیا کرتے تھے اَنْتَ اَخُوْنَا وَ مَوْلَانَا کہ بلالؓ تم ہمارے بھائی بھی ہو اور ہمارے سردار بھی ہو۔ "مولا" کا معنیٰ ہے سردار، آقا، بڑا، بزرگ۔

جان، مال اور آبرو کی حفاظت

انسانی حقوق کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ معاشرے میں جان، مال اور آبرو کا تحفظ انسان کا بنیادی حق ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا وَفِي بَلَدِكُمْ هٰذَا أَوْ كَمَا قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلم (بخاری، رقم ۴۰۵۴، ۱۵۵۱) کہ تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں، تم پر (آپس میں) اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن اور اس مہینے میں تمہارے اس شہر کی حرمت ہے۔ بخاری کی ایک اور روایت میں وابشارکم کا لفظ بھی ہے کہ تمہارے چمڑے بھی ایک دوسرے پر حرام ہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر ہاتھ نہ اٹھائے۔

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا أَلَا! إِنَّمَا هُنَّ أَرْبَعٌ: أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَلَا تَزْنُوا، وَلَا تَسْرِقُوا (مسند احمد، ۱۸۲۲۰) کہ آگاہ رہو! ان چار باتوں سے بچنا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، خدا کی حرام کردہ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرنا، زنا نہ کرنا اور چوری نہ کرنا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا الا لا تظلموا، الا لا تظلموا، الا لا تظلموا، انہ لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ (مسند احمد، ۱۹۷۷۴) کہ سنو، ظلم نہ کرنا۔ سنو، ظلم نہ کرنا۔ سنو، ظلم نہ کرنا۔ کسی شخص کا مال اس کے دل کی خوشی کے بغیر لینا حلال نہیں ہے۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر مجھے اپنے چچا زاد بھائی کی بکریوں کا ریوڑ دکھائی دے اور میں ان میں سے ایک بکری لے کر اس کو ذبح کر لوں تو کیا مجھے اس کا گناہ ہو گا؟ آپ نے فرمایا، اگر تمہیں کوئی بکری وادی میں اس حال میں ملے کہ اس نے چھری اور (آگ جلانے کے لیے) پتھر بھی اٹھا رکھے ہوں، تب بھی تم اس کو ہاتھ مت لگانا۔ (بیہقی، السنن الکبریٰ، ۱۱۳۰۵)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا العاریۃ موداۃ عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کی جائے، والمنحۃ مردودۃ دودھ پینے کے لیے جو جانور کسی نے دیا ہو اسے لوٹایا جائے، والدین مقضی لیا ہوا قرض ادا کیا جائے، والزعیم غارم اور قرض کا ضامن (قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں) ذمہ دار ہو گا۔(ترمذی، ۲۰۸۶)

رسول اللہ ﷺ نے ایسی گفتگو کو گناہِ عظیم بتایا ہے جس سے کسی کی بے عزتی کا پہلو سامنے آتا ہو۔ جو شخص کسی پر بدکاری کی تہمت لگائے وہ سزا کا مستحق ہے کہ اس نے کسی دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن میں غیبت سے منع فرمایا وَلاَ یَغْتَب بَّعْضُکُم بَعْضاً اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَن یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ (سورۃ الحجرات: ۱۲) اور کوئی کسی کی غیبت نہ کیا کرے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، سو تم اس کو ناپسند کرتے ہو۔

ایک صحابیؓ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! جس شخص کے عیب کا ذکر کیا جائے اگر اس شخص میں وہ عیب ہو کیا تب بھی ذکر کرنا منع ہے؟ صحابیؓ کے ذہن میں شاید یہ تھا کہ کسی کا ایسا عیب ذکر کیا جائے جو اس میں نہ ہو، تب غیبت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اسی کا نام تو غیبت ہے۔ ایک آدمی میں کوئی عیب موجود ہے اور اس عیب کو کسی جگہ خواہ مخواہ مجلس آرائی کے لیے بلاضرورت ذکر کرنا، اسی کا نام غیبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس شخص میں وہ عیب نہیں ہے تب تو یہ بہتان ہو گا۔ جان و مال اور آبرو کا تحفظ اسلام سے زیادہ کس نے کیا ہے؟ اسلام کے احکام سے زیادہ جامع احکام کس کے ہیں کہ کسی کو ناحق قتل کرنا، کسی کی عزت کو مجروح کرنا، کسی کی غیبت کرنا اور کسی پر بہتان لگانا، یہ سب قابل سزا جرم قرار پائے ہیں۔

اپنا حق طلب کرنے کا شعور

ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کی مجلس میں تشریف فرما تھے ایک صحابیؓ نے جسم پر صرف ایک چادر باندھ رکھی تھی اور کرتا نہیں پہن رکھا تھا، رسول

اللہ ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک چھڑی تھی جو گھڑی ہوئی نہیں تھی، باتوں باتوں میں محبت سے حضور ﷺ نے اس کی کمر پر چھڑی مار دی، ٹہنی اس طرح لگی کہ صحابیؓ کے جسم پر خراش آگئی۔ وہ صحابیؓ کہنے لگے یا رسول اللہ! آپ نے مجھے چھڑی ماری ہے میں آپ ﷺ سے اس کا بدلہ لوں گا۔ اِس پر جناب نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں حاکم ہوں اور بڑا ہوں تم کس خیال میں ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے چھڑی اس کے ہاتھ میں دی اور کمر آگے کر دی۔ اس نے چھڑی پکڑ لی اور کہا کہ یا رسول اللہ! بدلہ برابر نہیں ہے میری کمر ننگی تھی جبکہ آپ نے کرتا پہن رکھا ہے پہلے کرتا اتاریئے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے کرتا اتار کر ننگی کمر اس کے سامنے کر دی کہ تمہارا یہ حق ہے کہ تم پورا بدلہ لو۔ صحابیؓ نے حضور ﷺ کو بانہوں میں جکڑ لیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! میں تو بدن سے بدن ملانے کا بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا میرا ارادہ آپ سے بدلہ لینے کا تو نہیں تھا۔ لیکن جناب نبی کریم ﷺ نے دنیا کو بتایا کہ اپنے حق کا مطالبہ کرنا بھی انسان کا حق ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، حضرت عمرؓ جن کے رعب و دبدبے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ عمرؓ جس راستے سے جاتا ہو شیطان کو اس راستے پر آنے کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ اپنا راستہ تبدیل کر لیتا ہے۔ حضرت عمرؓ جن کے رعب و دبدبے کی کیفیت یہ تھی کہ زلزلہ آیا تو کوڑا زمین پر مارا اور کہا کیوں کانپتی ہو کیا عمرؓ نے تم پر انصاف نہیں کیا؟ ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ منبرِ رسول پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے ہزاروں صحابہؓ بیٹھے سن رہے تھے۔ فرمایا اسمعوا واطیعوا میری بات سنو اور میری اطاعت کرو۔ ایک صحابیؓ نے کھڑے ہو کر کہا لا سمع ولا طاع کہ جناب نہ سنتے ہیں اور نہ مانتے ہیں۔ پوچھا کیا معاملہ ہے؟ صحابیؓ نے کہا کہ پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیں پھر آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے، وہ یہ کہ بیت المال سے آپ نے چند دن قبل لوگوں میں کپڑے تقسیم کیے تھے ہم سب کو ایک ایک چادر ملی تھی۔ مجھے بھی اور آپ کو بھی وہی کپڑا ملا تھا، وہ چادر اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس سے میرا کرتا بن سکتا لیکن آپ اسی کپڑے کا کرتا پہنے کھڑے ہیں، آپ کا کرتا اس کپڑے سے

کیسے بن گیا جبکہ آپ کا قد بھی نسبتاً لمبا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تمہارا سوال ٹھیک ہے اس کا جواب میرا بیٹا عبد اللہؓ دے گا۔ پھر بیٹے سے کہا کہ عبد اللہ! اٹھو اور جواب دو۔ حضرت عبد اللہؓ نے اٹھ کر وضاحت کی کہ بھئی میں نے اپنے حصے کی چادر والد محترم کو دے دی تھی کہ دو چادریں ملا کر ان کا کرتا بن جائے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اب میں اپنا خطبہ کہوں؟ اس صحابیؓ نے کہا کہ قل! نسمع ونطیع ارشاد فرمایئے ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔

رشتہ داروں کے حقوق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلہ رحمی کی تلقین بھی کی اور اپنی حیات مبارکہ میں بے شمار مقامات پر عملی مثالوں کے ذریعے اس کی تعلیم بھی دی۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حضور ﷺ کے طرزِ عمل کو دیکھا جائے تو خاندانی نظام کا ایک ایسا مربوط نمونہ سامنے آتا ہے کہ جس کی مثال دنیا کی کوئی دوسری شخصیت یا کوئی اور نظام پیش کرنے سے عاجز ہے۔ حضور ﷺ نے ایک شخص کی زندگی میں والدین کے مقام اور ان کی حیثیت کی اہمیت اس انداز سے بیان فرمائی کہ والدین کی نافرمانی کو کبیرہ گناہ قرار دیا اور والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو جنت کا راستہ بتلایا۔ ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يُوصِيكُمْ بِأُمَّهَاتِكُمْ (المعجم الکبیر، ۷۶۴۷) کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ماؤں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا يَدُ الْمُعْطِي الْعُلْيَا، أُمَّكَ وَأَبَاكَ وَأُخْتَكَ وَأَخَاكَ، ثُمَّ أَدْنَاكَ فَأَدْنَاكَ (مسند احمد، ۱۶۰۱۸) کہ دینے والے کا ہاتھ اوپر (برتر) ہوتا ہے، پہلے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر خرچ کرو پھر درجہ بدرجہ اپنے قریبی رشتہ داروں پر۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ حضرت زینبؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میرا شوہر ضرورت مند ہے کیا میرے لیے اس کو صدقہ دینا جائز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نِعْمَ وَلَكِ أَجْرَانِ ہاں تمہیں اس صدقے کا دوہرا اجر ملے گا۔

عورتوں کے حقوق

دنیا میں انسانی حقوق کے حوالے سے عورتوں کے حقوق کی بات بھی ہو رہی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں عورت کی جبری شادی کی جاتی ہے، اس کا مہر مختلف حیلوں سے ہضم کر لیا جاتا ہے اور اسے جائیداد اور وراثت میں سے حصہ نہیں ملتا۔ جناب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا کہ یاد رکھو اَلَا! وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْراً، ---اِنَّ لَكُمْ عَلَى نِسَاءِ حَقًّا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا (ترمذی، ۲۰۱۲) کہ سنو، عورتوں کے ساتھ بھلائی کے بارے میں میری وصیت قبول کرو۔۔۔ تمہارے حقوق عورتوں پر ہیں اور عورتوں کے حقوق تم پر ہیں۔ یعنی مرد و عورت، دونوں کی طرف سے حقوق ادا ہوں گے تو بات آگے چلے گی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں عورتوں کے بارے میں سب سے زیادہ نصیحت کرتا ہوں کہ یہ عورتیں فطرتاً (اپنی ساخت کے اعتبار سے مرد سے) کمزور ہیں، طاقتور کی ذمہ داری ہے کہ وہ کمزور کے حقوق ادا کرے۔ اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ (مسلم ۲۱۳۷) کہ عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امان کے تحت اپنے نکاح میں لیا ہے اور خدا کی اجازت کے تحت ان کی شرم گاہوں سے فائدہ اٹھانا تمہارے لیے حلال ہوا ہے۔

پڑوسیوں کے حقوق

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں جو خود تو رات کو پیٹ بھر کر سوئے لیکن اس کا پڑوسی بھوکا سوئے۔ حضرت ابو امامۃ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر پڑوسیوں کا خیال رکھنے کی اس قدر تاکید فرمائی کہ مجھے خیال ہوا کہ آپ پڑوسی کو وراثت میں بھی حق دار قرار دے دیں گے۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں:

رشتہ دار مسلمان پڑوسی: اس کے تم پر تین حق ہیں: پڑوسی کا، مسلمان کا اور صلہ رحمی کا۔

مسلمان پڑوسی : اس کے تم پر دو حق ہیں: پڑوسی کا اور مسلمان کا۔

غیر مسلم پڑوسی : اس کا تم پر ایک یعنی پڑوسی ہونے کا حق ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ نے اپنی اہلیہ کے ساتھ اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ انہوں نے گوشت پکا کر محلے میں تقسیم کیا لیکن ایک یہودی پڑوسی کے ہاں بھیجنا بھول گئیں اور اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جناب نبی کریم ﷺ نے پڑوسیوں کے بارے میں کیا حقوق بیان فرمائے ہیں۔

نادار لوگوں کی مدد

حضرت عمر فاروقؓ رات کی تاریکی میں گشت کیا کرتے تھے، ایک دفعہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آئی، حضرت عمرؓ گزر گئے اور دوبارہ اس گلی میں آئے تو بچے ابھی تک رو رہے تھے، اسی طرح تیسرا چکر لگایا تو بچوں کے رونے کی آواز ابھی بھی آ رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے دروازے پر دستک دی، دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا نکلی، پوچھا اماں کیا بات ہے بچے مسلسل رو رہے ہیں۔ بڑھیا نے بتایا کہ بچے بھوکے بیٹھے ہیں کھانے کو کچھ نہیں ہے روئیں گے نہیں تو کیا کریں گے؟ ان کا باپ اِن کے سر پر نہیں ہے اور میں ان کی کفیل ہوں۔ گھر میں ایک ہنڈیا پک رہی تھی، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس ہنڈیا میں کیا ہے؟ بڑھیا نے بتایا کہ بچوں کو دلاسہ دینے کے لیے خالی پانی کی ہنڈیا چڑھا رکھی ہے کہ روتے روتے بہل جائیں گے اور سو جائیں گے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ایک خادم تھا اسے ساتھ لے کر بیت المال گئے اور آٹے کی بوری اٹھوا کر خود اپنے کندھے پر رکھوائی، اب خادم ساتھ چل رہا ہے اور امیر المؤمنین نے کندھے پر بوری اٹھائی ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جا کر بڑھیا کو آٹا دیا اور آگ جلا کر دی اور اس نے آٹا لے کر کھانے پکانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

حضرت عمرؓ اس دوران وہاں موجود رہے اور بڑھیا سے بات چیت کرتے رہے۔ فرمایا کہ اماں عمر اِسی شہر میں رہتا ہے اگر کھانے کو کچھ نہیں تھا تو عمر کو جا کر بتایا ہوتا۔ بڑھیا نے

جواب دیا کہ یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں جا کر عمرؓ کو بتاتی پھروں کہ میرے بچے بھوکے ہیں، یہ عمر کا کام ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھے کہ شہر میں کون کون سے گھر بھوکے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے دوسرا سوال کیا، اماں! عمر ایک آدمی ہے کس کس کا پتہ چلائے گا۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ بیٹا! اگر عمر اپنی رعیت کے بھوکوں کا پتہ نہیں چلا سکتا تو اسے یہ مسند خالی کر دینی چاہیے۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل جناب نبی کریم ﷺ نے اور ان کے بعد خلفائے راشدین نے لوگوں کو یہ شعور دیا کہ اپنا حق کس طرح اور کس حوصلے کے ساتھ طلب کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا لَوْمَاتَ الْکَلْبُ جوْعًا عَلٰی شَطِّ الْفُرَاتِ لَکَانَ عُمَرُ مَسْئُوْلاً عَنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کہ اگر دریائے فرات کے کنارے میں ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے گا تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کے بارے میں سوال ہو گا کہ عمرؓ تیری سلطنت میں ایک جاندار دریائے فرات کے کنارے پر بھوکا کیوں مرا۔

نجی زندگی کا تحفظ

نجی زندگی کا تحفظ بھی انسانی حقوق میں سے ہے۔ ایک شخص کو اپنی نجی زندگی، شخصی زندگی اور گھر کی چار دیواری کے اندر کی زندگی کا تحفظ حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا وَلَا تَجَسَّسُوْا کہ ایک دوسرے کے ذاتی حالات و معاملات میں مت پڑو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کے گھر میں جاؤ تو اجازت لیے بغیر گھر میں مت داخل ہو۔ رسول اللہ ﷺ ایک صحابیؓ کے گھر تشریف لے گئے، آپ ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ آپ ﷺ باہر سے بلند آواز میں السلام علیکم کہتے تھے، یہ اجازت مانگنے کا ایک طریقہ ہوتا تھا۔ اگر اندر سے جواب آتا تو ٹھیک ورنہ آپ وہیں سے لوٹ جاتے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تین دفعہ اجازت مانگو، اجازت مانگنے کا طریقہ عرف کے مطابق ہے، آج کل دروازے کے باہر بیل لگی ہوتی ہے، موقع محل کے مطابق اگر تین دفعہ السلام علیکم کہنے یا تین دفعہ بیل بجانے کے بعد بھی اندر سے جواب نہ آئے تو آدمی خواہ مخواہ وہاں کھڑا نہ رہے۔ آپ ﷺ نے تین دفعہ السلام علیکم کہا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو حضور ﷺ واپسی کے لیے پلٹے ہی تھے کہ اندر سے وہی صحابیؓ دوڑتے دوڑتے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ بھئی آپ نے

میرے سلام کا جواب نہیں دیا، صحابیؓ نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! میں نے تینوں دفعہ جواب دیا لیکن آہستہ دیا اس لیے کہ آپ کی زبانِ مبارک سے بار بار سلام سننے کو جی چاہتا تھا۔ یہ اجازت مانگنا دوسروں کے گھر کی نجی زندگی کا تحفظ ہے۔

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور پوچھا، یارسول اللہ! میں اپنی ماں کے گھر جاؤں تو اس سے بھی اجازت مانگوں؟ فرمایا، ہاں اس سے بھی اجازت مانگو۔ پوچھا، یارسول اللہ! میری ماں الگ گھر میں رہتی ہے کیا میں اس سے بھی اجازت مانگو؟ آپ نے پھر فرمایا، ہاں اس سے بھی اجازت مانگ کر اندر جاؤ۔ اس نے پھر تیسری بار پوچھا، یارسول اللہ! مجھے بار بار جانا پڑتا ہے۔ حضور ﷺ نے اس پر کہا کہ اگر تمہاری ماں کسی نامناسب حالت میں بیٹھی ہو تو کیا تم دیکھنا پسند کروگے؟ اس نے کہا، نہیں۔ فرمایا، پھر اجازت لے کر جاؤ۔ یہ ایک گھر کی نجی زندگی کا تحفظ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر کسی کے گھر جا کر اجازت مانگ رہے ہو تو دروازے کے سامنے مت کھڑے ہو اور فرمایا جُعِلَ الْاِسْتِئْذَانُ لِاَجْلِ الْبَصَرِ کہ اجازت مانگنے کے حکم کی وجہ یہی ہے کہ اچانک نظر نہ پڑ جائے۔ ایسی جگہ مت کھڑے ہو کہ دروازہ کھلتے ہی گھر کے اندر تک نظر پڑ جائے بلکہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو، ممکن ہے کوئی بچہ اچانک دروازہ کھول دے اور آپ کی نظر گھر کے اندر پڑ جائے، گھر والے نہ جانے کس ماحول میں بیٹھے ہوں اور ان کی پردہ دری ہو جائے۔ آپ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کسی کے گھر کے دروازے کے ایک سوراخ میں سے اندر جھانک رہا تھا۔ آپ ﷺ نے منع فرماتے ہوئے کہا کہ اگر وہ شخص تمہیں ایسا کرتے دیکھ کر تمہاری آنکھ میں سلاخ گھسیڑ دیتا تو اسے اِس کا حق حاصل تھا۔

قانون کی نظر میں سب کا برابر ہونا

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک زِرہ گم ہو گئی تھی جو کسی طرح ایک یہودی کے ہاتھ میں چلی گئی، حضرت علیؓ نے کسی جگہ وہ زِرہ دیکھی تو پہچان لی کہ یہ تو میری زِرہ

ہے جبکہ یہودی کا کہنا تھا کہ اس نے وہ زِرہ کہیں سے خریدی ہے۔ یعنی ایک یہودی سے اسلامی حکومت کے سربراہ کا جھگڑا ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے قاضی شریحؒ کی عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ یہ میری زِرہ ہے اور اس یہودی کے پاس ہے۔ قاضی شریحؒ حضرت علیؓ کی حکومت میں چیف جسٹس تھے۔ دعویٰ چونکہ حضرت علیؓ نے دائر کیا تھا اس لیے مدعی یہ تھے، عدالت نے حضرت علیؓ سے مطالبہ کیا کہ گواہ لائیں۔ اب عدالت میں قاضی کے سامنے یہودی بھی کھڑا ہے اور حضرت علیؓ بھی۔ حضرت علیؓ کو کوئی عدالتی تحفظ حاصل نہیں تھا کہ سربراہِ مملکت کو عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا، پھر کوئی پروٹوکول بھی نہیں تھا کہ حضرت علیؓ کو بیٹھنے کے لیے کرسی وغیرہ مہیا کی گئی ہو، دونوں ساتھ ساتھ قاضی کے سامنے کھڑے تھے۔ حضرت علیؓ نے گواہ پیش کیے جن میں ایک ان کا بیٹا حضرت حسنؓ تھے اور دوسرا کوئی اور شخص تھا۔ قاضیؒ نے کہا کہ جناب بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں ہے، اگر حسنؓ کے علاوہ کوئی اور گواہ ہے تو لائیے ورنہ میں آپ کے خلاف فیصلہ کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے پاس اور کوئی گواہ نہیں ہے۔ قاضی شریحؒ نے امیر المؤمنین کے سامنے کھڑے کھڑے یہ فیصلہ سنا دیا کہ جناب یہ زِرہ اس یہودی کی ہے میں آپ کا دعویٰ خارج کرتا ہوں۔ قانون کی نظر میں برابری کا جو تصور اسلام نے دیا ہے تمام تر تہذیب و تمدن کے دعووں کے باوجود دنیا آج بھی اس مقام تک نہیں پہنچی۔

اسلام میں غلامی کا تصور

آج غلامی کے مسئلہ کے حوالے سے اسلام کو تنقید کا نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غلامی ایسا رواج تھا جسے اسلام نے بڑی حکمت کے ساتھ بتدریج ختم کیا۔ جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس زمانے میں کسی شخص کو غلام بنانے کے تین طریقے رائج تھے۔

ایک طریقہ تو وہ تھا جسے آج کل کی اصطلاح میں بردہ فروشی کہتے ہیں یعنی کوئی طاقتور آدمی کسی کمزور آدمی کو پکڑتا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیتا تھا۔ حضرت زید بن حارثہؓ بھی ایسے ہی غلام بنے تھے، وہ کسی غلام خاندان کے نہیں تھے، راہ چلتے کچھ طاقتور لوگوں نے پکڑا اور بیچ دیا۔

حضرت سلمان فارسیؓ بھی ایسے ہی غلام بنے تھے، علم کی تلاش میں سفر کر رہے تھے کہ کچھ طاقتور لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے غلام بنا کر بیچ دیا۔ آج بھی کچھ لوگ ایسے کرتے ہیں کہ کسی بچے یا بچی کو اغوا کر کے آگے بیچ دیا۔ چنانچہ ایک طریقہ غلام بنانے کا یہ رائج تھا۔

دوسرا طریقہ غلام بنانے کا یہ تھا جس کا کہ بائبل میں بھی ذکر ہے اور پرانی قوموں میں بھی یہ طریقہ رائج رہا ہے کہ کسی مجرم کے ذمے کوئی تاوان ہوتا تو عدالت، پنچایت، تحکیم یا قضا اس شخص کو سزا کے طور پر غلام بنا دیتی بلکہ بعض اوقات کوئی مجبور آدمی خود کو کسی کی غلامی میں دے دیتا تھا، مثلاً کسی پر کوئی قرض ہوتا جسے وہ چکا نہیں سکتا تو وہ لاچار ہو کر کہہ دیتا تھا کہ ٹھیک ہے میں تمہارا غلام ہوں مجھے بیچ کر اپنا قرضہ پورا کر لو یا خود مجھ سے کام لے لو۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا، جنگ کے دوران جو لوگ قید میں آجاتے تھے ان کے بارے میں مختلف صورتیں ہوتی تھیں، مثلاً یہ کہ انہیں

ویسے ہی چھوڑ دیا جائے،

قیدیوں کے تبادلے میں چھوڑ دیا جائے،

فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے،

قتل کر دیا جائے،

یا قیدی بنا لیا جائے۔

اگر جنگی مجرموں کو قید کرنے کا فیصلہ ہو جاتا تو اس کی پھر دو صورتیں ہوتی تھیں کہ انہیں قید خانے میں ڈال دیا جائے، یا پھر غلام بنا کر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی جیل میں قید کر لیا جائے یا پھر نیم آزادی دے دی جائے، حضور ﷺ کے زمانے میں عرب میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے، ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو قید میں رکھنا مشکل ہوتا تھا اس لیے یہ قیدی خادم کے طور پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔

چنانچہ یہ تین طریقے اس وقت غلام بنانے کے رائج تھے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے غلامی کی تمام صورتوں کو ناجائز قرار دیتے ہوئے انتظامی ضروریات کے پیش نظر صرف آخری صورت کی گنجائش برقرار رکھی کہ جنگی قیدیوں کو مختلف خاندانوں میں بطور خادم تقسیم کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بَیْعُ الْحُرِّ حَرَامٌ کہ بردہ فروشی حرام ہے۔ ثَمَنُ الْحُرِّ حَرَامٌ جرمانے یا تاوان میں بھی غلام بنانا حرام ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی جنگوں کے زیادہ تر قیدی یا تو ایسے ہی چھوڑ دیے یا تبادلے میں چھوڑے یا پھر فدیہ لے کر چھوڑے۔ غزوۂ حنین میں سب قیدی بلا معاوضہ رہا کر دیے گئے۔ ایک دو جنگوں میں جب یہ دیکھا کہ قیدی بنانا ضروری ہے وہاں قیدی بنائے گئے لیکن ساتھ ان کے حقوق بھی بیان کیے گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا خولکم إخوانکم یہ تمہارے بھائی ہیں اطعموھم مما اطعمتم جو خود کھاتے ہو انہیں بھی وہی کھلاؤ البسوھم مما تلبسون جو خود پہنتے ہو انہیں بھی اسی معیار کا پہناؤ، ولا تکلفوھم مالا یطیقون اور جس کام کی ان میں طاقت نہیں وہ بوجھ ان پر مت ڈالو، إن کلفتموھم فاعینوھم اگر کوئی کام ان کی طاقت سے زیادہ ہے تو ان کی مدد کرو۔

ایک صحابی حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک غلام کو تھپڑ مارا تو پیچھے سے آواز آئی ابو مسعود! جتنی قدرت تم اس پر رکھتے ہو اس سے کہیں زیادہ قدرت والا تمہارے اوپر ہے، تم نے اپنے آپ کو مالک سمجھ کر تھپڑ مارا ہے تمہارا بھی کوئی مالک ہے۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جناب رسول اللہ ﷺ تھے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! میں نے اللہ کی خاطر اسے آزاد کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں لپیٹ میں لے لیتی۔

جناب نبی کریم ﷺ نے جو آخری وصیت فرمائی اس میں دو باتیں فرمائیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کا یہ آخری جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا: اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ اپنی نماز کا خیال کرنا اور اپنے ماتحتوں

کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی ترغیبات کے ذریعے غلاموں کا مسئلہ اتنا حساس بنا دیا کہ صحابہ کرامؓ نے معمولی سے معمولی بات پر غلاموں کو آزاد کرنا شروع کر دیا اور یوں عملی طور پر مسلمانوں کے معاشرے میں ایک وقت غلامی عملاً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے آج کی گفتگو میں اصولاً یہ بات عرض کی ہے کہ انسانی حقوق کا تصور سب سے پہلے اسلام نے دیا ہے جبکہ آج کی ویسٹرن سولائزیشن اس کے بارہ سو سال بعد انسانی حقوق سے آشنا ہوئی ہے۔ رائے کی آزادی ہو، جان کا تحفظ ہو، مال کا تحفظ ہو، آبرو کا تحفظ ہو، گھریلو زندگی کا تحفظ ہو، عورتوں کے حقوق ہوں، غلاموں کے حقوق ہوں، رشتہ داروں کے حقوق ہوں، اپنا حق مانگنے کا شعور ہو، یہ معاملات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے ہیں اور آج کی نسل انسانی اپنے تمام تر دعوؤں اور ترقی کے باوجود اس مقام تک نہیں پہنچ سکی جس کا عملی نقشہ حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں صحابہ کرامؓ نے پیش کیا تھا۔ اسلام کو اگر سمجھنا ہے تو وہ خلفائے راشدین کے دور کو سامنے رکھ کر سمجھنا ہو گا کہ وہی آئیڈیل دور ہے اور وہی مثالی اجتماعی سوسائٹی ہے جس کی بنیاد حقوق اللہ اور حقوق العباد پر قائم کی گئی، اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن۔

سیاسی قیادت اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

اسلام دین فطرت ہے۔ دین ومذہب کے اعتبار سے، عقیدہ وایمانیات کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی کے اعتبار سے تمام انبیاء کا مشترکہ دین ہے، یہ دین حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوا۔ انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے ادوار میں حالات کی ضروریات کے تحت انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کرتے رہے۔ دین اسلام میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں اور زمانوں کا احاطہ کیا ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے جب تکمیل دین کا اعلان کیا تو انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ باقی نہیں رہا تھا جس میں انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی کا سامان باہم نہ پہنچا دیا گیا ہو۔

سیاست بھی انسانی سوسائٹی کا ایک بہت اہم شعبہ ہے۔ سیاست کسے کہتے ہیں؟ قوم کی اجتماعی قیادت کرنا، ان کے لیے نظام حکومت قائم کرنا، اس نظام حکومت کا نظم اچھے طریقے سے چلانا اور اجتماعی معاملات میں قوم کی راہنمائی کرنا، اسے سیاست کہتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرامؑ نے اس شعبے میں بھی وحی الٰہی کی بنیاد پر انسانیت کی راہنمائی کی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت سے انبیاء کرامؑ کا تذکرہ فرمایا ہے جو اپنے اپنے دور میں وقت کے حکمران بھی تھے اور دینی ومذہبی معاملات میں قائد بھی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے جنہوں نے اپنی قوم کو فرعون سے آزادی دلانے کے لیے جدوجہد کی اور بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے چھٹکارا دلوا کر ان کی حکومت قائم کی، اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا تذکرہ حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ کے طور پر آتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر ہے کہ وہ اپنے دور میں پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے، اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا

ذکر آتا ہے کہ وہ اپنے دور میں پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے ایسی بادشاہت جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مانگ کر لی۔ حضرت سلیمانؑ اپنی بادشاہت کے لیے دعا مانگا کرتے تھے قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ (سورۃ ص: ۳۵) کہا کہ اے میرے رب مجھے معاف کر دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا کر کہ میرے بعد کسی اور کو میسر نہ ہو آپ بڑے عطا کرنے والے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کی بادشاہت ایسی تھی جو انسانوں پر تو تھی ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنوں پر بھی تھی، ہوا پر بھی تھی اور پرندوں پر بھی تھی۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سینکڑوں کی تعداد میں ایسے گزرے ہیں جو اپنے وقت میں پیغمبر بھی تھے اور حکمران بھی، چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے سیاسی راہنمائی کو بھی حضرات انبیاء کرامؑ کے فرائضِ منصبی میں ذکر فرمایا ہے۔

سیرت طیبہ کے حوالے سے دو باتیں بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ پوری نسل انسانی میں رسول اللہ ﷺ کے سوا زندگی کے کسی شعبے کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جس کے حالات زندگی اس قدر تفصیل کے ساتھ اور اس قدر اعتماد کے ساتھ ریکارڈ پر محفوظ ہوں۔ نہ سیاست کے شعبے میں، نہ قانون کے شعبے میں، نہ تجارت کے شعبے میں، نہ مذہب کے شعبے میں، نہ علم و فلسفے کے شعبے میں اور نہ ہی زندگی کے کسی اور شعبے میں۔ تاریخ انسانی میں کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں ہے جس کی زندگی کے ایک ایک مرحلے کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے سوا پوری نسل انسانی میں کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ جس کی شخصیت اس قدر جامع ہو کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس سے راہنمائی ملتی ہو، یہ جناب رسول اللہ ﷺ کا اعجاز ہے اور یہ بھی حضور ﷺ کے معجزات میں سے ایک ہے۔

ایک جامع شخصیت

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس قدر جامع ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے ہر کردار کا نمونہ ملتا ہے۔ آپ ﷺ ایک امین بھی تھے کہ مکہ کے لوگ اپنی امانتوں کو آپ ﷺ کے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ آپ ایک حکم و منصف بھی تھے کہ عرب قبائل کے

درمیان حجرِ اسود کی تنصیب کا معاملہ کس خوش اسلوبی سے طے فرمایا۔ آپ ﷺ تاجر بھی تھے کہ حضرت خدیجہؓ کے تجارتی قافلے دوسرے ملکوں میں لے کر جاتے اور تجارت کرتے تھے۔ آپ ﷺ ایک مبلغ بھی تھے کہ لوگوں کو نیکی اور اچھائی کی طرف بلاتے اور بدی و برائی سے روکتے تھے۔ حق و باطل کی لڑائی میں آپ ﷺ ایسے فوجی کمانڈر بن کر ابھرے کہ اِس پر تاریخ میں مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ رسول اللہ ﷺ منصب انصاف پر فائز تھے کہ آپ قاضی اور جج بھی تھے، خود آپ ﷺ کے پاس بھی مقدمات آتے تھے جن کے آپ ﷺ فیصلے سنایا کرتے تھے، اور پھر باقی قاضیوں کے پاس جو مقدمات آتے ان کے فیصلوں پر اپیلیں حضور ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں جن پر حضور ﷺ فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ آپ ایک سیاسی لیڈر بھی تھے کہ مختلف قبائل کے وفود آپ کے پاس آتے تھے جن سے آپ مذاکرات اور گفتگو فرماتے تھے۔ آپ اپنی ریاست کے سب سے بڑے ڈپلومیٹ سب سے بڑے سفارت کار بھی تھے کہ آپ ﷺ دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات اور معاملات کو بھی نبھاتے تھے۔ نبی کریم ﷺ اپنی ریاست کے منتظم اعلیٰ بھی تھے کہ ریاست کے داخلی معاملات کے متعلق فیصلے بھی آپ ﷺ خود فرمایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کے امام بھی تھے کہ آپ ﷺ نماز خود پڑھاتے تھے۔ جناب نبی کریم ﷺ ایک خطیب بھی تھے کہ خطبہ جمعہ اور دیگر خطبات ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

یہ میں نے انسانی زندگی کے ان اہم کرداروں میں سے چند کا ذکر کیا ہے جو جناب نبی کریم ﷺ نے نبھائے۔ پھر ایسا بھی نہیں تھا کہ حضور ﷺ ایک شعبے میں اچھے تھے اور دوسرے شعبے میں خدانخواستہ کمزور تھے، رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر تھے اور افضل الانبیاء تھے اللہ تعالیٰ نے جو شعبہ بھی حضور ﷺ کے سپرد کیا اس میں حضور ﷺ کی کارکردگی کا معیار انتہا پر تھا، یہ جناب نبی کریم ﷺ کی جامعیت ہے۔

خلفاء اسلامؓ، نبوی ذمہ داریوں کے وارث

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي وَسَيَكُونُ بَعْدِي

خُلَفَاء (متفق علیہ) کہ بنی اسرائیل کے انبیاء اپنی قوموں کے پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی قائد بھی تھے، جب ایک نبی دنیا سے تشریف لے جاتے تو دوسرے نبی ان کی جگہ آجاتے جیسے حضرت موسیٰؑ کی جگہ حضرت یوشع بن نونؑ نے لی، بنی اسرائیل میں یہ تسلسل چلتا رہا۔ جناب نبی کریم ﷺ بھی اسی طرح اپنی قوم کے سیاسی قائد تھے، رسول اللہ ﷺ نہ صرف امتِ مسلمہ کے قائد تھے بلکہ آپ نسلِ انسانی کے بھی سب سے بڑے سیاسی قائد تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں یہ بات فرمائی لا نبی بعدی کہ پہلے انبیاء میں تو تسلسل تھا اور نبوت جاری تھی لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ سوال یہ ہوا کہ جب آپ کے بعد نبی کوئی نہیں آئے گا تو یہ خلا کون پُر کرے گا، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اس لیے آپ ﷺ کے بعد سیاسی قیادت کا مسئلہ کیسے حل ہو گا؟ پھر آپ نے فرمایا فَسَيَكُونُ بَعْدِي خُلَفَاء کہ میرے بعد یہ منصب اور ذمہ داری خلفاء نبھائیں گے، یعنی میرے بعد خلافت کا نظام ہو گا اور خلفاء کا سلسلہ ہو گا جو نبوی ذمہ داریوں کو سنبھالیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے جہاں زندگی کے باقی شعبوں میں راہنمائی کی ہے وہاں آپ نے اپنی امت کی سیاسی قیادت بھی کی، آنحضرت ﷺ نے اپنی سیرت و سنت کے حوالے سے اجتماعی نظام دیا ہے جسے نظام خلافت کہتے ہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی ساری زندگی اس نظام کی تعلیم و تکمیل کے مراحل پر مشتمل ہے جبکہ خلافت کا یہ نظام اپنی آب و تاب کے ساتھ خلافت راشدہ کے دور میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے دنیا کو ایک حکومتی نظام دیا، حکومتی نظام کو چلانے کے لیے راہنما اصول دیے اور اس کے لیے قیادت تیار کی۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر تاریخ اسلام میں مستقل تصانیف تحریر کی گئی ہیں لیکن میں سربراہِ مملکت اور نظام حکومت کے حوالے سے دو بنیادی اصولوں پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔

1. پہلا اصول یہ کہ حاکم وقت کا معیارِ زندگی معاشرے کے ایک عام آدمی کے معیارِ زندگی کے مطابق ہونا چاہیے۔
2. دوسرا اصول یہ کہ معاشرے کے ہر فرد، بالخصوص اصحابِ علم و دانش کو حاکم وقت کے احتساب کا حق ہونا چاہیے۔

سربراہِ مملکت کا معیارِ زندگی

حاکم وقت کو اپنی رعیت کی نظر میں کیسا ہونا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرزِ زندگی سے خود بھی اِس کی مثال پیش کی اور آپ ﷺ کے بعد اصحابِ خلافت راشدہ نے بھی اسی طرز کا معیارِ زندگی برقرار رکھا۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے اپنے دور کے سب سے کمزور طبقے کے برابر اپنا معیارِ زندگی رکھا، اس پر علماء نے اور صوفیاء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں کہ حضور ﷺ کا فقر اختیاری تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں کئی کئی دن تک آگ نہیں جلتی تھی، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خاندان نبوت میں ہم نے معمولی قسم کی کھجوریں تین دن مسلسل پیٹ بھر کر کھائی ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ چاہتے تو کیا زندگی کی سہولتیں حاصل نہ کر سکتے تھے؟ لیکن نبی کریم ﷺ نے ایک پیغمبر ہوتے ہوئے، کمانڈر انچیف ہوتے ہوئے، چیف جسٹس ہوتے ہوئے، منتظم اعلیٰ ہوتے ہوئے اور حاکم وقت ہوتے ہوئے اپنا معیارِ زندگی معاشرے کے عام طبقے کے برابر رکھا۔ آپ حضرات خیال فرمایئے کہ اِس معاملے میں رسول اللہ ﷺ کس قدر حساس تھے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کا ہم سب کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا تھا کہ کسی اور خاوند کا اپنی بیوی کے ساتھ نہ ہوتا ہوگا، حضور ﷺ نے خود فرمایا کہ میں اپنے گھر والوں کے معاملے میں تم سب سے بہتر ہوں۔

حضور ﷺ کا معیارِ زندگی: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج کے ساتھ زندگی میں ایک مرتبہ ناراضگی کا مرحلہ آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ غزوۂ خیبر میں جب مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو صحابہ کرامؓ کے گھروں میں خوشحالی آئی اور معاشی صورت حال میں آسانی پیدا ہوئی جس کی بدولت معیارِ زندگی کچھ بہتر ہوا۔ ازواجِ مطہرات نے آپس میں مشورہ کیا کہ لوگوں کے گھروں میں تو سہولتیں آئی ہیں ہمارے گھروں میں بھی آنی چاہئیں۔ آپس میں صلاح مشورہ کر کے طے کیا کہ جب حضور ﷺ گھر تشریف لائیں گے تو ہم سب اکٹھی ہو کر حضور ﷺ سے بات چیت کریں گی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ ایک زوجہ محترمہ کے گھر میں آئے تو پروگرام کے مطابق سب ازواج وہاں اکٹھی ہوگئیں، انہوں نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے ام

المؤمنین حضرت عائشہؓ کو اپنا ترجمان بنایا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنی گفتگو اس انداز سے کی کہ یارسول اللہ! ہمارا زیادہ وقت پھٹے ہوئے کپڑے سینے سلانے میں گزر جاتا ہے اگر تھوڑی سہولت ہمیں بھی حاصل ہو جائے تو اچھی زندگی گزار سکیں گی اور اطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکیں گی، باقی لوگوں کے گھروں میں اگر سہولت آئی ہے تو ہمارے گھروں میں بھی آنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ اس پر ناراض ہوگئے کہ تم لوگوں نے یہ سوال کیوں کیا، اور قرآن کریم نے اس پر وعید اتاری یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیَاةَ الدُّنْیَا وَزِینَتَهَا فَتَعَالَیْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیلًا (سورۃ الاحزاب: ۲۸) کہ اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور اس کی آسائش منظور ہے تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر ان سے کہہ دیجیے کہ اگر دنیا چاہیے تو اس گھر میں نہیں ملے گی یہاں تو اسی طرح گزارا کرنا ہو گا۔ ایک ریاست کے سربراہ کے طور پر یہ جناب نبی کریم ﷺ کا ایک اہم پہلو تھا۔ اور پھر خیال فرمایئے کہ اس کی پیروی آپ ﷺ کے خلفاء میں کیسے ہوئی، آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے جانشینوں نے اِس طرزِ عمل کی پیروی کیسے کی؟

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا معیارِ زندگی : حضرت صدیق اکبرؓ اپنے ذریعہ معاش کے لیے مدینہ کی نواحی بستیوں میں کپڑے بیچا کرتے تھے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ اسلام کے خلیفۂ اول منتخب ہوئے، منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد دوسرے دن کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے بازار میں جا رہے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یا خلیفۃ رسول اللہ کہاں جا رہے ہیں؟ اس زمانے میں امیر المؤمنین کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی تھی یہ اصطلاح حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں آئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ کپڑے بیچنے جا رہا ہوں، حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ تو خلیفۃ المسلمین ہیں اگر آپ کپڑے بیچنے نکل پڑیں گے تو مسلمانوں کے معاملات کون نمٹائے گا۔ آپ کی عدم موجودگی میں کسی ملک کا وفد آ گیا کوئی مقدمہ آ گیا یا کوئی ریاستی مسئلہ درپیش ہوا تو اسے کون نمٹائے گا؟ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ اگر میں مسجد میں بیٹھ گیا تو بچے کہاں

سے کھائیں گے، میرا تو یہ ذریعہ معاش ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جناب آپ گھر تشریف لے جایئے میں اصحابِ شوریٰ کو اکٹھا کر کے اِس مسئلے کا حل تلاش کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اصحابِ شوریٰ کے گھروں میں گئے اور سب کو مسجدِ نبوی میں اکٹھا کیا۔ خلافت راشدہ کے قیام کے بعد سب سے پہلا اجلاس اِسی مسئلے پر ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے مسئلہ پیش کیا کہ میں نے راستے میں خلیفۃ المسلمین کو دیکھا کہ گٹھڑی اٹھائے کپڑا بیچنے جارہے تھے، یہ بال بچے دار ہیں اگر یہ کام نہیں کریں گے تو بچے کہاں سے کھائیں گے۔ اس لیے ہمیں بیت المال سے خلیفۃ المسلمین کے لیے تنخواہ مقرر کرنی چاہیے۔ چنانچہ سب اس بات پر متفق ہوگئے کہ خلیفۃ المسلمین کے لیے بیت المال سے تنخواہ مقرر ہونی چاہیے، پھر اس بات پر بحث ہوئی کہ خلیفۃ المسلین کی تنخواہ کتنی ہونی چاہیے؟ اُس وقت کے امیر المؤمنین بیک وقت حاکم وقت بھی تھے، چیف جسٹس بھی تھے اور افواج کے کمانڈر بھی تھے، تمام بڑے بڑے عہدے ان کے پاس تھے۔ تنخواہ کے متعلق مختلف آراء سامنے آئیں لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رائے پر فیصلہ ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ کے ایک عام آدمی کا تخمینہ لگایا جائے کہ اس کا خرچہ کتنا ہے اس کے مطابق خلیفۃ المسلمین کی تنخواہ مقرر کر دی جائے۔ یہ وہی اصول تھا جو رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا کہ حاکم وقت کا معیارِ زندگی عام آدمی کے برابر ہونا چاہیے۔

حضرت ابو بکرؓ کی تنخواہ کتنی مقرر ہوئی؟ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگالیجیے کہ تاریخ میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے آخری عرصے میں عید کا وقت قریب آرہا تھا۔ زوجہ محترمہ نے عرض کیا کہ یا خلیفۃ المسلمین! عید کا دن قریب آرہا ہے عید کے دن بچوں کے لیے کچھ میٹھا پکانے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میرے پاس تو اِس کی گنجائش نہیں ہے مجھے تو بیت المال سے جو راشن ملتا ہے میں اس سے زیادہ نہیں لے سکتا اور میرا اپنا کوئی کاروبار نہیں ہے اس لیے یہ خیال رہنے ہی دو۔ اہلیہ نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنے طور پر انتظام کروں؟ حضرتِ ابو بکرؓ نے فرمایا، ٹھیک ہے اگر کر سکتی ہو تو کرلو۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد عید کا دن آیا اور حضرت ابو بکرؓ تیاری کر کے عید گاہ کی طرف جانے لگے تو دیکھا کہ اہلیہ نے میٹھا پکایا ہوا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پوچھا یہ

بندوبست کہاں سے کیا ہے ہمارے پاس تو اس کی گنجائش نہیں تھی۔ اہلیہ نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں بیت المال سے راشن کا جو آٹا روزانہ آتا ہے، میں نے اس میں سے ایک مٹھی آٹا الگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند دنوں میں اتنا آٹا ہو گیا کہ اس میں سے آدھا آٹا بازار میں بیچ کر میں نے گڑ اور تیل منگوایا، باقی آدھا آٹا اس میں گوندھ کر حلوہ بنالیا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا ابھی تک کسی نے کھایا تو نہیں؟ جواب ملا نہیں ابھی کسی نے نہیں کھایا۔ فرمایا دیگچی لاؤ، آپؓ نے دیگچی منگوا کر اٹھائی اور چل دیے۔ حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراحؓ جو بیت المال کے انچارج تھے ان سے جا کر فرمایا کہ ابو عبیدہؓ! یہ حلوہ ابو بکر کے گھر والوں کا حق نہیں ہے بلکہ یہ مدینہ منورہ کے یتیموں اور بیواؤں کا حق ہے۔ اور سنو! آج کے بعد میرے گھر میں ایک مٹھی آٹا کم بھیجا کرنا کیونکہ ہمارا گزارا ایک مٹھی کم آٹے سے بھی ہو جاتا ہے۔ دنیا کے کس خطے کا کس مذہب کا کس نظام کا کونسا حکمران ہے جو اس کی مثال پیش کر سکے؟ رسول اللہ ﷺ اور ان کے خلفاء نے حکمرانی کا یہ معیار بتایا کہ حکمرانی برتری اور فخر کا نہیں بلکہ فریضے اور ذمہ داری کا نام ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا معیارِ زندگی: ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ بیمار ہو گئے۔ طبیب آئے حال احوال دیکھا نبض دیکھی اور بتایا کہ انتڑیاں خشک ہو گئی ہیں کچھ دن زیتون کا تیل استعمال کریں یہی آپ کا علاج ہے۔ فرمایا میرے گھر میں تو زیتون کا تیل نہیں ہے۔ کسی نے بتایا کہ بیت المال میں زیتون کا تیل موجود ہے۔ فرمایا اچھا! بیت المال میں زیتون کا تیل ہے، ابو عبیدہؓ کو بلائیں۔ پوچھا ابو عبیدہ بیت المال میں زیتون کا تیل ہے؟ کہا، جی حضرت! موجود ہے۔ پوچھا کتنا ہے؟ بتایا کہ حضرت! بہت ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ تیل مدینہ منورہ کے سب لوگوں میں تقسیم کیا جائے تو میرے حصے میں کتنا آتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ حضرت پھر وہ اتنی مقدار کا نہیں ہو گا کہ کھانے کے قابل ہو۔ آپؓ نے فرمایا بس اس سے زیادہ حق میرا بیت المال پر نہیں ہے۔ بیت المال کی چیز مدینہ منورہ کے لوگوں میں برابر تقسیم ہو کر جو حصہ میرے حصے میں آتا ہے بس وہی میرا حق ہے اس سے زیادہ میں نہیں لے سکتا۔ طبیب نے کہا کہ حضرت! بطور قرض لے لیں۔ پوچھا کیا تم ضمانت دیتے ہو کہ اگر میں قرض نہ ادا کر سکا تو تم ادا کرو گے؟

میں نے عرض کیا کہ خلفائے راشدین نے جناب نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق نظام حکومت کی ایسی مثال پیش کی کہ دنیا کا کوئی نظام اسے دہرا نہ سکا۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی حکمت تھی کہ حاکم وقت عام آدمی کے معیار کے مطابق زندگی گزارے گا تو عام لوگوں کی مشکلات و مسائل سے آگاہ ہو گا اور انہیں حل کرنے کی فکر کرے گا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے انصاف کا معیار

امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا ایک واقعہ تاریخ والے لکھتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد دوسرے ملکوں کی طرف سے وفود کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، رواج کے مطابق ملکوں کے وفد دوسرے ملکوں میں جاتے تھے تو تحفے تحائف لے کر جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ قیصر روم نے تحفے میں عورتوں کے استعمال کی خوشبو بھیجی جو پاؤڈر کی شکل میں تھی۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اسے عورتوں میں کیسے تقسیم کیا جائے، ساتھیوں نے کہا کہ حضرت! اپنی زوجہ محترمہ کو دے دیجیے کہ وہ اسے عورتوں میں تقسیم کر دیں گی۔ حضرت عمرؓ گھر تشریف لے گئے اور اہلیہ محترمہ کو بتایا کہ یہ خوشبو تحفے میں آئی ہے اسے عورتوں میں تقسیم کرنا ہے اس کے لیے ساتھیوں نے تمہارا نام تجویز کیا ہے اس لیے تم اسے تقسیم کر دو لیکن پہلے مجھے بتاؤ کہ تمہاری تقسیم کا طریقہ کیا ہو گا؟ اہلیہ نے کہا کہ عورتوں کو اکٹھا کروں گی اور سب میں برابر برابر تقسیم کر دوں گی۔ پوچھا اپنا حصہ کتنا رکھو گی؟ بتایا کہ جتنا دوسروں کو دوں گی اتنا ہی اپنا بھی رکھوں گی۔ فرمایا کہ خوشبو کا وہ حصہ جو تقسیم کرتے وقت ہاتھ پر لگ جائے گا وہ کس کھاتے میں جائے گا؟ اس لیے یہ خوشبو سب میں تقسیم کر دو لیکن اپنا حصہ کم رکھنا۔ دنیا کا کونسا حکمران ہے جو انصاف کو اس درجے پر قائم رکھ سکے۔

حاکم وقت کے احتساب کا حق

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا نظام قائم کیا اور معاشرے کے ہر فرد کو احتساب کا حق دیا، ایک مرتبہ ایک صحابیؓ کو باتوں باتوں میں حضور ﷺ نے چھڑی مار

دی جس سے اس کے جسم پر خراش آگئی تو اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں آپ سے بدلہ لوں گا۔ آپ نے اس کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے فوراً چھڑی اس کے ہاتھ میں دے دی اور اپنی کمر آگے کر دی۔ جب حضرت ابو بکرؓ حضور ﷺ کے جانشین کے طور پر خلیفہ بنے اور مسجد نبوی میں آئے تو پہلا خطبہ یہ ارشاد فرمایا کہ لوگو! میں تم پر امیر بنا دیا گیا ہوں لیکن میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں۔ یہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی انکساری اور کسر نفسی تھی ورنہ افضل البشر بعد الانبیاء ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ و التسلیمات کے بعد نسلِ انسانی کی بزرگ ترین شخصیت جناب ابو بکر صدیقؓ کی تھی۔ فرمایا کہ میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں لیکن میں تم پر حکمران بنا دیا گیا ہوں اگر میں سیدھا سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو لیکن اگر میں ٹیڑھا چلوں اور میرے طرزِ عمل میں کہیں کجی نظر آئے تو مجھے سیدھا کر دو۔ خلیفۃ المسلمین اپنے پہلے خطبے میں اپنی رعیت کو یہ حق دے رہا ہے کہ اگر میں کسی معاملے میں ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کر دینا۔

جب خلیفہ بنے تو یہی بات حضرت عمر فاروقؓ نے بھی دہرائی۔ آپؓ نے خطبہ ارشاد فرمایا کہ لوگو! ابو بکر صدیقؓ نے مجھے تم پر اپنا جانشین مقرر کیا ہے اور تم پر امیر بنا دیا ہے۔ پھر پوچھا کہ میں اگر سیدھا سیدھا چلوں گا تو میرا ساتھ دو گے لیکن اگر میں ٹیڑھا چلوں گا تو تمہارا طرزِ عمل کیا ہو گا؟ ایک بدو صحابیؓ نے کھڑے ہو کر اپنی تلوار لہرائی کہ پھر ہم تلوار سے آپ کو سیدھا کر دیں گے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ عمر کی رعیت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عمر کو تلوار کے ساتھ سیدھا رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو احتساب کا تصور اور آزادیٔ رائے کا حق یہاں تک دیا ہوا تھا کہ ایک بار جب حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المال سے ایک خاندان کے لیے راشن پہنچایا تو گھر کی بڑھیا نے رات کی تاریکی میں حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر عمر اپنی رعیت کے بھوکوں کا خیال نہیں کر سکتا تو اسے اپنے عہدے پر فائز رہنے کا حق نہیں ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد احتساب کے اس تصور کو خلفائے اسلام نے کس طرح قائم رکھا؟ امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ بیس سال تک مسلمانوں کے متفقہ امیر

المومنین رہے ان کے بارے میں تاریخ ایک دلچسپ واقعہ نقل کرتی ہے۔ طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت معاویہؓ نے ایک دن جمعے کے خطبے کے دوران ایک جملہ فرمایا انما المال مالنا والفئی فیئنا من شئنا أعطینا ومن شئنا منعناہ (مجمع الزوائد ج5ص236) کہ بیت المال کا مال ہمارا مال ہے اور غنیمت کا مال ہمارا مال ہے ہم جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔ یعنی بیت المال کی دولت اور غنیمت کے مال پر ہماری مرضی ہے کہ جسے چاہیں دیں جسے چاہیں نہ دیں۔

اس پر ایک جمعہ گزر گیا۔ اگلا جمعہ آیا تو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے یہ بات پھر دہرادی، لوگوں میں کچھ کھسر پھسر ہوئی کہ یہ کیا بات ہو رہی ہے۔ تیسرا جمعہ آیا تو حضرت معاویہؓ نے ایک بار پھر یہی بات دہرادی۔ دمشق کی جامع مسجد میں جمعے کا یہ خطبہ ہو رہا تھا اجتماع میں سے ایک آدمی کھڑا ہو گیا اس نے کہا کہ امیر المؤمنین بات سنیے، یہ تیسرا جمعہ ہے کہ آپ یہی بات کہہ رہے ہیں۔ سنیے، یہ بیت المال کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے یہ مسلمانوں کا مال ہے ہم کسی کو مسلمانوں اور بیت المال کے درمیان حائل نہیں ہونے دیں گے۔ جمعہ کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس شخص کو اپنے گھر بلالیا، کچھ لوگ پیچھے گئے کہ اگر کوئی بات سختی کی ہوئی تو ہم اس کی حمایت کریں گے۔ اندر گئے تو دیکھا کہ حضرت معاویہؓ نے اسے اپنی مسند پر بٹھا رکھا ہے اور خود اس کے سامنے مؤدب بیٹھے ہوئے فرمارہے ہیں کہ ان ھذا أحیانی أحیاہ اللہ کہ اللہ تعالیٰ اسے زندگی دے اس نے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ میں جو یہ بات دہرارہا تھا تو میں ایسا قصداً کر رہا تھا کہ اس سے میرا ایک مقصد تھا۔ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا کہ میرے بعد میری امت میں کچھ حکمران ایسے بھی آئیں گے جو میرے منبر پر کھڑے ہو کر جو جی میں آئے گا کہیں گے کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا کوئی باز پرس نہیں کرنے والا ہو گا، ایسے حکمران جہنم میں بندروں کی طرح چھلانگیں لگاتے پھریں گے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ جب پہلے جمعے میں مجھے کسی نے اس بات پر نہیں ٹوکا تو مجھے یہ بات کھٹکی کہ معاویہؓ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ دوسرے جمعے میں نے پھر یہ بات دہرائی کہ شاید اب کوئی کھڑا ہو، جب پھر کوئی نہیں کھڑا ہوا تو مجھے پریشانی لاحق ہو گئی کہ یہ مسئلہ تو خراب لگتا ہے، کہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کی زد میں تو نہیں آرہا۔ آج کے خطبۂ جمعہ

میں اس شخص نے کھڑے ہو کر مجھے ٹوک دیا اور مجھے حضور ﷺ کی اس پیشین گوئی کی زد سے نکالا۔ حضرت معاویہؓ صحابہ کرامؓ میں آخری خلیفہ ہیں ان کا معیار یہ ہے کہ وہ خود احتسابی کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ کی پیشین گوئی پر پرکھ رہے ہیں۔

حاکم وقت کا احتساب، رعیت کا حق یا ذمہ داری

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا جو تصور پیش کیا اس میں عام لوگوں کو احتساب کا حق دیا کہ اگر حاکم وقت میں کوئی غلط بات دیکھیں تو ٹوک دیں۔ آج کے نظام سیاست میں اور اسلام کے نظام سیاست میں ایک بنیادی فرق ہے۔ حاکم وقت اگر کوئی بات یا عمل حق کے خلاف کر رہا ہو یا ناانصافی اور ظلم کا معاملہ کر رہا ہو تو اسے اِس طرز عمل سے روکنے کو آج کی دنیا ہر شہری کا حق قرار دیتی ہے۔ لیکن حاکم وقت کے خلاف تنقید کرنا اسے اس کی غلطی پر ٹوکنا اور اس کی غلط بات کی نشاندہی کرنا، اسلام نے اسے حق نہیں بلکہ ذمہ داری قرار دیا ہے۔ اسلام کے اور آج کے مروجہ نظام سیاست میں یہ فرق ہے۔ حق تو اختیاری ہوتا ہے کہ کوئی اپنا حق استعمال کرے یا نہ کرے لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ اختیار نہیں دیا بلکہ بالخصوص علماء کے حوالے سے یہ فرمایا کہ غلط بات کو غلط کہنا پڑے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو عالم ایک ظالم حکمران کے ظلم کو دیکھ کر خاموش رہے وہ اپنی ذمہ داری سے گریز کر رہا ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے اسے جہاد قرار دیا افضل الجہاد کلمة حق عند سلطان جائر کہ سب سے بہتر جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔

ایک حدیث میں جناب نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو جو ظالم حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنے کا حوصلہ نہ کریں، شیطان کا ساتھی قرار دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو میرے منبر پر بیٹھتا ہے اور ظالم کے ظلم کو ظلم نہیں کہتا شیطان أخرس وہ گونگا شیطان ہے۔ لیکن اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی کی بات ایسے انداز سے کہی جائے کہ جس میں خیر خواہی ہو۔ ایک صحابی نے پوچھا یارسول اللہ! دین کیا ہے؟ فرمایا خیر خواہی کا نام دین ہے۔ پوچھا کس کی خیر خواہی؟ فرمایا للہ ولرسولہ ولائمة المسلمین وعامتھم کہ اللہ کے لیے خیر خواہی (اللہ

کی بندگی)، اللہ کے رسول کے لیے خیر خواہی (رسول اللہ ﷺ کی نصیحت پر عمل)، مسلم حکمرانوں کی خیر خواہی (غلط باتوں پر تنقید) اور عوام الناس کی خیر خواہی۔ یعنی غلط بات پر موقع محل کی مناسبت سے تنقید کرنا ایک ذمہ دار شہری کا فریضہ ہے لیکن یہ تنقید ایسے انداز سے ہو کہ اس میں دشمنی کا پہلو نہ ہو بلکہ خیر خواہی کا پہلو ہو۔ جناب نبی کریم ﷺ نے حکمرانوں کی غلطیوں کو درست کرنے کو دین قرار دیا اور اسے جہاد کا درجہ دیا۔

میں نے اپنی گفتگو میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام حکومت کی دو بنیادی خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ کہ آپ ﷺ نے ایک حاکم وقت کے طور پر اپنا معیارِ زندگی عام لوگوں کے مطابق رکھا، اس میں حکمت یہ تھی کہ ایک حاکم وقت عام لوگوں کے مسائل و مشکلات سے صحیح طور پر آگاہی اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے جبکہ وہ خود روز مرہ زندگی کے ان مسائل و مشکلات سے گزرے۔ اگر حکمرانوں اور عوام الناس کے معیارِ زندگی میں فرق ہو گا تو حکمرانوں کو لوگوں کے مسائل کا صحیح ادراک نہیں ہو سکے گا اور وہ صحیح حکمرانی نہیں کر سکیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو طرزِ حکومت متعارف کروایا اس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ معاشرے کے ہر فرد کو حاکم وقت کے احتساب کا حق دیا۔ اور بالخصوص معاشرے کے اصحابِ علم و دانش کی یہ ذمہ داری قرار دی کہ وہ حکمرانوں کے غلط اقدامات کی نشاندہی کرتے رہیں کہ احتساب کا یہ عمل حکومتی نظام کو صحیح رخ پر چلنے میں مدد دیتا رہے۔ اہل علم اگر امراء کے احتساب سے صرف نظر کریں گے اور جانتے بوجھتے ہوئے ان کے غلط اقدامات کی نشاندہی نہیں کریں گے تو وہ مجرم ٹھہریں گے اور اپنے فرض کی ادائیگی میں قصوروار ہوں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے سیاسی راہنمائی کا جو تصور پیش کیا اس کی ایک جھلک میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

قانون کی بالادستی اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

آج جب مسلمان دنیا کے کسی خطے میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو حکومت و قانون کی بنیاد بنانے کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک کا سارے کا سارا نظام قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ کے مطابق ہونا چاہیے، وہاں اسلام کی بالادستی ہونی چاہیے، حدودِ شرعیہ نافذ ہونی چاہئیں، خلافت کا نظام نافذ ہونا چاہیے، تو اس کے جواب میں عام طور پر ایک بات کہی جاتی ہے کہ آج کے دور میں تھیاکریسی نہیں چل سکتی، یا آج کے دور میں پاپائیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تھیاکریسی اور پاپائیت

تھیاکریسی اور پاپائیت کسے کہتے ہیں؟ تھیاکریسی اور پاپائیت اسے کہا جاتا ہے کہ وقت کا حکمران خود کو خدا کا نائب اور نمائندہ قرار دے کر جو چاہے فیصلے کرے، لوگ اسے سننے اور ماننے پر مجبور ہوں اور ان فیصلوں پر عمل کے پابند ہوں۔ تھیاکریسی کا مختصر معنیٰ یہ ہے کہ حاکم وقت خود کو قانون سے بالاتر سمجھے، وہ خود کسی قانون کا پابند نہ ہو، جبکہ جو کچھ کہہ دے وہ قانون کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکمِ وقت یہ سمجھے کہ میں خدا کا نمائندہ ہوں اس لیے میں جو بھی بات کہتا ہوں وہ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں خدا کے نام پر، خدا کے اشارے کے نام پر، یا اِلہام کے نام پر پیغمبر کے سوا کوئی حاکم اپنی بات کو خدا کی بات قرار دے کر لوگوں کو اپنی اطاعت کا پابند بنالے، اس کا نام تھیاکریسی ہے اس کا نام پاپائیت ہے۔

دنیا پاپائیت اور تھیا کریسی کی ڈسی ہوئی ہے، لوگوں کے ذہنوں میں حکومت کے حوالے سے جب مذہب کا نام آتا ہے تو یورپ کا وہ چار سو سالہ دوران کے سامنے آجاتا ہے جس میں یورپ کے اندر تھیا کریسی اور پاپائیت کا راج رہا ہے اور یورپ میں پوپ اور اس کی کونسل اپنے فیصلوں کو خدا کا فیصلہ قرار دیتے رہے ہیں، آج بھی وہ اپنے دائرے میں یہی کرتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں پر مذہب اور خدا کے نام پر بڑا ظلم ہوا ہے، بادشاہ نے اور کلیسا نے خدا کے نمائندے بن کر جس بات کو اپنے مفاد کے خلاف پایا ہے اس کو مذہب کی مخالفت قرار دے کر لوگوں کے خلاف فیصلے کیے اور لوگوں کو سزائیں دی ہیں۔ اس لیے آج جب مذہب کی بنیاد پر حکومت کا نام آتا ہے تو ان لوگوں کے ذہنوں میں وہ تاریک دور آجاتا ہے جسے یہ ڈارک ایجز (Dark ages) کہتے ہیں۔ اس پس منظر کی بنیاد پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر جب بھی حکومت ہوگی تو حکمران خدا کے نام پر اپنی من مانی کرے گا اس لیے کہ مذہب اور خدا کے سامنے لوگ پابند اور مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آج جب دنیا کے کسی بھی ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ ہوتا ہے تو جواب میں یہ رد عمل سامنے آتا ہے کہ آج کے دور میں تھیا کریسی کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ وہ کشمکش ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے مسلمانوں کو درپیش ہے۔

اسلام میں تھیا کریسی کا تصور

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں تھیا کریسی کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے، اسلام تو خلافت یعنی نیابت کا تصور دیتا ہے۔ ہمارے ہاں جناب رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد قیامت تک کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ جس کی بات کو خدا کی بات کہا جا سکے، اور پھر خود نبی کریم ﷺ کی شخصیت بھی اللہ تعالیٰ کے قانون اور ضابطے سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ پاپائیت اس کا نام ہے کہ ایک آدمی کو اس درجہ میں معصوم تصور کر لیا جائے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی اور یہ کہ جو بات وہ کہہ دے وہ دراصل خدا ہی کی بات ہے، اس کے آگے کوئی قانون نہیں ہے کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں دنیا بھر کے اہل سنت والجماعت کے تمام مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی

کے بعد قیامت تک امت میں سے کوئی آدمی ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو گا کہ جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ معصوم ہے، خدا کا نمائندہ ہے اور غلطی سے بالاتر ہے۔

جناب نبی کریم ﷺ اپنی 23 سالہ نبوی زندگی میں خود بھی کبھی خدائی قانون سے بالاتر نہیں رہے، آپ ﷺ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ میں یہ کہتا ہوں اس لیے میری بات مانو بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے یہ حکم آیا ہے جس کا میں بھی پابند ہوں اور تم لوگ بھی پابند ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی بات کی نسبت اپنی طرف نہیں کی، حالانکہ جہاں تک ہمارے ایمان کا تعلق ہے رسول اللہ ﷺ دین کے معاملے میں آخری اتھارٹی ہیں، ہمارے سامنے نہ اللہ تعالیٰ ہیں اور نہ جبریل علیہ السلام بلکہ ہمارے سامنے تو حضور ﷺ کی شخصیت ہے۔ لیکن دین کے معاملے میں، قانون کے معاملے میں اور معاملات کے بارے میں آخری اتھارٹی ہونے کے باوجود خود رسول اللہ ﷺ کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ آپ قانون اور ضابطے کے پابند رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم ﷺ کو مختلف معاملات میں قانون کا پابند بنا کر یہ بتایا کہ اسلام تھیا کریسی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قانون اور ضابطے کی پابندی کا نام ہے۔ اس حوالے سے میں جناب نبی کریم ﷺ ، خلافت راشدہ اور خیر القرون کے حوالے سے چند واقعات کا تذکرہ کروں گا جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد آنے والے خلفاء اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ضابطے اور دائرے کے پابند رہے ہیں۔

منہ بولے بیٹے کی حیثیت

جناب نبی کریم ﷺ نے اپنے انتہائی پیارے ساتھی حضرت زید بن حارثہؓ کو جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام بھی تھے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا، وہ زید بن حارثہؓ جنہوں نے اپنی تلاش میں آنے والے اپنے خاندان کو یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے کے بعد اب میں حضور ﷺ کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مکہ مکرمہ میں کافی عرصہ تک حضور ﷺ کی کنیت ابو زید رہی اور زید بن حارثہؓ کو زید بن

محمد ﷺ کہا جاتا رہا۔ جاہلیت کے دور میں جب لوگ کسی کو منہ بولا بیٹا بناتے تھے تو وہ پھر حقیقی بیٹا ہی شمار ہوتا تھا، وہ وراثت میں بھی شریک ہو جاتا تھا اور اس کے ساتھ حلال و حرام کے مسائل بھی وابستہ ہو جاتے تھے۔ عرب قبائل کے رواج کے مطابق منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تھا اور اس کی بیوی بہو سمجھی جاتی تھی اس لیے بیٹا فوت ہو جانے کی صورت میں بہو سے خسر کا نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ جناب نبی کریم ﷺ نے زید بن حارثہؓ کو متبنیٰ بنایا تو لوگوں نے انہیں زید بن محمدؐ کہنا شروع کر دیا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ضابطہ نازل کیا کہ یہ رواج ٹھیک نہیں ہے اس لیے جو اصل باپ ہے اسی کی طرف نسبت ہو گی اور اپنی طرف سے کسی کو باپ یا بیٹا بنا لینے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ آج کے بعد نہ کوئی زید کو زید بن محمد ﷺ کہے اور نہ کوئی مجھے ابو زید کہے، وہ حارثہؓ کا بیٹا ہے اور میں اپنی اولاد کا باپ ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جناب نبی کریم ﷺ پر ضابطہ اور قانون نازل کیا اور اس طریقے سے نازل کیا کہ آپ ﷺ کے ذریعے عرب کا یہ رواج توڑتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے جناب نبی کریم ﷺ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینبؓ کا نکاح کروایا۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر ہے **فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ (سورۃ الاحزاب:۳۷)** اور جب زید اس سے حاجت پوری کر چکا تو ہم نے آپ ﷺ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی گناہ نہ سمجھا جائے۔ جناب نبی کریم ﷺ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بتایا کہ محمد اللہ کے رسول اور نمائندے ہیں لیکن وہ بھی ہمارے قانون اور ضابطے کے پابند ہیں۔

اُمراء کے لیے الگ مجلس

ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما تھے، آپ ﷺ کی مجلس میں حضرت بلال، عمار بن یاسر، زید بن حارثہ اور عبد اللہ بن مسعود رضوان اللہ علیہم اجمعین بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ مکہ مکرمہ میں قریش کے ساتھ مخالفت کے عروج کا زمانہ تھا، ابو طالب ابھی زندہ تھے۔ کچھ قریشی سردار اکٹھے ہو کر نبی کریم ﷺ کے

پاس آئے، ان میں عتبہ اور شیبہ وغیرہ کا نام بھی آتا ہے، کہنے لگے کہ جناب ہم آپ کی بات سننا چاہتے ہیں لیکن آپ کی مجلس میں یہ جو غریب لوگ بیٹھے ہوئے ہیں ان کی موجودگی میں ہم آپ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ حضور ﷺ کے ابتدائی ساتھی معاشرے کے یہی کمزور لوگ تھے۔ قریش کے سرداروں نے کہا کہ جناب ہم آپ کے ساتھ بات چیت کے لیے تیار ہیں لیکن آپ کے ان ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنا ہمارے معاشرتی مقام کے خلاف ہے، آپ انہیں اپنی مجلس سے اٹھادیں اور ہمارے ساتھ الگ مجلس کریں پھر ہم آپ کی بات سن لیں گے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے جواب دیا کہ ہم اس بارے میں مشورہ کر کے آپ کو بتائیں گے، نبی کریم ﷺ نے اثبات یا نفی میں جواب نہیں دیا۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس بارے میں مشورہ بھی کیا، حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں ان کی اِس شرط کو قبول کر کے بات چیت کر لینی چاہیے، ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی سردار مسلمان ہو جائے تو اس سے ہم مسلمانوں کو فائدہ ہو گا۔ ابھی یہ مشاورت ہو رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمادیا وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (سورۃ الانعام: ۵۲) اور جو لوگ اپنے رب کو صبح وشام پکارتے ہیں انہیں آپ اپنے سے دور نہ کریں جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں، نہ آپ کے ذمے ان کا کوئی حساب ہے اور نہ ان کے ذمے آپ کا کوئی حساب ہے، اگر آپ نے انہیں اپنے سے دور ہٹایا تو آپ بے انصافوں میں سے ہوں گے

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ اگر آپ ﷺ نے اِن بڑوں کی خاطر اپنے کمزور ساتھیوں کو اپنی مجلس سے اٹھادیا فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ تو ہمارے ہاں آپ کا شمار بھی ظالموں میں ہو گا۔ جناب نبی کریم ﷺ جو ابھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر رہے تھے اور ابھی آپ ﷺ نے اپنا ذہن واضح نہیں کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمادیا کہ جناب اِن امراء کی معاشرتی امتیاز برقرار رکھنے کی یہ منشا پوری نہیں ہو گی۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں، اور اِس فیصلے میں بھی

بہت سی حکمتیں ہوں گی۔ اس بارے میں ایک حکمت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ اگر اس وقت رسول اللہ ﷺ چند لمحوں کے لیے یہ مجلس الگ کر لیتے تو قیامت تک امیروں کی مجلسیں غریبوں کی مجلسوں سے الگ ہو جاتیں، اگرچہ یہ ایک وقتی بات ہوتی لیکن بعد میں آنے والے سرداروں اور امراء کو یہ جواز مل جاتا اور پھر کوئی بڑا کسی غریب کو اپنے پاس نہ بیٹھنے دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ نازل فرمایا اور نبی کریم ﷺ کو اس ضابطے کا پابند کیا، قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ہم نے اپنے پیغمبر کو قانون اور ضابطے کے دائرے میں رکھا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُمت کی تعلیم کے پیش نظر حضور ﷺ کے ذہن میں کبھی کوئی ایسی بات آئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمادیا کہ جناب معاملہ ویسے نہیں ہوگا جیسے آپ سوچ رہے ہیں بلکہ ہمارے حکم کے مطابق ہوگا، یا پھر اگر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے کسی ایسے فیصلے کو قبولیت بخشی بھی تو تنبیہ کر دی کہ معاملہ اگر دوسرے طریقے سے ہوتا تو بہتر تھا۔ جیسے جناب نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقع پر فدیہ لے کر قیدیوں کی رہائی کا جو فیصلہ کیا، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے تو اس پر عملدرآمد کر لیں لیکن اصل فیصلہ وہ ہوتا جس کے لیے حضرت عمرؓ نے رائے دی تھی۔

حضور ﷺ کی شہد کے استعمال نہ کرنے کی قسم

اسی طرح شہد کے معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں آج کے بعد شہد استعمال نہیں کروں گا۔ حضور ﷺ نے امت کے لیے شہد کو حرام قرار نہیں دیا تھا صرف اپنی ذات کے لیے اس کا استعمال منع فرمایا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کے بارے میں کس انداز سے ذکر فرمایا یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌo قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُo (سورۃ التحریم: ۱۔۲) کہ اے نبی! آپ کیوں حرام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے، آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں، اور اللہ بخشنے والا نہایت رحم

والا ہے۔ اللہ نے آپ کے لیے اپنی قسموں کا توڑ دینا فرض کر دیا ہے اور اللہ ہی آپ کا مالک ہے اور وہی سب کا جاننے والا، حکمت والا ہے۔ یعنی اللہ رب العزت نے فرمایا کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا ہمارا کام ہے، آپ ایسی چیز کو اپنے لیے کیوں حرام کر رہے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، اس لیے اللہ آپ کے لیے اس بات کو فرض کر رہا ہے کہ آپ قسم توڑیں، شہد کھائیں اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کریں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے قسم توڑی، شہد کھایا، اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کیا۔ اس واقعے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے یہ تعلیم ہے کہ اللہ کا رسول کہتے ہی اسے ہیں جو اللہ کے احکامات کا پابند ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جناب نبی کریم ﷺ ہمارے رسول ہیں اور دین کے معاملے میں تمہارے لیے آخری اتھارٹی اسی لیے ہیں کہ وہ ہمارے قانون اور ضابطے کے پابند ہیں۔

اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے، ان واقعات میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تکوینی نظام کے تحت اس بات کی تعلیم کا اہتمام فرمایا کہ خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے قانون کی پابندی کا یہ تصور دیا کہ عام آدمی تو ایک طرف، افضل الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کیے گئے قانون اور ضابطے کے پابند ہیں۔

حدودِ شرعیہ کا نفاذ

حدود کہتے ہیں ان سزاؤں کو جو قرآن کریم نے متعین بیان فرما دی ہیں مثلاً چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، شادی شدہ زانی کی سزا سنگسار ہے جبکہ غیر شادی شدہ کی سزا کوڑے مارنا ہے، کسی پر بدکاری کی تہمت لگانے کی سزا قذف ہے، اور شراب کی سزا اجماعِ امت سے متعین ہے۔ جو جرائم حدودِ شرعیہ کے دائرے میں آتے ہیں ان کے متعلق عدالت میں قاضی جرم کے ثابت ہونے یا نہ ہونے پر تو بحث کر سکتا ہے لیکن جب جرم ثابت ہو جائے تو پھر قاضی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ سزا معاف کر سکے یا سزا میں کمی بیشی کر سکے۔ حد کا معنٰی

ہی یہ ہے کہ یہ معاملہ طے شدہ ہے۔ جج کے سامنے مقدمہ آئے گا تو جج اس بات کی تفتیش تو کرے گا کہ یہ جرم واقع ہوا ہے یا نہیں، لیکن جب جرم ثابت ہو جاتا ہے تو پھر سزا کے دینے میں جج کا کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا، وہ سزا بہر حال وہی دے گا جو قرآن کریم میں متعین کی گئی ہے۔

نسائی شریف میں ہے کہ حضرت صفوان بن امیہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے چوری کی، ہم نے اسے پکڑ کر پہلے تو خود لعن طعن کی اور پھر جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس نے چوری کی ہے، اس سے پوچھا گیا تو وہ مان گیا کہ ہاں میں نے چوری کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو، جب ہاتھ کٹنے کا وقت آیا تو جس شخص کی چوری ہوئی تھی اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں اسے معاف کرتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ چور کو میرے پاس لانے سے پہلے پہلے معاف ہو سکتا تھا لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ کی تعلیم یہی ہے کہ جب کوئی مجرم پکڑا جائے تو قاضی کی عدالت میں پہنچنے سے پہلے پہلے آپس میں معاملہ رفع دفع کر لیا جائے تاکہ اسے اتنی بڑی سزا نہ ملے۔ لیکن اگر مجرم قاضی کی عدالت میں پہنچ جاتا ہے اور اس پر ایسا جرم ثابت ہو جاتا ہے جو حدود اللہ سے متعلق ہے تو پھر اس کے بعد سزا میں کمی بیشی یا سزا کے معاف کر دینے میں کسی کا اختیار نہیں رہتا۔

ایک اور مشہور واقعہ جو تاریخ میں مذکور ہے کہ بنو مخزوم کی فاطمہ نامی ایک خاتون نے چوری کی، اس کا جرم ثابت ہو گیا، رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں مقدمہ گیا۔ بنو مخزوم عرب کے معروف اور باعزت قبائل میں سے تھا، ان کے لیے یہ عزت کا مسئلہ بن گیا کہ ہمارے قبیلے کی خاتون کا ہاتھ کٹے گا تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ یہ خاتون سزا سے بچ جائے، کسی نے مشورہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق سفارش کی جائے، اور سفارش کے لیے نبی کریم ﷺ کے کسی قریبی ساتھی سے بات کی جائے۔ نبی کریم ﷺ کے اس وقت سب سے زیادہ چہیتے حضرت اسامہ بن زیدؓ تھے، یہ زید بن حارثہؓ کے بیٹے تھے جنہیں کسی وقت حضور ﷺ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا

لیا تھا، اس لحاظ سے یہ آپ ﷺ کے پوتے لگتے تھے۔ ان کا لقب ہی حب رسول اللہ تھا یعنی رسول اللہ ﷺ کے محبوب نوجوان۔ مشورہ ہوا کہ اسامہ بن زیدؓ سے بات کی جائے کہ وہ حضور ﷺ سے سزا کی معافی کے بارے میں سفارش کریں، اس وقت اُسامہ پندرہ سترہ برس کے نو عمر نوجوان تھے، اسامہؓ سے بات ہوئی تو اسامہ اِس کام کے لیے تیار ہوگئے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور ﷺ آرام فرمارہے تھے، بیٹھ کر ٹانگیں دبانا شروع کیں اور پھر گفتگو کا آغاز کیا۔ یارسول اللہ ﷺ ایک گزارش کرنے آیا ہوں بنو مخزوم کی فاطمہ کا مقدمہ آپ کے پاس ہے، آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں۔ اسامہؓ نے پوچھا آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا ہے؟ فرمایا، ہاں۔ یارسول اللہ ﷺ وہ عزت والا خاندان ہے اِس سے اس خاندان کی بہت بدنامی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ جو لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا اسامہ! أتشفع فی حد من حدود اللہ کہ اللہ کے قانون کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ لوگوں کو بلاؤ، لوگ اکٹھے ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ سفارشیں تلاش کرتے ہو؟ تمہیں اس کا علم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطے اور قانون کیسے ہیں؟ تم لوگ خدا کے قانون اور حدود کو نہیں سمجھتے؟ فرمایا والذی نفس محمد بیدہ اس پروردگار کی قسم جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے لَوْ سَرِقَتْ فَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ لَقُطِعَتْ يَدَهَا او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی اس کا ہاتھ بھی کٹے گا۔

آپ نے اس معاملے کی شدت بیان کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر فاطمہؓ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹوں گا اس لیے کہ خدا کے ضابطوں میں سفارش نہیں چلتی اور اللہ کے قانون میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ جناب نبی کریم ﷺ نے قانون اور ضابطے کی پابندی کا یہ تصور دیا کہ جو بات اللہ تعالیٰ نے طے کردی ہے اسے تبدیل کرنے کا اختیار اللہ کے پیغمبر کے پاس بھی نہیں ہے، جب اللہ کے ضابطوں میں اللہ کے پیغمبر کا اختیار نہیں ہے تو اور کس کو مجال ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت

حضراتِ خلفائے راشدینؓ نے جس انداز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے قانون کی بالادستی کو اپنے عمل کے ساتھ مستحکم کیا، تاریخ ایسے بے مثال واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا معمول یہ تھا کہ صبح مسجد میں آکر تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے اور پھر فجر کے لیے مسجد میں ہی انتظار کیا کرتے تھے۔ ایک دن حسبِ معمول صبح مسجد کی طرف نکلے، قاتل گھات میں بیٹھا تھا، اس نے موقع تاک کر حضرت علیؓ پر وار کر دیا۔ حضرت علیؓ کو شدید زخمی حالت میں ان کے گھر لے جایا گیا، بڑے بیٹے حضرت حسنؓ جو حضرت علیؓ کے جانشین بھی ہوئے اور پھر جناب نبی کریم ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق انہوں نے امت کے دو بڑے طبقوں میں صلح کروا کر امت کو متحد بھی کیا۔ ان کے سامنے ان کا باپ زخمی حالت میں پڑا تھا اور موت کے آثار نمایاں تھے۔ ایسی صورت حال میں اولاد سے زیادہ غصہ کس کو ہو گا؟ حضرت حسنؓ نے طیش اور غصے میں یہ بات کہی کہ امیر المؤمنین اِس قاتل کو تو میں اپنے ہاتھ سے قتل کرنے جاتا ہوں۔ حضرت علیؓ جو زخمی حالت میں تھے، موت سامنے نظر آ رہی تھی لیکن فرمایا، حسن! جب تک میں زندہ ہوں وہ قاتل نہیں ہے، اس لیے اگر اسے مارو گے تو تم خود قاتل بنو گے، لیکن اگر میں مر گیا تو میرے مرنے کے بعد جو نئے امیر المؤمنین ہوں گے، یہ ان کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ اس قاتل کو سزا دیں۔

اس معاملے کی حساسیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ حضرت علیؓ زندگی و موت کی کشمکش میں بھی اِس قدر حاضر دماغی کے ساتھ ضابطے اور قانون کی بات فرما رہے ہیں کہ جب تک میں زندہ ہوں وہ شخص قاتل نہیں ہے اور میرے شہید ہونے کی صورت میں جو نیا امیر المؤمنین بنے گا، یہ اس کا کام ہے کہ وہ قاتل کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچا دے۔ چنانچہ اپنے بیٹے سے فرمایا کہ تمہیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ تم قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس شخص کو قتل کر دو۔ یہ ان مثالوں میں سے ایک مثال ہے جو جناب نبی کریم ﷺ کے خلفاء نے قائم کیں اور دنیا کو بتایا کہ قانون کی بالادستی کسے کہتے ہیں۔

حضرت عثمان غنیؓ کا محاصرہ

امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفانؓ کا باغیوں نے محاصرہ کر رکھا تھا جبکہ اکثر صحابہ کرامؓ حج پر گئے ہوئے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا کہ امیر المؤمنین یہ چند سو باغی ہیں، آپ اپنے لشکر کو حکم دیں، دو تین گھنٹے میں ان کا صفایا ہو جائے گا۔ حضرت عثمانؓ جن کے تابع پورا عرب تھا، ان کے زمانے میں تو بلوچستان اور کابل تک اسلامی سلطنت آگئی تھی۔ فرمایا، دیکھو، رسول اللہ ﷺ نے کسی مسلمان کے قتل کی اجازت تین صورتوں میں دی ہے۔ پہلی صورت یہ کہ وہ کسی کو قتل کرے تو قصاص میں اسے قتل کیا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ مرتد ہو جائے تو اسے قتل کیا جائے گا، اور تیسری صورت یہ ہے کہ بغاوت کرے تو اس جرم میں اسے قتل کیا جائے گا۔ ابھی تک ان تین صورتوں میں سے کوئی ایک جرم بھی انہوں نے نہیں کیا اس لیے میں اس وقت تک کوئی اقدام نہیں اٹھاؤں گا اور کسی کو تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دوں گا جب تک میں شوریٰ والوں سے مشورہ کر کے ان کا جرم متعین نہیں کر لیتا۔ صورتحال یہ تھی کہ کھانا اور پانی تک بند تھا، باغی باہر سے کسی کو اندر نہیں آنے دے رہے تھے، چھپ چھپا کر کوئی اکا دکا آدمی اندر آجاتا تھا۔ سوال ہوا کہ حضرت اگر ان باغیوں کے خلاف آپ نے تلوار نہیں اٹھانی تو پھر ان کا مطالبہ تسلیم کریں۔ فرمایا، یہ بھی نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ عثمان! اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائیں گے، لوگ زبردستی اسے اتارنا چاہیں گے، لیکن تم نہ اتارنا۔ فرمایا، میں نہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کروں گا اور نہ اپنی زندگی میں کسی مسلمان کے خلاف تلوار اٹھاؤں گا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اسلام کا سیاسی نظام خلافت ہے نہ کہ پاپائیت یا تھیا کریسی۔ جناب نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفاء نے قانون اور ضابطے کو اپنی ذات پر مقدم رکھنے کی ایسی مثالیں پیش کیں کہ جن کی روشنی میں اسلامی نظام کو تھیا کریسی قرار دینے والوں کو بے انصاف کہے بغیر چارہ نہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا احتساب

امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ تابعین میں سے تھے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کا پرتو تھے، انہوں نے واقعی حضرت عمرؓ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے حکومتی نظام میں بہت سی اصلاحات کیں، مورخین کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیزؒ جب مدینہ کے گورنر تھے تب مدینہ سے دمشق جاتے ہوئے ان کا ذاتی سامان ایک سو اونٹوں پر لدا ہوتا تھا، جو لباس صبح کے وقت پہنتے تھے، شام کے وقت نہیں پہنتے تھے، جو خوشبو وہ استعمال کرتے تھے بڑے بڑے امراء کو نصیب نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ایسی شہزادگی کا دور بھی گزارا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی کایا کیسے پلٹی اور امیر المؤمنین بننے کے بعد انہوں نے کیا فیصلے کیے؟ ان کی اہلیہ فاطمہ بنت عبد الملکؒ تھی جو کہ خود بھی ایک بڑے اموی خلیفہ کی بیٹی تھی، اس کا گھر سامان اور زیورات سے بھرا پڑا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ بننے کے بعد گھر آئے اور آکر اپنی اہلیہ سے کہا کہ فاطمہ! بات سنو، مجھ سے پہلے خلیفہ نے مجھے نامزد کیا تھا اور اب لوگوں نے میری بیعت کر لی ہے، میں لوگوں پر امیر بنا دیا گیا ہوں، امیر المؤمنین کی حیثیت سے جو اقدامات مجھے کرنے ہیں، ان کی ابتداء میں اپنے گھر سے کر رہا ہوں۔ یہ جو تمہارے گھر میں سامان پڑا ہے، یہ کپڑے، یہ زیورات، یہ فرنیچر، یہ سب تمہارے ذاتی پیسوں سے نہیں آئے، یہ تمہارے باپ اور بھائیوں نے تحفے میں دیا تھا، لیکن یہ سب بیت المال کا سامان ہے، مجھے سب سے پہلے بیت المال کی چیزیں بیت المال کو واپس بھجوانی ہیں۔ اپنی اہلیہ سے کہا کہ فاطمہؒ دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو، اگر یہ سامان رکھنا ہے تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گا، اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو ان میں سے ایک ایک چیز واپس کرنا ہو گی۔

فاطمہ بنت عبد الملکؒ ایک سمجھدار خاتون تھی، اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! میرا زیور بھی آپ ہیں اور میرا لباس بھی آپ ہیں۔ تاریخ نے پہلی بار دیکھا ہو گا کہ کسی شخص نے حکمران بننے کے بعد گھر میں سامان لانے کے بجائے گھر کا سامان باہر نکال دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ فاطمہ بنت عبد الملکؒ کے پاس بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ بچا، اس اللہ کی بندی

نے بھی باقی کی زندگی اسی طرح گزاری جس طرح عمر بن عبد العزیزؒ نے گزاری، ورنہ جس عورت نے ایک شہزادی کی زندگی گزاری ہو کیا وہ ایک لحہ بھی ایسی زندگی سے محروم رہ سکتی ہے؟ اس کے بعد امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے سارے خاندان کو اکٹھا کیا کہ میں امیر المؤمنین بنادیا گیا ہوں، جس کسی کے پاس بیت المال کا کوئی بھی سامان ہے اسے وہ بیت المال کو واپس کرنا ہوگا، لیکن اس کی ابتداء انہوں نے اپنے گھر سے کی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تقریباً اڑھائی سال حکومت کی تھی کہ انہیں زہر پلا دیا گیا، لیکن انہوں نے ایک بار پھر حضرت عمر فاروقؓ کے دور کی یاد تازہ کر دی تھی کہ انصاف کی حکومت کسے کہتے ہیں اور خلافت کا نظام کیسا ہوتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کا قیصر روم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ

ہم تاریخ میں جب خلفاء کا ذکر کرتے ہیں تو نرمی کے دور کا آغاز حضرت معاویہؓ سے کرتے ہیں۔ خلفاء راشدین کا زمانہ تو بہت اعلیٰ معیار کا زمانہ تھا اس لیے حضرت معاویہؓ کی حکومت کو خلفائے راشدین کے مقابلے میں نرم حکومت کہا جاتا ہے، ایسی حکومت جس کی بنیاد رخصتوں پر تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں دو سپر طاقتیں تھیں، ایک دمشق اور دوسری روم۔ ایک طرف قسطنطنیہ کے علاقوں میں قیصر روم کی بڑی طاقت تھی، دوسری طرف اسلامی سلطنت تھی جس کا دار الحکومت دمشق تھا۔ حضرت معاویہؓ مسلمانوں کے متفقہ امیر تھے اور بڑے ذہین سیاست دان تھے، انہیں عرب کے چوٹی کے مدبرین میں شمار کیا جاتا ہے، بڑے ٹھنڈے، دھیمے اور سمجھدار آدمی تھے، انہوں نے ہی رومیوں کے خلاف پہلی جنگ لڑی۔

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ ایک موقع پر قیصر روم کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا ایک معینہ مدت کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ تھا، جب معاہدے کی مدت ختم ہونے کا وقت قریب آیا تو حضرت معاویہؓ نے دمشق سے لشکر تیار کیا اور سرحد کی طرف چل دیے، منصوبہ یہ تھا کہ معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے پہلے لشکر لے کر سرحد پر پہنچ جائیں اور جیسے ہی

مدت ختم ہو رومیوں پر چڑھائی کر دیں۔ اپنے ملک میں تو نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی، چنانچہ حضرت معاویہؓ اپنی کمان میں ہزاروں کا لشکر ساتھ لیے سرحد کی طرف رواں دواں تھے، ابھی چند دن کا سفر طے ہوا تھا کہ دیکھا کہ ایک آدمی دمشق کی طرف سے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آرہا تھا۔ اس زمانے میں غیر معمولی طور پر اہم خبریں تیز رفتار گھڑ سواروں کے ذریعے پہنچائی جاتی تھیں۔ جب قریب آئے تو وہ عمرو بن عبسہؓ تھے۔ حضرت عمرو بن عبسہؓ بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ وہ آواز دیتے آرہے تھے معاویہ وفاء لا غدر، معاویہ وفاء لا غدر کہ معاویہ! وفا کرنی چاہیے، غدر نہیں کرنا چاہیے، معاویہ! معاہدہ پورا کرنا چاہیے، توڑنا نہیں چاہیے۔ جب قریب پہنچے تو حضرت معاویہؓ نے پہلے تو حال احوال پوچھا، پھر پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ حضرت عمروؓ نے پوچھا کہ کیا آپ کا قیصر روم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ نہیں ہے؟ جواب ملا، معاہدہ تو ہے۔ پوچھا، کیا مدت ختم ہوگئی ہے؟ بتایا، نہیں ابھی تو مدت ختم نہیں ہوئی۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میں یقین دلاتا ہوں کہ مدت ختم ہونے سے قبل لڑائی نہیں کروں گا، میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے تک لشکر لے کر سرحد پر پہنچ جاؤں۔ حضرت عمروؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ ہو تو معاہدے کی مدت ختم ہونے تک اپنی فوجوں کو مرکز سے حرکت مت دو۔ حضرت معاویہؓ چونک پڑے اور پوچھا کیا آپ نے خود سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے ان کانوں نے سنا ہے، میرے دل نے اس بات کو محفوظ رکھا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے لشکر کو حکم دیا کہ واپس دمشق چلو کہ اب کسی چال، کسی تدبیر، اور کسی حکمت عملی کی کوئی حیثیت نہیں اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم سامنے آگیا ہے، چنانچہ سب انہی قدموں پر دمشق واپس آگئے۔

"خلافت" پاپائیت یا تھیا کریسی نہیں ہے

اسلام کے سیاسی نظام کا نام خلافت ہے اور خلافت حکمرانی کا نہیں بلکہ ذمہ داری کا نام ہے، اسلام میں پاپائیت کا تصور نہیں ہے کہ خلیفہ جو بات کہہ دے وہی حرفِ آخر ہے۔

خلافت کے نظام میں خلیفہ آخری اتھارٹی ہے لیکن وہ بھی ضابطے کا پابند ہے اور اس کے گرد بھی قانون کا حصار ہے۔ خلیفہ کا معنٰی کیا ہے؟ خلیفہ کا لفظی معنٰی "نائب" کا ہے اور نائب کے اپنے کوئی اختیارات نہیں ہوتے بلکہ وہ جس کا نائب ہوتا ہے اس کی بات لے کر آگے بڑھتا ہے۔ آج یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام تھیاکریسی ہے اور مسلمان خلافت اور خدا کی نمائندگی کے نام پر دنیا بھر میں مذہب کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ خلیفہ کسے کہتے ہیں؟ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو آپ کا لقب خلیفۃ رسول اللہ تھا یعنی اللہ کے رسول کے خلیفہ۔ حضرت عمر فاروقؓ جب خلیفہ بنے تو ان کا لقب ہوا خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ یعنی رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کے خلیفہ۔ ابتدائی چند دن تو یہی کہا جاتا رہا یا خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ لیکن پھر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہوئی اس طرح تو اگلے خلیفہ کے ساتھ تین دفعہ "خلیفہ" آئے گا۔ ایک دن حضرت عمرؓ کو حضرت عمرو بن العاصؓ نے "یا امیر المومنین" کہہ کر پکارا تو حضرت عمرؓ نے اس خطاب کو پسند کیا چنانچہ اس کے بعد سے اسلامی حکومت کے سربراہ کے لیے امیر المؤمنین کی اصطلاح رائج ہوگئی۔

حضرت صدیق اکبرؓ جنہیں خلیفۃ رسول اللہ کہا جاتا تھا، ایک دن ایک صحابی نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہہ دیا یا خَلِیْفَۃَ اللہِ اے اللہ کے خلیفہ۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا لَسْتُ بِخَلِیْفَۃِ اللہِ اَنَا خَلِیْفَۃُ رَسُوْلِ اللہِ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ میں رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے تو اس ایک جملے سے تھیاکریسی کا قصہ صاف کر دیا تھا۔ اللہ کے خلیفہ ہونے کا تصور کیا ہے؟ یہی کہ میں خدا کا خلیفہ ہوں میرے ساتھ خدا کا براہ راست تعلق ہے اور میری جو بات بھی ہے در اصل خدا ہی کی بات ہے۔ فرمایا کہ انبیاء خدا کے خلیفہ تھے، حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات خدا کی خلافت کرتے تھے، میں خدا کا نہیں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ جو متعین حدود و قوانین اور ضوابط دے کر گئے ہیں وہ سب کے سامنے ہیں اور ایسا کوئی معاملہ نہیں بچا کہ جس کے متعلق خلیفہ خدا سے پوچھ کر بتائے، اس لیے ہم یہ گنجائش نہیں رکھنا چاہتے کہ کوئی خلیفہ یہ بات کہہ سکے میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہوں۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک جملے کے ساتھ ساری بات صاف کر دی کہ اسلام تھیاکریسی کا نام نہیں ہے اور اسلام کے حکومتی نظام خلافت میں پاپائیت کا اور خدا کی نیابت میں حکومت کرنے کا تصور نہیں ہے، اسلام میں خلافت قانون کی بالادستی کا نام ہے، جس طرح ایک عام آدمی قانون کا پابند ہے اسی طرح ایک خلیفہ بھی قانون کا پابند ہے۔ عام آدمی خلاف ورزی کرے گا تو خلیفہ پکڑے گا جبکہ خلیفہ خلاف ورزی کرے گا تو ایک عام آدمی پکڑے گا، دونوں ایک دوسرے کے محتسب ہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے خود بھی قانون کی بالادستی کی حکومت قائم کی اور قانون کی بالادستی کا ایک نظام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس لیے اسلام کے بارے میں یہ بات کہنا ناانصافی ہے کہ اسلام پاپائیت ہے۔ اسلام میں جس طرح ایک عام آدمی ضابطے اور قانون کا پابند ہے اسی طرح ایک حکمران حتیٰ کہ اللہ کے رسول بھی ضابطے کے پابند ہیں۔

معاشی انصاف اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام سے انسانی نسل کی تخلیق کی اور نسل انسانی کے بتدریج ارتقاء کے ساتھ انسانی معاشرہ قائم ہوا۔ کھانا پینا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، میل ملاقات، بیماری وصحت، حقوق و معاملات وغیرہ، انسانی معاشرے کے یہ عوامل شروع ہی سے انسان کے ساتھ چلے آرہے ہیں اور انسانی زندگی کی ضروریات انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہیں۔ بنیادی ضروریات تو تمام انسانوں کی ایک جیسی ہوتی ہیں تاہم انفرادی ضروریات انسان کے ذوق، قابلیت اور ترجیحات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ انسان کی ضروریات کیسی بھی ہوں وسائل کے ذریعے سے پوری ہوتی ہیں کیونکہ یہ دنیا وسائل اور اسباب کی دنیا ہے، اسباب اور وسائل کے بغیر اس دنیا میں زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ضابطے کے خلاف ہے۔ ایک وقت آئے گا جب انسانی زندگی جنت میں وسائل و اسباب کی محتاج نہیں ہوگی اور وہاں انسان کو اپنی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے محنت و مشقت کا راستہ اختیار نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن اس دنیا میں بہر حال اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی زندگی کو محنت و مشقت اور وسائل و اسباب کے ساتھ وابستہ کیا ہے، یوں نسلِ انسانی کے تمام لوگ کسی نہ کسی درجے میں اسباب اختیار کر کے ہی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

نسلِ انسانی میں انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والتسلیمات سے زیادہ متوکل اور ان سے زیادہ دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا کوئی دوسرا طبقہ نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء کرامؑ نے بھی زندگی کے وسائل و اسباب اختیار کیے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے مختلف

مراحل میں حسب ضرورت محنت مزدوری بھی کی، بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی۔ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ خود فرمایا کہ میں نے فلاں قبیلے کی بکریاں اتنی اجرت پر چرائی تھیں، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عام طور پر انبیاء کرام سے بکریاں چرانے کا کام لیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سے بکریاں چرانے کا کام اس لیے لیا کہ بکریوں کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے، بھیڑوں کو قابو کرنا آسان ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ دوسری بھیڑ کے پیچھے چلتی ہے لیکن ایک بکری دوسری بکری کے پیچھے نہیں چلتی۔ حضرت موسیٰؑ کے بکریاں چرانے کا قرآن کریم میں ذکر ہے کہ ان کا باقاعدہ آٹھ یا دس سال کا معاہدہ تھا جس کے تحت انہوں نے حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں۔ چنانچہ اسباب و وسائل کا اختیار کرنا اس دنیا میں لازمی ہے۔

اسباب اختیار کرنے میں توازن

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اسباب اختیار کیے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی لیکن آپ ﷺ نے اس سلسلے میں ایک توازن قائم کیا، آپ ﷺ نے اسباب کو ترک کرنے سے بھی منع فرمایا ہے اور اسباب پر مکمل بھروسہ کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی شخص سوال لے کر آتا تھا تو حضور ﷺ اس کی حالت کو پرکھتے تھے اگر وہ معذور یا مستحق ہوتا تو آپ ﷺ اس کی مدد فرماتے تھے لیکن اگر صحت مند اور کمانے کے قابل ہوتا تو اس کی رہنمائی فرماتے تھے، آپ ﷺ اسے محنت و مزدوری کی تلقین کرتے اور کمانے کی ترغیب دیتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ سے عرض کی کہ یارسول اللہ! محتاج ہوں میری مدد فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے اللہ کے بندے تم تندرست اور صحت مند آدمی ہو، محنت مزدوری کر کے کما سکتے ہو اس لیے جاؤ اور اپنے لیے کماؤ۔ اس نے کہا کہ یارسول اللہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تمہارے پاس گھر میں کچھ بھی نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ گھر میں صرف لکڑی کا ایک پیالہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اور گھر سے وہ پیالہ لے آؤ، وہ شخص گیا اور جا کر پیالہ لے آیا۔ آپ ﷺ نے پیالہ لے کر مجلس میں اس کی بولی دی اور

پوچھا کہ کوئی اس پیالے کی کتنی قیمت دے گا؟ ایک شخص نے کہا کہ میں ایک درہم دیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے؟ ایک شخص نے کہا کہ ڈیڑھ درہم دیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا کیا کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے؟ ایک نے کہا کہ دو درہم دیتا ہوں۔ فرمایا لاؤ، اس طرح آپ ﷺ نے وہ پیالہ نیلام کر کے بیچ دیا۔ اس رقم سے نبی کریم ﷺ نے کلہاڑی کا پھل خریدا اور اپنے ہاتھ سے لکڑی کا دستہ اس میں ڈالا۔ پھر اس سوال کرنے والے شخص سے فرمایا کہ یہ کلہاڑی لے کر جنگل میں جاؤ، لکڑیاں کاٹو اور لا کر بازار میں بیچو، چند دن بعد آکر مجھے بتانا کہ کیا صورت حال ہے۔ وہ شخص کلہاڑی لے گیا، چند دن گزرے تو وہ شخص دوبارہ آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں حسب حکم حاضر ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا صورتحال ہے؟ اس نے بتایا کہ یا رسول اللہ گھر میں آٹا بھی ہے، کھجوریں بھی ہیں اور کھانے پینے کے برتن بھی ہیں۔ فرمایا یہ حالت بہتر ہے یا پہلے والی حالت بہتر تھی؟

اسباب ترک کرنے سے ممانعت

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباب ترک کرنے سے منع فرمایا ہے، فرمایا کہ توکل اسباب ترک کر دینے کا نام نہیں ہے کہ انسان اسباب کو بالکل چھوڑ دے۔ ایک دفعہ جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کہیں سے ایک مہمان آیا، آپ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ کوئی باہر سے مہمان آتا تو آپ ﷺ پہلے اس سے کھانے پینے کے متعلق پوچھتے، سواری کے جانور کے متعلق پوچھتے کہ اسے کہاں باندھا ہے اس کی خوراک وغیرہ کا انتظام کیا ہے اور رہنے کا بندوبست کہاں ہے؟ کوئی دور سے آدمی آتا تو آپ ﷺ اس سے اِن ضروریات کے متعلق دریافت فرماتے۔ آپ ﷺ نے اس شخص سے پوچھا کیسے آئے ہو؟ اس نے بتایا کہ اونٹ پر آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ اونٹ کہاں ہے؟ کہنے لگا کہ باہر چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے پوچھا باہر کہاں چھوڑ دیا ہے؟ اس نے کہا کہ بس اللہ کے توکل پر باہر چھوڑ آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، بندۂ خدا توکل اس کا نام نہیں ہے پہلے جا کر اس کی رسی کسی جگہ پر باندھو اور پھر اللہ پر توکل کرو۔ یعنی اس کی حفاظت کا جتنا بندوبست تمہارے ذمے

ہے وہ تم کرو اور اس کے بعد اسے اللہ کے بھروسے پر چھوڑو۔ رسول اللہ ﷺ نے تعلیم یہ دی کہ جو تمہارے بس میں ہیں وہ اسباب اختیار کرو اور پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دو۔ اس لیے کہ اسباب کا اختیار کرنا انسان کے بس میں ہے لیکن نتیجہ انسان کے بس میں نہیں ہے، اسباب پر بھروسہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسباب کے پیدا کرنے والے پر بھروسہ ہونا چاہیے کہ اے اللہ جو میرے بس میں تھا میں نے کر دیا ہے اب تو مہربانی فرما۔

اسلامی نظام معیشت کا بنیادی اصول

آج کی دنیا کے مروجہ معاشی علوم نے فلسفے اور سائنس کے طور پر گزشتہ چند صدیوں میں منظم شکل اختیار کی ہے، لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں خلفائے راشدینؓ نے آج سے کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال قبل اسلامی نظام حکومت کے تحت معاشی حقوق اور معاشی عدل کا ایک عظیم الشان تصور قائم کر دیا تھا اور پھر اپنی زندگیوں میں اس تصور کے عملی نمونے بھی پیش کر دیے تھے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے تو ایک ہی جملے میں اسلام کے نظام معیشت کا خلاصہ بیان فرما دیا کہ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ **(سورۃ الحشر:۷)** تاکہ دولت تمہارے دولتمندوں میں ہی نہ گھومتی رہے۔

اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ نے ضرورت مندوں کے حقوق بیان کیے، پھر یہ جملہ فرمایا کہ یہ دولت تقسیم کرنے کا نظام ہم نے اس لیے دیا ہے تاکہ دولت صرف دولتمندوں میں ہی نہ گھومتی رہے بلکہ سارے معاشرے میں گردش کرے۔ اسلام کے معاشی نظام کا مقصد ہی یہ ہے کہ دولت معاشرے میں صرف مالداروں کے پاس ہی نہ رکی رہے بلکہ ایک خودکار طریقے پر معاشرے کے تمام طبقات میں تقسیم ہوتی رہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ معاشرے میں دولت کی مثال ایسے ہے جیسے انسانی جسم میں خون، کیونکہ جسم کے ہر حصے کو اپنی ضرورت کے مطابق خون ملتا رہے تو جسم کا نظام ٹھیک چلتا رہتا ہے۔ انگلی کی ضرورت الگ ہے، کان کی ضرورت الگ ہے اور بالوں کی ضرورت الگ ہے، یوں کسی عضو کو کم ضرورت ہے اور کسی کو زیادہ۔ اگر جسم کے کسی حصے میں خون ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو وہاں پھوڑے پھنسیاں

بن جاتے ہیں، جلد خراب ہو جاتی ہے اور پیپ پیدا ہو جاتی ہے، ضرورت سے زیادہ خون جلد کو فاسد کر دیتا ہے، جبکہ ضرورت سے کم خون فالج کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے خون کا پورے جسم میں ایک تناسب اور توازن کے ساتھ گردش کرنا اچھی صحت کے لیے ضروری ہے۔ یہی اصول قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ دولت کا معاشرے میں ایک تناسب کے ساتھ گردش کرنا لازمی ہے، ہر ایک کو اس کا حصہ ملنا ضروری ہے اور دولت کا کسی ایک جگہ بلا ضرورت جمع ہو جانا نظام معیشت کی خرابی کا باعث ہے۔

دولت کی گردش

چنانچہ دو چیزیں اسلامی نظام میں ایسی ہیں جو دولت کی تقسیم اور گردش کا ذریعہ ہیں: (۱) وراثت (۲) زکوٰۃ۔

ایک آدمی ساری زندگی محنت کر کے جو جائیداد بناتا ہے، وہ اس کے فوت ہونے کے بعد اس کی اولاد میں تقسیم کر دی جاتی ہے، اگر اس کی اپنی اولاد نہ ہو تو پھر یہ جائیداد رشتہ داروں میں درجہ بدرجہ تقسیم ہوتی ہے۔ اسی طرح جب اس آدمی کی اولاد کی وفات کا وقت آتا ہے تو ان کی جائیداد آگے ان کی اولاد میں تقسیم ہو جاتی ہے، یوں تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ معاشرے میں دولت کی گردش کو جاری رکھتا ہے، اور یہی وراثت کا اصل مقصد ہے کہ وراثت کی تقسیم دولت کو ایک جگہ پر منجمد نہیں رہنے دیتی۔

زکوٰۃ بھی دولت کو تقسیم کرتی ہے کہ دولتمند لوگ اپنی دولت کا چالیسواں حصہ ہر سال فقراء، غرباء و مساکین کو دیتے ہیں، زکوٰۃ کے ذریعے مجموعی طور پر ایک خطیر رقم معاشرے کے نادار لوگوں تک ہر سال پہنچتی رہتی ہے۔ زکوٰۃ کے احکام دولت کی جنس کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اسلام نے دولت کی تقسیم ایسے نظم کے تحت کی ہے جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے، اور جس میں حقوق کا تعین مساوات کی بنیاد پر ہے۔

ریاست کی طرف سے وظائف کی تقسیم

تاریخ میں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کے درمیان ایک دلچسپ اختلاف مذکور ہے، خلافت راشدہ کے قیام کے بعد جو پہلا باضابطہ اختلاف ہوا جس میں حضرت ابو بکرؓ اپنے موقف پر قائم رہے اور حضرت عمرؓ اپنے موقف پر قائم رہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ جب خلیفہ بنے تو سب سے پہلا مال بحرین سے آیا، حضرت بلالؓ جو مہم پر تھے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات سے چند روز بعد واپس آئے، بحرین سے جتنا مال آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اتنا مال کہیں سے نہیں آیا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے شوریٰ والوں کو بلایا کہ بھئی مال آیا ہے اور تقسیم کرنا ہے لیکن پہلے ہمیں تقسیم کے اصول طے کرنے ہوں گے کہ کس کو کتنا حصہ ملے، اس پر شوریٰ کے اراکین میں بحث ہوئی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا موقف : حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ وظائف کی تقسیم میں فضیلت کے درجات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً ازواجِ مطہرات کو سب سے زیادہ دیا جائے، پھر مہاجرین کو، پھر انصار کو اور اس کے بعد دوسرے مسلمانوں کو اور اس کے لیے باقاعدہ درجہ بندی کی جائے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے یہ تھی کہ فضیلت کا تعلق آخرت سے ہے، اس کا لحاظ بروز قیامت ہوگا کہ جو زیادہ فضیلت والا ہے وہ جنت میں زیادہ اونچے درجات پر پہنچے گا، جنت کے درجات ثواب کے حساب سے ہوں گے، یعنی فضیلت کا تعلق آخرت میں ثواب اور اجر سے ہے۔ جبکہ یہ دنیا اسباب اور حقوق کی دنیا ہے، اس دنیا کے معاملات حقوق پر ہیں اور حقوق میں سب برابر ہیں، رعیت میں سب یکساں حقوق کے حصے دار ہیں، اس لیے جتنا حصہ مہاجر کو ملنا چاہیے اتنا ہی انصاری کو ملنا چاہیے، وظیفہ سب کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اڑھائی سے تین سالہ دور خلافت میں یکساں حصے تقسیم کیے گئے، جو حصہ حضرت عائشہؓ کو ملا وہی حضرت بلالؓ کو ملا، جو بدری کو ملا وہی احد والے کو ملا۔

یہاں ایک فرق ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے موقف کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جس کے پاس زیادہ ہے اس سے چھین کر سب کو برابر دیا جائے بلکہ اس

کا مطلب یہ تھا کہ جو حقوق ریاست دیتی ہے ان حقوق میں برابری ہو، جو وظیفے بیت المال دیتا ہے اس میں سب کے ساتھ برابری کا معاملہ ہو، اب جس کو پیسے ملے ہیں اس کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ اس رقم کو کیسے استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک باپ نے اپنے دو بیٹوں کو اپنی کمائی میں سے دس دس ہزار روپے دیے، اس نے اولاد کے ساتھ برابری کا حق ادا کر دیا۔ اب یہ عین ممکن ہے کہ اولاد میں سے ہر ایک کی صلاحیتیں اور ذوق دوسرے سے مختلف ہوں، ایک نے رقم جمع کر کے کوئی کاروبار کیا اور اگلے سال تک زیادہ پیسے بنا لیے۔ دوسرے نے اپنی روز مرہ ضروریات اتنی بڑھالیں کہ اسی پر سب پیسے خرچ ہو گئے اور سال کے آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ بچا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے یہ تھی کہ ریاست سب کے ساتھ برابری کرے، اس میں ترجیحات نہ ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ کا موقف :حضرت عمر فاروقؓ خود مجتہد اور صاحب علم آدمی تھے، حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ میں جو فضیلت کے درجات ہیں، اس کے حساب سے تقسیم کے حصے طے ہونے چاہئیں۔ اس لحاظ سے سب سے زیادہ حصہ ازواج مطہرات کو ملنا چاہیے، اس سے کم حضور ﷺ کے باقی خاندان کو یعنی بیٹیاں وغیرہ، پھر مہاجرین و انصار کو۔ اسی طرح مختلف غزوات میں شریک ہونے والوں میں بھی ترجیح ہونی چاہیے کہ بدر والوں کو زیادہ ملے اور باقی غزوات والوں کو درجہ بدرجہ ان سے کم ملنا چاہیے، یعنی مال کی تقسیم فضیلت کے اعتبار سے ترجیحات کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق مسلمانوں کے دلوں میں جو عقیدت کی ترجیحات ہیں اور جو فضیلت کے درجات ہیں ان کے مطابق دولت تقسیم ہو۔ مثلاً جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ میں ترتیب بیان فرمائی ہے وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ(9-100) اور سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں مہاجرین اور انصار اور جو نیکی میں ان کے پیروی کرنے والے ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے اپنی دیانت دارانہ رائے کے مطابق فہرستیں مرتب کرائیں اور فضیلت کے اعتبار سے تقسیم کا نظام قائم کیا۔ حضرت عمرؓ کی

خلافت کے دس سال یہی طریقہ کار چلتا رہا۔ کتاب الخراج میں امام ابو یوسفؒ روایت نقل کرتے ہیں کہ آخری سال ایک مجلس میں حضرت عمرؓ نے یہ بات کہی کہ بھئی بات سنو، میں نے شیخ (حضرت ابو بکرؓ) کی رائے سے اختلاف کیا تھا، اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی بات ٹھیک تھی۔ اس لیے کہ ترجیحات میں جب تفاوت ہوا تو معاشرے میں مختلف طبقات بن گئے، اور یہ فطری بات ہے کہ جب لوگوں کے ساتھ لین دین مختلف ہو گا تو اس سے مختلف طبقات بھی بنیں گے۔ جیسے مثال کے طور پر عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں سرکاری ملازمین میں جو گریڈ سسٹم ہے، وہ ہمارے ہاں تعارف کی بنیاد ہی بن گیا ہے، کسی سرکاری ملازم کا ذکر ہوتا ہے تو ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ فلاں گریڈ کا ٹیچر ہے یا فلاں گریڈ کا افسر ہے۔ بلکہ یہ گریڈ سسٹم معاشرے میں تفاوت کا سبب بھی بن گیا ہے کہ اونچے گریڈ والے کو نچلے گریڈ والے سے کوئی کام پڑ جائے تو وہ اس سے درخواست کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے تفاوت کے اصول پر وظائف تقسیم کیے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی منظور تھا۔ لیکن آخری سال یہ اعتراف فرمایا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی رائے میری رائے کے مقابلے میں زیادہ ٹھیک تھی، آئندہ سال اگر مجھے موقع ملا تو میں خلیفہ اول کا سسٹم بحال کر دوں گا، لیکن حضرت عمرؓ کو آئندہ سال موقع نہ ملا کہ انہیں شہید کر دیا گیا۔ جبکہ حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے پہلے موقف کے حامی تھے، چنانچہ وہی نظم چلتا رہا۔

دولت کی تقسیم میں ریاست کا صوابدیدی اختیار: یہاں علماء نے بڑی دلچسپ بحث کی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی آراء ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں، دونوں نے بحیثیت امیر المؤمنین اپنی اپنی رائے پر عمل کیا، جبکہ صحابہؓ نے دونوں کا ساتھ دیا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کی گنجائش رکھی ہے۔ یہ حالات پر منحصر ہے کہ اگر حالات کا تقاضا برابری کا ہو تو اس کے لیے خلیفہ اول کی مثال سامنے ہے، اور اگر حالات کا تقاضا ترجیحات کا ہو تو اس کی گنجائش بھی ہے کہ خلیفہ دوم نے اسی پر عمل کیا ہے۔ اگر اسلامی حکومت اپنے ملک میں حالات محسوس کرے

کہ برابری کی ضرورت ہے تو اس کی گنجائش بھی موجود ہے، لیکن اگر ترجیحات کی ضرورت ہو تو اس کی مثال بھی موجود ہے۔

غزوۂ حنین کے دو اہم واقعات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں غزوۂ حنین ایک مشہور معرکہ ہے، بنو ھوازن کے ساتھ لڑائی تھی اور وہ لوگ ان گنت جانور اور بے تحاشا مال و دولت ساتھ لے کر میدان جنگ میں آئے تھے، جس میں سونا وغیرہ بھی تھا، فتح کے نتیجے میں یہ سب مال غنیمت کی صورت میں مسلمانوں کے ہاتھ آگیا، اس غزوہ میں مسلمانوں کو مال بھی بہت ملا اور قیدی بھی بہت ہاتھ آئے۔ دستور کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت بھی تقسیم فرمادیا اور قیدی بھی بطور غلام تقسیم فرمادیے۔ اس غزوہ میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔

انصارِ مدینہ کی فضیلت: ایک تو یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے مال کی تقسیم میں نو مسلموں کو ترجیح دی، خاص طور پر جو لوگ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے ان کو زیادہ نوازا۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ لوگ شکست کے بعد ایسی صورت حال میں مسلمان ہوئے تھے کہ بظاہر ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا اس لیے حضور ﷺ نے حوصلہ افزائی کے لیے ان لوگوں کو زیادہ حصہ دیا کہ ان کے دل میں مجبوری یا جبر کے ساتھ مسلمان ہونے کا خیال نہ آئے، اب اتفاق کی بات یہ تھی کہ ان میں حضور ﷺ کے خاندان کے افراد زیادہ تھے۔ چنانچہ انصارِ مدینہ میں سے کسی نوجوان کی زبان پر یہ بات آگئی کہ ماریں ہم کھاتے رہے اور سونا چاندی یہ لوگ لے گئے۔ انسان کمزور ہے کبھی ایسی بات زبان پر آجاتی ہے، کہنے والے کے دل میں یہ خیال آگیا کہ بدر میں، احد میں، خندق میں ہم نے لڑائیاں لڑیں اور آج دولت کی تقسیم کی باری آئی ہے تو قریشی غالب آگئے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ انصار مدینہ ایک جگہ اکٹھے ہوں۔ یہ ایک بہت عظیم طبقہ تھا جتنی قربانیاں انصار مدینہ نے دیں اور جتنا ایثار انہوں نے دکھایا دنیا کا اور کوئی طبقہ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جب انصار اکٹھے ہوئے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا، مجھے یہ بات پہنچی

ہے کہ تم میں سے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ماریں کھانے اور لڑائیاں لڑنے میں ہم آگے رہے جبکہ مال غنیمت کا سونا چاندی اور مال مویشی قریش والے لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو تو میں نے اس لیے زیادہ دیا ہے کہ یہ نو مسلم ہیں اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم انصار لوگوں کی خدمات اور قربانیاں میری نظروں سے اوجھل نہیں ہیں والذی نفس محمد بیدہ لو سلک الناس وادیاً وسلکت الانصار وادیاً لسلکت وادی الانصار اس پروردگار کی قسم جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر ساری دنیا کے لوگ ایک طرف چل پڑیں اور انصار دوسری طرف چلیں میں انصار کے ساتھ چلوں گا۔ کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ لوگوں کے لیے بکریاں اور مال ہوں لیکن تمہارے لیے محمد ﷺ ہوں؟ اس پر انصار بیک وقت پکار اٹھے رضینا باللہ رباً وبالاسلام دیناً وبمحمد نبیاً۔

حقوق کے معاملے میں انفرادی رائے معلوم کرنا: دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ بنو ھوازن کے لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس وفد لے کر آ گئے، کہنے لگے جناب جو ہوا سو ہوا کہ آپ کو فتح حاصل ہوئی اور ہمیں شکست ہو گئی لیکن ہماری بہت بے عزتی ہوئی ہے، لڑائی میں شکست کی وجہ سے نہیں بلکہ قیدی اور بہت سامال آپ کے قبضے میں آنے سے۔ اگر آپ مہربانی فرما کر ہمارے قیدی اور مال واپس کر دیں تو ہماری کچھ عزت بحال ہو جائے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دونوں چیزیں نہیں ملیں گی ایک چیز کا انتخاب کر لو، یا قیدی واپس لے لو یا مال لے لو۔ یہ سب چیزیں ہم نے میدان جنگ میں قبضہ کی ہیں اصولی طور پر تو تمہارا دونوں پر حق نہیں بنتا لیکن ہماری پیشکش یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک چیز واپس لے سکتے ہو۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ ہم مشورہ کر کے آپ کو بتائیں گے، وہ لوگ جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بار پھر آئے اور کہا کہ ہم نے مشورہ کر لیا ہے ہمیں مال نہیں چاہیے بلکہ ہمارے قیدی واپس کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ٹھیک ہے لیکن معاملہ یہ ہے کہ قیدی تو تقسیم کیے جا چکے ہیں، جن لوگوں کو یہ قیدی دیے گئے ہیں ان سے بات کر کے میں آپ لوگوں کو بتاؤں گا کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے لشکر کے ساتھ بات کی کہ اس طرح بنو ھوازن کا وفد آیا تھا وہ اپنا مال اور قیدی واپس مانگ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ مال یا قیدیوں میں سے ایک واپس لے لو، وہ دوبارہ آئے ہیں اور اپنے قیدی واپس لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں، میں دونوں میں سے ایک چیز واپس کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اگر تم لوگ بخوشی قیدی واپس کر دو تو تمہاری مرضی ہے اگر نہیں کرنا چاہتے تو مجھے بطور قرض دے دو، میں اگلے موقع پر پہلے تم لوگوں کا قرض ادا کروں گا اور پھر باقیوں کو دوں گا۔ تمام صحابہ کرامؓ نے بیک وقت کہا کہ یا رسول اللہ! ہم بخوشی واپس کرتے ہیں۔ آپ نے جو وعدہ کیا ہے وہ ہم پورا کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بھئی اس طرح نہیں کیونکہ مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ تم میں سے کون خوشی کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہے اور کون اپنے آپ کو اس کے لیے مجبور سمجھ رہا ہے۔ فرمایا جاؤ اپنے اپنے خیموں میں، تمہارے قبیلوں اور گروہوں کے جو عرفاء یعنی نمائندے ہیں وہ تم سے رات کو بات کریں اور پھر صبح کو آکر مجھے تمہاری رضا کے متعلق بتائیں تب میں فیصلہ کروں گا۔ چنانچہ رات درمیان میں گزری، دوسرے دن رسول اللہ ﷺ کے پاس تمام گروہوں کے عریف آئے کہ یارسول اللہ ﷺ ہم نے اپنے ساتھیوں سے بات کر لی ہے سب قیدیوں کو بخوشی واپس کرنے پر راضی ہیں، اس طرح رسول اللہ ﷺ نے قیدی واپس کر دیے۔ رسول اللہ ﷺ نے حقوق کے معاملے میں رائے معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتلایا کہ جب تک سب کے بارے میں انفرادی طور پر تسلی نہ ہو جائے، قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے یہاں یہ بتایا کہ جہاں حقوق کی بات ہو وہاں گول مول بات نہیں چلتی۔

حکمرانی، ایک ذمہ داری نہ کہ ذریعۂ عیش و عشرت

خلافت راشدہ میں دفتری نظام، فہرستیں، اعداد و شمار، مردم شماری، یہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں شروع ہوئی، پھر حضرت عمر فاروقؓ نے اس نظام کے تحت وظائف کی تقسیم کا اہتمام کیا۔ حضرت عمرؓ اپنے عمال یعنی گورنروں کو جو ہدایات فرمایا کرتے تھے ان میں دو تین باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں دو قسم کے عامل ہوتے تھے۔ ایک عامل ہوتا تھا منتظم، اور ایک ہوتا تھا قاضی۔ اس کے علاوہ ایک اور ذمہ داری لوگوں سے

زکوٰۃ و عشر اور بیت المال کے واجبات وصول کرنے کی ہوتی تھی۔ حسب ضرورت ایک آدمی کو بھی مختلف ذمہ داریاں دے دی جاتی تھیں اور کبھی ایک ڈیوٹی پر ایک سے زیادہ آدمی متعین کر دیے جاتے تھے۔ خلافت راشدہ کا اصول یہ تھا کہ حکمرانوں اور رعیت کے درمیان معیارِ زندگی میں زیادہ فرق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی ہدایات تھیں کہ کوئی گورنر

اپنے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنا سکتا۔

ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا۔

باریک لباس نہیں پہن سکتا۔

چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھا سکتا۔

ترکی گھوڑے پر سفر کرنا، گھر کے آگے ڈیوڑھی بنوانا، باریک لباس پہننا اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانا اس زمانے میں عیش و عشرت کی علامات تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو خبر ملی کہ ان کے ایک گورنر عیاض بن غنمؓ نے باریک لباس پہننا شروع کر دیا ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے نمائندے حضرت محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا کہ جا کر اس معاملہ کی تحقیق کرو۔ اگر یہ خبر درست ہے تو گورنر صاحب جس حالت میں ہوں اسی حالت میں انہیں اپنے ساتھ لے کر آؤ۔ محمد بن مسلمہؓ گئے اور جا کر عیاض بن غنمؓ سے کہا کہ گورنر محترم! امیر المؤمنین کا حکم یہ ہے کہ اگر میں آپ کو باریک لباس پہنے دیکھوں تو آپ کو اسی حالت میں پکڑ کر امیر المؤمنین کے پاس لے جاؤں، اس لیے آپ کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کریں اور میرے ساتھ چلیں، چنانچہ وہ گورنر صاحب کو لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے عیاض بن غنمؓ سے فرمایا کہ اچھا! اب تجھے لوگوں پر حکمرانی کا شوق آ گیا ہے، تم نے حکمرانی کو لذت کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ فرمایا کہ جناب گورنر! یہ کرتا اتاریں اور بکری کے بالوں کا بنا ہوا جبہ پہنیں آپ کے ذمے ایک نئی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے کہ آج کے بعد آپ بیت المال کی بکریاں چرایا کریں گے۔ چنانچہ چھ مہینے تک عیاض بن غنمؓ نے ننگے بدن پر بکری کے بالوں کا جبہ پہن کر بیت المال کی بکریاں چرائیں۔ چھ مہینے گزرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے بلا کر پوچھا کہ جناب کچھ مزاج ٹھکانے آئے

ہیں؟ عیاض بن غنمؓ نے کہا کہ جی امیر المؤمنین آگئے ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے انہیں ایک بار پھر گورنر مقرر کر دیا۔ یہ حضرت عمرؓ کا اپنے عمّال کے ساتھ معاملہ تھا، یعنی یہ بتایا کہ جو عام لوگوں کا حق ہے وہی تمہارا حق بھی ہے اور یہ کہ حکمرانی نے تمہارے ساتھ سرخاب کے پر نہیں لگا دیے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور صحابہؓ میں بہت بڑی شخصیت تھے آپؓ السابقون الاولون میں سے تھے اور ایران کے فاتح تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کوفہ کا گورنر مقرر کیا ہوا تھا، حضرت عمرؓ کو یہ شکایت ملی کہ حضرت سعدؓ نے اپنے گھر کے دروازے کے آگے ایک ڈیوڑھی بنوا رکھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا اور فرمایا کہ اگر ڈیوڑھی دیکھو تو ڈیوڑھی گرا کر پھر انہیں بتانا کہ میں نے ایسا کرنے کے لیے کہا ہے۔ حضرت سعدؓ اپنے گھر بیٹھے تھے کہ باہر شور مچ گیا کہ امیر کوفہ کی ڈیوڑھی گر گئی ہے۔ باہر نکل کر دیکھا تو محمد بن مسلمہؓ تھے سب کو پتہ چل گیا کہ کون آیا ہے اور ڈیوڑھی کس وجہ سے گری ہے، محمد بن مسلمہؓ نے بتایا کہ امیر المؤمنین کا حکم تھا کہ ڈیوڑھی گرا کر پھر آپ کو بتایا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ لوگوں اور حکمرانوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ ہو اور ان کے حقوق و معاملات اور معاشرت میں فرق نہ آنے پائے۔ اگرچہ وظائف کی تقسیم میں ترجیحات کا طریقہ کار تھا لیکن عمومی پالیسی یہ تھی کہ ہر آدمی کو عمّال تک، سرکاری حکام تک رسائی حاصل ہونی چاہیے اور انہیں ان کا حق بلا تاخیر ملنا چاہیے۔

ہر پیدا ہونے والے بچے کے لیے وظیفہ

ہر وہ بچہ جو دودھ پینے کی عمر سے گزر جائے، حضرت عمر فاروقؓ نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا۔ ایک دن رات کو گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے ایک بچے کے مسلسل رونے کی آواز آ رہی تھی، پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک بچہ ماں کی گود میں مسلسل روئے جا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بچہ ماں کی گود میں زیادہ دیر رو نہیں سکتا، ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ماں بچے سے دودھ چھڑانا چاہتی ہے تاکہ بچے

کا وظیفہ مقرر ہو جائے لیکن بچہ ابھی ایک سال کا ہے اور دودھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ آپؓ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ عمر کی مملکت میں اتنا ظلم ہو رہا ہے، حضرت عمرؓ نے فوراً اندازہ لگالیا کہ مائیں اس پالیسی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وظیفہ حاصل کرنے کی لالچ میں اپنے بچوں سے دودھ چھڑوا رہی ہیں۔ آپؓ نے حکم دیا کہ آج کے بعد بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

ذِمّی کے لیے وظیفہ

ذمیوں یعنی اسلامی ریاست میں بسنے والے غیر مسلموں کے لیے بھی وظیفے مقرر تھے، ایک دن حضرت عمرؓ بازار میں جا رہے تھے دیکھا کہ ایک بوڑھا یہودی بازار میں مانگ رہا تھا۔ پوچھا کہ یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ ایک یہودی ہے۔ پوچھا مانگ کیوں رہا ہے کیا اسے وظیفہ نہیں ملتا؟ بوڑھے کو نہیں پتہ تھا کہ یہ حضرت عمرؓ ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ عمر کو جزیہ دینا ہوتا ہے اب میرے پاس اتنے پیسے نہیں بچتے کہ جزیہ دے سکوں۔ حضرت عمرؓ پریشان ہو گئے اور واپس آکر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ذمی لوگ جوانی میں تو محنت مزدوری کر کے ہمیں جزیہ دے سکتے ہیں، بڑھاپے میں کیا کریں۔ پھر یہ حکم جاری کیا کہ تحقیق کرو کہ جو غیر مسلم کمانے کے قابل نہیں رہا اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا اور جو اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکتا اسے بیت المال سے وظیفہ دیا جائے گا۔ فرمایا ایسے اور لوگوں کو تلاش کرو جو جزیہ ادا کرنے کے لیے اس طرح پریشان ہو رہے ہوں گے، یعنی ریاست کے ذمے ہر شہری کے حقوق ہیں۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ لباس، کھانا پینا اور شادی بھی ریاست کے ذمے ہے، اگر کوئی آدمی اپنی شادی کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتا تو ریاست اس کی شادی کا خرچ اٹھانے کی ذمہ دار ہے، کوئی آدمی اپنا مہر ادا نہیں کر سکتا تو ریاست اس کا مہر ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے اسلامی فلاحی ریاست کا جو تصور دیا وہ یہی ہے کہ مملکت کے شہری سکون

سے رہیں اور ہر فرد کو اس کا صحیح حق ملے۔ یہی جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں معاشی انصاف کا دائرہ ہے۔

دعوت اسلام اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

دعوتِ اسلام کے حوالے سے میں تین پہلوؤں پر بات کروں گا۔ پہلی بات یہ کہ اسلام کی دعوت کی بنیادی حیثیت و نوعیت کیا ہے۔ دوسری بات اس الزام کی حقیقت کو واضح کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا تھا اور یہ کہ اسلام دنیا میں طاقت کے ذریعے پھیلا ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ اسلام کی دعوت اور دوسروں کو اسلام کی طرف بلانے کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کار کیا تھا۔

دعوتِ اسلام کی بنیادی حیثیت و نوعیت

جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات بھی دنیا میں آئے ان کی نبوت علاقہ، قوم اور وقت کے لحاظ سے محدود تھی۔ بنی اِسرائیل میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تقریباً تین ہزار پیغمبر آئے، ان سب پیغمبروں کی نبوت بنی اسرائیل کے خاندان اور قوم کے لیے مخصوص تھی۔ حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ اور جن دیگر انبیاء کا ذکر آتا ہے یہ اپنے اپنے علاقے اور قوم کے لیے نبی ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت یونسؑ ایک شہر نینوا کے پیغمبر ہوئے۔ اسی طرح علاقہ کے لحاظ سے بھی پیغمبر آئے ہیں کہ ایک ہی وقت میں کئی کئی پیغمبر مختلف علاقوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت شعیبؑ دونوں بیک وقت اپنی قوم کے پیغمبر تھے، دونوں خسر اور داماد بھی تھے کہ حضرت موسیٰؑ کی شادی حضرت شعیبؑ کی بیٹی سے ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ بھی بیک وقت پیغمبر تھے، حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، دونوں کی نبوت کے دائرے الگ الگ

تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء کرامؑ کی نبوتیں علاقے کے لحاظ سے بھی محدود تھیں، نسلی اعتبار سے بھی محدود تھیں اور وقت کے اعتبار سے بھی محدود تھیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی نبوت علاقے، نسل اور وقت کسی لحاظ سے بھی محدود نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت دنیا کے تمام علاقوں کے لیے ہے، تمام اقوام کے لیے ہے اور قیامت تک کے وقت کے لیے ہے۔

یہ عمومی رسالت اللہ تعالیٰ نے صرف جناب نبی کریم ﷺ کو عطا فرمائی اور اسے آپ ﷺ نے اپنی خصوصیات میں ذکر فرمایا أُعْطِيتُ بِسِتٍّ لَمْ يُعْطَ أَحَدٌ قَبْلِي --- أُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً یعنی مجھے چھ باتیں ایسی ملی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں۔ ان میں سے ایک بات یہ فرمائی کہ مجھے تمام نسل انسانی کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں مختلف مذاہب رائج چلے آرہے ہیں جن میں بڑے مذاہب آسمانی کتابوں کے حوالے سے ہیں۔ دنیا کے بیشتر بڑے مذاہب دعوت کے مذاہب نہیں ہیں، جیسے یہودی مذہب ایک نسلی مذہب ہے کہ وہ اپنے مخصوص خاندان اور اولاد سے باہر کسی کو اپنے مذہب کی دعوت نہیں دیتے، یہودیوں کا دنیا میں کہیں بھی عمومی دعوتی مرکز نہیں ہے۔ اسی طرح ہندو وطنی مذہب ہے، وہ دوسرے علاقوں کے لوگوں کو ہندو بننے کی دعوت نہیں دیتے بلکہ ان کے ہاں تو صدیوں سے بہت سے طبقات چلے آرہے ہیں جن کی بنیاد معاشرتی امتیازات پر ہے۔ عام ہندو کے لیے ان کی مذہبی کتاب وید کو چھونا تک منع ہے۔ ہندوؤں کا مذہب بھی دعوتی مذہب نہیں ہے یہ وطن کی بنیاد پر چلے آرہے ہیں۔ اسی طرح مجوسی جو کہ دنیا میں بہت کم تعداد میں موجود ہیں وہ بھی کسی غیر مجوسی کو مجوسی بننے کی دعوت نہیں دیتے۔

البتہ عیسائی دنیا بھر میں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے حوالے سے دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آج کے دور کی تحریف شدہ اور تبدیل شدہ بائبل میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واضح ہدایات موجود ہیں کہ میں صرف بنی اسرائیل کے پاس بھیجا گیا ہوں، بنی اسرائیل کے سوا میری دعوت کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ حتیٰ کہ متی میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ

حضرت عیسیٰؑ تشریف فرما تھے کہ ایک خاتون آئی اور اس نے کوئی مسئلہ پوچھا، حضرت عیسیٰؑ نے جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا کہ آپ نیک آدمی ہیں میں آپ سے مسئلہ پوچھنا چاہتی ہوں، حضرت عیسیٰؑ نے پھر جواب نہیں دیا۔ اس نے جب تیسری بار پوچھا تو فرمایا کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس بھیجا گیا ہوں اس کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ وہ خاتون بنی اسرائیل میں سے نہیں تھی بلکہ کسی اور خاندان کی تھی۔ انجیل کی بہت سی آیات ہیں جن میں حضرت عیسیٰؑ کی واضح ہدایات ہیں کہ ہمارا مذہب بنی اسرائیل تک محدود ہے۔ چنانچہ عیسائی جو آج دنیا میں عیسائیت کی دعوت دیتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

اسلام ایک عالمگیر دعوتی مذہب

اسلام آسمانی مذاہب میں سے واحد مذہب ہے جس کی دعوت پوری نسل انسانی کے لیے، دنیا کے تمام علاقوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (سورۃ الاعراف: ۱۵۸) (اے پیغمبر) کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تمام انسانوں کے لیے اللہ کا رسول ہوں۔ نسل انسانی کی طرف جناب نبی کریم ﷺ کی نبوت عام ہے اس لیے اسلام کی دعوت کسی خاص علاقے، نسل اور وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، یہ اسلام کی دعوت کی بنیادی حیثیت ہے۔

دعوتِ اسلام کا ایک پہلو یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ جنّوں کے لیے بھی نبی تھے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (سورۃ الفرقان: ۱) کہ برکت والی ہے وہ ذات جس نے قرآن کریم اپنے بندے پر اتارا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈر سنانے والا ہو۔ عالمین سے مراد انسان اور جن ہیں۔ جن ایک علیحدہ اور مستقل مخلوق ہے، جن اور انسان دونوں مکلف مخلوق ہیں۔ جس طرح نبی کریم ﷺ انسانوں کے لیے نبی ہیں اسی طرح آپ ﷺ جنوں کے لیے بھی نبی ہیں۔ جن بھی جناب نبی کریم ﷺ کے امتی

ہیں جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (سورۃ الجن: ۱-۲) آپ (ان لوگوں سے) کہیے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا، پھر (اپنی قوم میں واپس جاکر) انہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتلاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور ہم (اب) اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔ یہ آیات اس واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ چند صحابہؓ کے ہمراہ مکہ کے باہر ایک کھلی جگہ پر فجر کی نماز ادا فرمارہے تھے صبح کا پُر سکون اور پُر نور وقت تھا، جناب نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک پر اللہ کا کلام تھا، آپ ﷺ قرآن کریم کی تلاوت فرمارہے تھے۔ اسی اثناء میں جنوں کا ایک گروہ وہاں سے گزرا تو آپ ﷺ کو تلاوت کرتا دیکھ کر رک گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنوں کا وہ گروہ ہم نے وہاں بھیجا تھا وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (سورۃ الاحقاف: ۲۹) اور جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے، غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آپہنچے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو، پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے۔ اس سے اگلی آیات میں اس بات کا ذکر ہے کہ انہوں نے جاکر اپنی قوم سے کہا کہ ہم وہ کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے، پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ کے اس پیغمبر کا کہنا مانو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ۔ چنانچہ جناب نبی کریم ﷺ کی نبوت عالمین کے لیے یعنی جنوں اور انسانوں کے لیے ہے، یہی دونوں مخلوقیں مکلف ہیں باقی مخلوقات مکلف نہیں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور دعوت پوری نسل انسانی کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے، چنانچہ جس طرح حضور ﷺ کے باقی فرائض امت کو منتقل ہوئے ہیں اسی طرح

دعوت کا فرض بھی امت کو منتقل ہوا ہے۔ آپ ﷺ کے پیروکار بحیثیت امت اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ قرآن کریم اور سنتِ رسول کی شکل میں اللہ تعالیٰ کا پیغام نسل انسانی تک پہنچائیں۔ اگر امت میں دعوت کا یہ عمل جاری رہے گا تو امت بری الذمہ ہو گی لیکن اگر کسی دور میں امت میں دعوت کا یہ عمل رک جائے گا یعنی نسل انسانی تک اسلام کا پیغام پہنچنے کا عمل معدوم ہو جائے گا تو نتیجے میں بحیثیت امت پوری امت مسلمہ گناہگار ٹھہرے گی۔ یہ دعوت اسلام کی اصولی حیثیت ہے۔

رسول اللہ ﷺ، تاریخ انسانی کی کامیاب ترین شخصیت

مورخین یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ نسل انسانی میں کوئی شخصیت ایسی نہیں گزری کہ جس نے اتنے مختصر عرصے میں اپنی جدوجہد کے نتائج حاصل کیے ہوں، ایسی شخصیت جس نے صرف ۲۳ سال کے عرصے میں اپنے مشن کو اعلان کے مرحلے سے لے کر کامیابی کے مرحلے تک پہنچایا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے نبوت ملنے سے کچھ عرصہ بعد صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر سرعام دعوت دی تھی، گویا یہ آپ ﷺ کے مشن کا اعلان تھا یَاأَيُّهَا النَّاسُ، قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا (مسند احمد رقم 15448) کہ اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور پھر اس کے تقریباً ۲۲ سال بعد صفا کے قریب منیٰ میں کھڑے ہو کر حضور ﷺ نے اعلان فرمایا فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ رب کعبہ کی قسم میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان کیا کہ میں نے جس مشن کا آغاز کیا تھا آج اس کے نتائج حاصل کر لیے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی کامیابی پر لوگوں کو بھی گواہ بنایا وَأَنْتُمْ تُسْأَلُونَ عَنِّي، فَمَا أَنْتُمْ قَائِلُونَ؟ قَالُوا نَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَأَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ فَقَالَ بِإِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ يَرْفَعُهَا إِلَى السَّمَاءِ وَيَنْكُتُهَا إِلَى النَّاسِ اللّٰهُمَّ اشْهَدْ اللّٰهُمَّ اشْهَدْ اللّٰهُمَّ اشْهَدْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (مسلم ۲۱۳۷) کہ تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا، پس تم کیا کہو گے؟ لوگوں نے کہا ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے پیغام پہنچا دیا اور پوری خیر خواہی کے ساتھ ذمہ داری ادا کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی

اور اس کے ساتھ لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا تین مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

جناب رسول اللہ ﷺ تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے اجتماع سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں کہ کل قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا کہ ہم نے اپنا پیغمبر بھیجا تھا اس نے تم تک میری بات پہنچائی یا نہیں۔ صحابہؓ نے اس پر گواہی دی کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سونپی گئی یہ ذمہ داری نبھا دی ہے۔ چنانچہ اکیس بائیس سال کے مختصر عرصے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مشن شروع کیا اور اپنی زندگی میں ہی اس مشن کی کامیابی کا اعلان فرمایا۔ اور یہ کامیابی ایسی نہیں تھی کہ ایک آدمی نے یہ دعویٰ کر دیا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں بلکہ تاریخ نے اس بات کو تسلیم کیا کہ یہ ایک عظیم کامیابی تھی۔ ایک مغربی مصنف نے کتاب لکھی ہے "دنیا کے سو بڑے آدمی"۔ اس کتاب میں اس نے پہلے نمبر پر جناب نبی کریم ﷺ کا تذکرہ کیا ہے، پھر مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ لوگ مجھ سے یہ بات پوچھیں گے کہ تم نے عیسائی ہو کر محمد ﷺ کو پہلے نمبر کی شخصیت کیوں قرار دیا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے اس لیے کہ خود میرے طے کردہ میرٹ پر تاریخ میں اور کوئی شخصیت پہلے نمبر پر نہیں ہے۔

اسلام پر دنیا میں بزور طاقت پھیلنے کا الزام

دنیا اس بات کا اقرار تو کرتی ہے کہ اتنے مختصر عرصے میں اتنی وسیع تر کامیابی حضور ﷺ کے علاوہ اور کسی شخصیت کو نہیں ملی لیکن اس سے اگلی بات کہ یہ کامیابی رسول اللہ ﷺ نے کیسے حاصل کی، اس میں بیشتر غیر مسلم مصنفین دیانت داری کا مظاہرہ نہیں کرتے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک وقت آگیا تھا جب محمد ﷺ کے ساتھ تلوار والے اور طاقتور لوگ اکٹھے ہو گئے تھے، چنانچہ یہ لوگ جدھر جاتے تھے مار دھاڑ کرتے تھے جس کے نتیجے میں لوگ ان کے ڈر سے اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ یورپ کے مؤرخین نے حضور ﷺ کی کامیابی کی یہ توجیہ کی ہے کہ محمد ﷺ اور صحابہؓ کے دور میں اسلام کی کامیابی

تلوار اور طاقت کا کرشمہ ہے لیکن یہ دعویٰ خلاف واقعہ ہے اور حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ جو لوگ حضور ﷺ کی دعوت کے دور سے واقف ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں کہ اس دور میں تلوار حضور ﷺ کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ ان کے دشمنوں کے ہاتھ میں تھی۔ حضور ﷺ کی دعوت کا دور مکہ کا تیرہ سالہ دور ہے۔ کوئی ان مؤرخین سے پوچھے کہ کیا جناب نبی کریم ﷺ کے اولین اور سب سے پختہ ساتھیوں نے تلوار کے زور پر اسلام قبول کیا؟ اسلام اگر تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو وہ لوگ جنہوں نے حضور ﷺ کے اس تیرہ سالہ مکی زندگی میں اسلام قبول کیا، ان کے قبولِ اسلام کے بارے میں ان مؤرخین کے پاس کیا توجیہ ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے پہلے تو کئی سال تک اپنے دفاع کے لیے بھی تلوار نہیں اٹھائی، وہ مکہ کے ظالموں کو اپنے صبر و حوصلہ کے ساتھ شکست دینے میں کامیاب ہوئے، اس کے بعد مدینہ منورہ میں انہوں نے ظلم اور ناانصافی کی سرکوبی کا سلسلہ عرب و عجم تک پھیلایا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا قبول اسلام

یہ وقت تو وہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا تین سال تک شعب ابی طالب میں محاصرہ رہا۔ تمام قبائل کی طرف سے حضور ﷺ کا سوشل بائیکاٹ تھا، انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ بنو ہاشم سے یعنی حضور ﷺ اور ان کے خاندان سے لین دین نہیں کریں گے، نہ رشتہ دیں گے، نہ رشتہ لیں گے، نہ خوشی غمی میں شریک ہوں گے اور نہ ساتھ اٹھیں بیٹھیں گے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے تین سال اس کیفیت میں گزارے، اس دور میں بھی لوگ مسلمان ہوئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے اسلام قبول کرنے کا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں، وہ اپنے دور میں عرب کے بڑے دلیر خاندان کے فرد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے قریب سے گزرنے والا کوئی قافلہ صحیح سلامت بچ کے نہیں نکلتا تھا۔ حضور ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے حضرت ابوذر غفاریؓ موحد تھے اور بت پرستی سے نفرت تھی، فرماتے ہیں کہ میں اپنے ذوق کے مطابق اللہ کی عبادت بھی کرتا تھا، کبھی رکوع کر لیتا، کبھی سجدہ کر لیتا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ مکے میں ایک آدمی ہے جو بت پرستی سے نفرت کرتا ہے اور اس نے نبوت کا

اعلان کر رکھا ہے، میں نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ جا کر حالات معلوم کر کے آؤ۔ مکہ مکرمہ سے شام جاتے ہوئے راستے میں بنو غفار کا قبیلہ پڑتا ہے، بھائی مکہ گیا اور حالات معلوم کر کے آیا۔ اس نے بتایا کہ ان صاحب کا نام یہ ہے، ان کے والد کا نام یہ ہے اور اس طرح نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ کہ مکہ کے مقامی لوگوں نے ان کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔

ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میری تشفی نہ ہوئی، میں نے مکہ مکرمہ خود جانے کا فیصلہ کیا۔ میں مکہ پہنچ کر حرم میں بطور مسافر جا کر بیٹھ گیا جیسا کہ عام رواج تھا۔ فرماتے ہیں کہ ایک صاحب (حضرت علیؓ) آئے اور پوچھا کہ اے مسافر کہاں سے آیا ہے؟ حضرت علیؓ کا ذوق یہ تھا کہ وہ شام کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے لیے مسافر ڈھونڈا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ انہیں ساتھ لے گئے اور لے جا کر کھانا کھلایا۔ ابوذر غفاریؓ واپس آکر حرم میں سو گئے۔ دوسرے دن حضرت علیؓ پھر دیکھنے گئے کہ کوئی مسافر ہو کھانا کھانے والا، دیکھا کہ وہی مسافر پھر بیٹھا ہے۔ پوچھا کہ کیا مسافر کو اپنی منزل کا ابھی پتہ نہیں چلا؟ ابوذرؓ کہنے لگے کہ ابھی پتہ نہیں چلا۔ حضرت علیؓ نے کہا آؤ میرے ساتھ۔ کھانا کھایا اور واپس آکر پھر سو گئے۔ بعض روایات میں دوسری رات اور بعض روایات کے مطابق تیسری رات پھر یہی ہوا کہ حضرت علیؓ کسی مسافر کی تلاش میں آئے تو دیکھا کہ وہی شخص بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا کہ اللہ کے بندے تم نے کہیں جانا نہیں؟ کہا کہ نہیں۔ حضرت علیؓ پھر ساتھ لے گئے اور پوچھا کہ اصل بات کیا ہے، کیوں مسلسل یہاں بیٹھے ہو۔ ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہاں مکہ میں حضور ﷺ کا مخالف کون ہے اور حمایتی کون ہے، میں حضرت علیؓ کو بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے میزبان سے کہا کہ اگر تم اعتماد کرو اور رازداری کا وعدہ کرو تو میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں ایمانداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان راز رہے گا۔ اس پر حضرت ابوذر غفاریؓ نے بتایا کہ میں اس شخص کی تلاش میں آیا ہوں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ بھئی تم صحیح آدمی کے پاس پہنچے ہو۔

رسول اللہ ﷺ اپنے ٹھکانے پر شعب ابی طالب میں محصور تھے، حضرت علیؓ نے کہا کہ تمہیں حضور ﷺ سے ملانے کے لیے تھوڑی منصوبہ بندی کرنی پڑے گی۔ میں صبح آکر

تمہیں لے جاؤں گا، تم میرے پیچھے پیچھے چلنا، اگر راستے میں مجھے کوئی خطرہ محسوس ہوا کہ کسی کو ہم پر شک ہو گیا ہے تو میں جوتا صحیح کرنے کے بہانے بیٹھ جاؤں گا، تم سیدھا نکل جانا تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ خیر دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ابوذر غفاریؓ نے بتایا کہ میں آپ ہی کی طرح موحد ہوں، ایک اللہ کو مانتا ہوں اور بت پرستی سے نفرت کرتا ہوں، مجھے آپ کے متعلق معلوم ہوا ہے تو میں آپ کی دعوت کے متعلق دریافت کرنے آیا ہوں۔ حضور ﷺ نے اپنی دعوت بتائی، اس پر حضرت ابوذر غفاریؓ نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔ پھر حضور ﷺ سے پوچھا کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ تم اپنی قوم میں چلے جاؤ اور جا کر لوگوں کو دین کی بات بتاؤ، جب کوئی نئی بات ہو گی تو میں تمہیں اطلاع کروں گا۔ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے اسلام کا اعلان نہ کر کے جاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمہاری مرضی پر ہے لیکن میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اپنی قوم میں جاؤ۔

حرم مکہ میں لوگ اکٹھے ہوتے تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ نے وہاں جا کر اعلان کیا کہ اے لوگو! میرا یہ نام ہے اور فلاں قبیلے سے آیا ہوں تاکہ تم مجھے پہچان لو۔ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کا کلمہ پڑھ لیا ہے اور اس پر میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں۔ لوگوں نے یہ سنا تو انہیں پکڑ کر مارنا شروع کر دیا، کوئی گھونسہ مار رہا ہے، کوئی لات مار رہا ہے اور کوئی ڈنڈا مار رہا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ مار کھاتے جا رہے ہیں اور کہتے جا رہے ہیں کہ میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے لا الہ الا اللہ۔ حضرت عباسؓ نے یہ معاملہ دیکھ لیا، وہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے لیکن صاحب بصیرت آدمی تھے اور معاملات کو سمجھتے تھے۔ لوگوں سے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو، یہ بنو غفار کا آدمی ہے، اگر اسے کچھ ہو گیا تو تمہارا تجارت کا راستہ بند ہو جائے گا۔ حضرت عباسؓ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو ان لوگوں سے چھڑوایا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے آکر حضور ﷺ کی خدمت میں بتایا کہ یہ معاملہ ہوا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ اس دور میں مسلمان ہوئے جب رسول اللہ ﷺ کا سوشل بائیکاٹ تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو حضرت ابوذر غفاریؓ کو

کس تلوار نے مسلمان کیا؟ یہ نہ مکہ کے رہنے والے تھے، نہ حضور ﷺ کے رشتہ دار تھے اور حضور ﷺ کے ساتھ کوئی تعلق داری بھی نہیں تھی۔ کسی کے بتانے پر کہ فلاں شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، باہر سے آئے اور آکر اپنی تسلی اور اعتماد کے بعد اسلام قبول کیا۔

یمنی قبیلے کے سردار طفیلؓ بن عمرو دَوسی کا قبول اسلام

حضور ﷺ کی مکی زندگی میں دعوت اسلام کے اس دور میں ان لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا جنہیں حضور ﷺ سے ملنے سے بھی روکا جاتا تھا۔ یمن کا ایک قبیلہ تھا بنو دوس، اس کے سردار تھے طفیل بن عمرو دوسیؓ، اپنے وقت کے بڑے شاعر تھے۔ مکہ مکرمہ میں حج یا عمرہ کے لیے آئے، مکہ کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ یمن کا ایک سردار آیا ہے تو ازراہِ ہمدردی ابو جہل نے کہا کہ طفیل! تم آئے ہو تو تمہیں خبردار کر دوں کہ ہمارے ہاں ایک جادوگر ہے، وہ بڑی عجیب عجیب باتیں کرتا ہے اور لوگوں کو اپنے دین سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ تمہیں ہماری نصیحت یہ ہے کہ ایسی صورت اختیار کرو کہ اس کی بات تمہارے کان میں نہ پڑے۔ طفیلؓ کہتے ہیں کہ مجھے لوگوں نے اتنا ڈرایا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ جب میں مکہ کی گلیوں میں گھومتا تھا تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتا تھا کہ کہیں اس جادوگر کی کوئی آواز میرے کان میں نہ پڑ جائے۔ لیکن جو آواز مقدر میں تھی، اسے کون روک سکتا تھا۔ ایک دن حرم میں جا رہے تھے، جناب نبی کریم ﷺ نماز میں یا ویسے ہی قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ طفیلؓ کے کان میں آواز پڑی تو سوچا کیا فرق پڑتا ہے تھوڑی دیر سن ہی لیتے ہیں، دیکھیں تو سہی کہ یہ کلام کیا کہتا ہے۔ کانوں سے روئی نکالی اور کھڑے ہو گئے، چند آیات سنیں تو کہنے لگے کہ نہ تو یہ شعر ہیں، اس لیے کہ میں خود شاعر ہوں اور جانتا ہوں کہ شعر کسے کہتے ہیں، اور نہ یہ جادو ہے ایسا کلام تو میں نے زندگی میں کبھی سنا ہی نہیں۔ حضور ﷺ فارغ ہوئے تو یہ حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے اور پوچھا کہ کیا آپ ہی محمد ﷺ ہیں، مجھے تو لوگوں نے بہت ڈرایا تھا۔ آپ ﷺ مجھے اپنے کلام میں سے مزید کچھ سنائیں، حضور ﷺ نے چند آیات مزید تلاوت کر دیں، طفیلؓ نے فوراً کہا کہ مجھے کلمہ پڑھائیے۔ یہ بے انصاف مؤرخین بتلائیں کہ طفیل بن عمرو دوسیؓ کو کس تلوار نے مسلمان کیا؟

اور حضرت عمر بن الخطابؓ تو اسلام کو مٹانے کے لیے گھر سے نکلے تھے اور تلوار ان کے ہاتھ میں تھی۔ جناب نبی کریم ﷺ نے مکہ کے تیرہ سالہ دور میں اسلام کی دعوت دی، یہ مظلومیت کا دور تھا۔ حضرت خبابؓ جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مظالم حد سے بڑھ گئے ہیں۔ فرمایا صبر کرو۔ کہا یارسول اللہ! کہاں تک صبر کریں۔ حضرت خبابؓ کا مالک انہیں جلتے ہوئے کوئلوں پر لٹا کر اوپر چڑھ کر بیٹھ جاتا تھا، ان کی چربی پگھل کر کوئلوں میں گھل جاتی تھی۔ حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمایا صبر کرو۔ یہ صبر اور مظلومیت کا دور تھا۔ حضرت زبیر بن العوامؓ کا چچا انہیں چٹائی میں باندھ کر چھت کے ساتھ الٹا لٹکا دیتا تھا اور پورے محلے کی گندگی نیچے اکٹھی کر کے اس کو آگ لگا دیتا تھا۔ حضرت بلالؓ کو مکہ کے بچے گلیوں میں پتھروں اور ریت میں گھسیٹتے پھرتے تھے اور وہ احد احد احد پکارتے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو اگر قبولِ عام حاصل ہوا تو وہ اسلام کی سچائی کی بنا پر ہوا۔ نبی کریم ﷺ کا کردار، آپ ﷺ کا اخلاق اور قرآن کریم کی عظمت، یہ اسلام کی دعوت کا باعث ہوئے۔ ورنہ پہلے تیرہ سالہ دور میں تلوار تو دوسری طرف کے لوگوں کے پاس تھی۔ چنانچہ یہ الزام کہ جناب نبی کریم ﷺ کی دعوت تلوار کے زور سے پھیلی ہے، غلط بات ہے۔

امریکہ کی ایک پروفیسر کا قبولِ اسلام

قرآن کریم آج بھی معجزہ ہے۔ امریکہ میں ایک محترم نومسلم خاتون ہیں ڈاکٹر ایم کے ہرمینسن، انہوں نے اسلام قبول کیا۔ سین ڈیوگو یونیورسٹی میں فلسفے کی استاد تھیں، انہوں نے عربی، اردو، فارسی اور گورمکھی، چار زبانیں سیکھیں۔ شاہ ولی اللہؒ پر پی ایچ ڈی کی۔ پاکستان کے ایک پروفیسر صاحب کے ساتھ ان کی شادی ہوئی۔ میرے چچا محترم حضرت صوفی عبد الحمید سواتیؒ کا بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ پر خاصا کام ہے، ڈاکٹر ایم کے ہرمینسن کو صوفی صاحب کی کتابوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ وہ ایک دفعہ اپنے خاوند کے ساتھ پاکستان آئیں تو گوجرانوالہ میں صوفی صاحب سے ملاقات کے لیے بھی آئیں۔ میں بھی ملاقات میں تھا۔ خاتون نے اپنی گفتگو میں صوفی صاحب سے بہت سے سوالات پوچھے اور مسائل کے متعلق دریافت کیا۔

صوفی صاحب نے بھی ان خاتون سے ایک سوال کیا کہ اللہ کی بندی تم خود کفیل ہو، عقل مند خاتون ہو فلسفے کی پروفیسر ہو اور ہم مسلمانوں میں بھی آج کے دور میں کشش کی ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ جسے دیکھ کر تم مسلمان ہوئی ہو، تم کیسے مسلمان ہو گئی؟ خاتون نے جواب دیا کہ مجھے کسی مسلمان نے مسلمان نہیں کیا اور میں کسی مسلمان کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوئی۔

خاتون نے کہا کہ مجھے تو قرآن کریم نے مسلمان کیا ہے، پھر انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا واقعہ سنایا۔ بتایا کہ میں نے فلسفے میں ایم اے کیا تھا اور مجھے ذہنی طور پر سکون نہیں تھا۔ میں کبھی کسی یونیورسٹی میں کسی کورس کے لیے چلی جاتی اور کبھی کسی دوسری یونیورسٹی میں کسی دوسرے کورس کے لیے چلی جاتی، کہیں سکون نہیں ملتا تھا۔ میں اسی کیفیت میں اسپین کی یونیورسٹی میں ایک کورس کر رہی تھی، ایک دن ہاسٹل میں ریڈیو سن رہی تھی کہ ایک اسٹیشن پر عجیب سی آواز آئی، زبان اجنبی تھی لیکن مجھے آواز میں کشش محسوس ہوئی۔ میں نے اگلے دن پھر اسی اسٹیشن پر یہی آواز سنی، اسی طرح دو چار دن سنتی رہی، آواز سننے کو جی چاہتا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے اور زبان کونسی ہے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ یہ مراکش کا ریڈیو ہے اور مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کریم جو کہ عربی میں ہے، اس کی تلاوت ہو رہی ہے۔ کہتی ہیں کہ میں نے قرآن مجید کا انگلش ترجمہ منگوا کر پڑھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ پہلے عربی زبان سیکھوں گی، پھر قرآن کریم کو اس کی اصل زبان میں پڑھوں گی اور پھر فیصلہ کروں گی۔ چنانچہ میں نے قاہرہ یونیورسٹی میں دو سال تک عربی زبان سیکھی، پھر قرآن کریم کا مطالعہ کیا، اس طرح قرآن کریم نے مجھے مسلمان کیا ہے۔

دعوتِ اسلام اور حضور ﷺ کا اسوہ

اسلام کی مقبولیت کی وجہ قرآن کریم کا اعجاز اور جناب نبی کریم ﷺ کے سیرت و کردار کی اپنی قوت تھی۔ اسلام قرآن کی صداقت پر اور رسول اللہ ﷺ کے کردار کی سچائی پر پھیلا ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ کی اسلام کے لیے جو دعوت تھی، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا اصول کیا تھا اور آپ ﷺ نے اس بارے میں کیا ہدایات دیں؟ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تھا قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ یَزِدْهُمْ

دُعَاءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا (سورۃ نوح: ۵۔۶) (آخر) نوحؑ نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی (دین حق کی طرف) بلایا۔ سو میرے بلانے پر (دین سے) اور زیادہ بھاگتے رہے۔

جناب نبی کریم ﷺ کی دعوت کی کیفیت بھی یہ تھی کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (سورۃ الشعراء: ۳) شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے کرتے) اپنی جان دے دیں گے۔ یعنی آپ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالیے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہوتے، یہ تو مقدر کی بات ہے، یعنی آپ لوگوں کو زبردستی مسلمان نہیں کرسکتے۔ آپ کا کام تو یہ ہے کہ اپنی طرف سے حق بات بیان فرما دیجئے، اب جس کا جی چاہے مسلمان ہو اور جس کا جی چاہے مسلمان نہ ہو۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (سورۃ الکہف: ۲۹) اور آپ کہہ دیں سچی بات جو آپ کے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے مان لے اور جو چاہے انکار کر دے۔ داعی کے دل میں انسانوں کے ایمان کے لیے تڑپ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں حضور ﷺ کو لوگوں کے ایمان کے بارے میں حریص قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے دل میں یہ خواہش حرص کے درجے کی بات تھی کہ دنیا اسلام پر اور ہدایت پر آجائے، فرمایا حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ (سورۃ التوبہ: ۱۲۸) کہ تمہاری بھلائی میں وہ حریص ہیں۔ حرص خواہش کا آخری درجہ ہوتا ہے جسے دنیاوی معاملات میں اچھا نہیں سمجھا جاتا، دنیا کے معاملات میں حرص ہو تو یہ قابل تعریف چیز نہیں ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ دین کے معاملے میں، دعوت کے معاملے میں اور لوگوں کے ایمان قبول کرنے کے معاملے میں حریص تھے۔

حضور ﷺ خود فرماتے ہیں کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے نابینا لوگوں کا ایک گروہ بھاگے جا رہا ہو اور ان کے آگے ایک بہت بڑا گڑھا ہو جس میں آگ جل رہی ہو۔ ایک بینا یعنی دیکھنے والا آدمی یہ منظر دیکھتا ہے تو دوڑا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ کے بندو یہ کس طرف بھاگے جا رہے ہو، رک جاؤ، ورنہ آگ میں جل کر مر جاؤ گے۔ وہ بینا آدمی اس کوشش میں ہے کہ ان میں سے کوئی آگ کے گڑھے میں نہ گر جائے۔ فرمایا تم سب دوزخ کی

آگ کی طرف بھاگے جا رہے ہو اور مجھے یہ منظر نظر آ رہا ہے، تم جہنم کی یہ آگ دیکھ نہیں رہے ہو لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ تم اس کی طرف بھاگے جا رہے ہو اور میں تمہیں آوازیں دیتا جا رہا ہوں کہ خدا کے لیے اس طرف مت بھاگو، آگے آگ ہے۔ اسی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا حَرِيصٌ عَلَيْكُم کہ محمد ﷺ تمہارے ایمان کے معاملے میں حریص ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے ایمان کی خواہش اس درجے میں کی۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ اے علی! اگر ایک آدمی بھی تمہاری وجہ سے مسلمان ہو جائے تو تمہارے لیے سرخ اونٹوں کی دولت سے بھی بہتر ہے۔ لأن يهدى الله بك رجلًا۔۔۔ خير لك من حمر النعم او كما قال صلى الله عليه وسلم۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا اسلوب یہ تھا کہ دعوت دینے والے کے اپنے دل میں تڑپ ہو کہ میں نے نسل انسانی کو آگ سے بچانا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو اپنے بھائی سمجھے اور ہر ممکن کوشش کرے کہ وہ جہنم کی طرف جانے والے راستے سے ہٹ جائیں۔ یہ جناب نبی کریم ﷺ کا اسوہ ہے کہ پوری نسل انسانی کے لیے انسان کے دل میں تڑپ موجود ہو کہ نسل انسانی کو ہدایت کے راستے پر لانا اور آگ اور جہنم سے بچانا میری ذمہ داری ہے۔ داعی کا اندازِ گفتگو جناب نبی کریم ﷺ نے جس لب و لہجے میں اسلام کی دعوت دی، آپ ﷺ کی زبان کی مٹھاس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا جو کہ خیر خواہی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس لیے کہ خیر خواہی میٹھی زبان سے ہی ہو گی اور نرمی سے ہو گی۔ آپ کسی کو غلط راستے سے بچانا چاہتے ہیں اور اپنے راستے پر لانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس شخص کو یہ اعتماد حاصل ہونا چاہیے کہ دعوت دینے والا میرا خیر خواہ ہے۔ لیکن اگر دعوت دینے والے کی گفتگو ایسی ہو کہ سننے والا اس سے شرمندگی یا ہتک محسوس کرے تو وہ دعوت قبول کرنے پر کیسے آمادہ ہو گا؟ دعوت کا پہلا اصول یہ ہے کہ دعوت خیر خواہی کے جذبے سے اور خیر خواہی کے انداز سے دی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے پاس بھیجا اِذْهَبَ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (سورۃ طٰہٰ: ۲۴) جاؤ فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ وہ فرعون جس

نے خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا اور وہ فرعون جو کہتا تھا وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ٥ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا (سورۃ المؤمن: ۳٦) اور فرعون نے کہا، اے ہامان میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ، شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں۔ پھر (وہاں جاکر) موسیٰؑ کے خدا کو دیکھوں اور میں تو موسیٰؑ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔ فرعون اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ ایک لمبی سی عمارت بناؤ جس پر چڑھ کر میں اس خدا کو دیکھوں جس کا موسیٰؑ دعویٰ کرتا ہے، مجھے تو یہ بات جھوٹی لگتی ہے۔ وہ فرعون جس کا دماغ یہاں تک پہنچ چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کو یہ کہہ کر بھیجا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (سورۃ طٰہٰ: 44) پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔ یعنی فرعون جیسا سرکش آدمی جس نے خدا ہونے کا دعویٰ کر رکھا تھا، اس کے پاس اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا اور ہدایت کی کہ نرمی کے ساتھ بات کرنا۔ چنانچہ یہی دعوت کا اسلوب ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ دعوت کی زبان خیر خواہی کی زبان ہونی چاہیے کہ سننے والا خیر خواہی کا جذبہ محسوس کرے۔

ایک مرتبہ حضرت حسنؓ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا کہ وہ وضو تو کر رہا ہے لیکن ٹھیک طریقے سے نہیں کر رہا۔ ہمارا آج کل کا طریقہ یہ ہے کہ ہم سیدھا منہ پر کہہ دیتے ہیں کہ بھئی بوڑھے ہوگئے ہو ابھی تک وضو کرنا نہیں آیا۔ اگر ہم نرمی کا طریقہ بھی اختیار کرتے ہیں تو اتنا تو کہہ ہی دیتے ہیں کہ باباجی کسی سے وضو کرنا ہی سیکھ لیا ہوتا۔ حضرت حسنؓ نے بزرگ کو ان کی غلطی بتانے کا کیا خوبصورت طریقہ اختیار کیا، بزرگ سے کہا کہ باباجی میں بچہ ہوں، آپ ذرا میرا وضو دیکھیں کہ کہیں میرے وضو میں کوئی غلطی تو نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے سامنے بیٹھ کر وضو کیا، بزرگ کہنے لگے کہ بیٹا تمہارا وضو تو ٹھیک ہے میرے وضو میں گڑبڑ ہے۔

مخاطب کی ذہنی سطح اور نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے جناب نبی کریم ﷺ نے تو ہر انداز سے دعوت دی ہے، مخاطب نے جس انداز میں بات سمجھنا چاہی حضور ﷺ نے اسی

انداز میں بات سمجھائی۔ حضرت رکانہؓ جو ایک پہلوان تھے وہ کیسے مسلمان ہوئے؟ ہر آدمی اپنے فن کی زبان سمجھتا ہے، وہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ میں تب آپ کو نبی مانوں گا جب آپ مجھے کشتی میں پچھاڑیں گے۔ حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ نبوت کا کشتی سے کیا تعلق؟ حضور ﷺ کھڑے ہوئے، کشتی لڑی اور پچھاڑ دیا۔ رکانہؓ کہنے لگے کہ ایک مرتبہ میں تو اتفاقاً ایسا ہو جاتا ہے، آپ میرے ساتھ دوبارہ کشتی لڑیں۔ حضور ﷺ نے دوسری بار بھی پچھاڑ دیا۔ رکانہؓ کہنے لگے کہ ایک بار اور لڑیں۔ چنانچہ تین بار کشتی لڑی اور حضور ﷺ نے تینوں بار کامیابی حاصل کی، اس پر رکانہؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ رکانہؓ کو دلیل اور منطق کی زبان نہیں آتی تھی، وہ کشتی کی زبان ہی سمجھتے تھے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو ان کی زبان میں مخاطب کیا ہے اور ان کی نفسیات کے مطابق ان کے ساتھ ڈیل کیا۔ اسی حوالے سے ایک اور واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں اپنے چچا ابو طالب کے پاس بیٹھے تھے، عرب سرداروں کا ایک وفد آیا، بڑے بڑے سردار تھے جن میں ابو جہل بھی تھا۔ سب نے حضور ﷺ پر تنقید شروع کر دی اور شکایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابو جہل نے بالآخر حضور ﷺ سے پوچھا کہ بھتیجے! تم کہنا کیا چاہتے ہو، تمہارا مقصد کیا ہے؟ بات تو دعوت پر ہو رہی تھی کہ حضور ﷺ لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور بت پرستی وغیرہ سے منع فرماتے ہیں۔ ابو جہل نے کہا کہ بھتیجے دو ٹوک بات کرو کہ تم جو باتیں کہہ رہے ہو، یہ باتیں اگر ہم مان لیں تو ان کا نتیجہ کیا ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے کیا جواب دیا؟ فرمایا کہ میں ایک کلمہ آپ لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں، اگر یہ کلمہ آپ لوگ قبول کر لو تو عرب پر بھی تمہاری حکومت قائم ہو گی اور عجم بھی تمہارے قبضے میں ہو گا۔ یہ رسول اللہ ﷺ نے قریش کے سرداروں کو جواب دیا۔ اب کلمے کے نتائج میں صرف یہی نتیجہ تو نہیں ہے کہ حکومت قائم ہو جائے، کلمے کا اصل نتیجہ تو جنت ہے۔ لیکن یہی بات جب مدینہ منورہ میں ثابت بن قیس انصاریؓ نے پوچھی تو انہیں حضور ﷺ نے کیا جواب دیا؟ ثابت بن قیسؓ نے حضور ﷺ سے فرمایا کہ ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح ہم اپنی اور اپنے

بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جنت ملے گی۔ ثابتؓ نے کہا، ہم راضی ہیں۔ یعنی ابو جہل نے نتیجہ پوچھا تو جواب دیا کہ اس کے بدلے میں حکومت ملے گی، لیکن ثابت بن قیسؓ نے نتیجہ دریافت کیا تو فرمایا کہ جنت ملے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مخاطب کی نفسیات کے مطابق اسے جواب دیا۔ ثابت بن قیسؓ کو ان کی نفسیات کے مطابق جواب دیا اور ابو جہل کو اس کی نفسیات کے مطابق جواب دیا۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت دیتے وقت مخاطب کی نفسیات اور ذہنی سطح دیکھتے تھے کہ یہ کونسی زبان اور کونسا اسلوب سمجھتا ہے۔

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے علاقوں میں وفد بھیجتے تھے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی دوسرے علاقوں سے وفد آتے تھے۔ عرب کا مشہور قبیلہ ہے بنو تمیم، یہ بڑا چوہدری قسم کا قبیلہ تھا، ان کا وفد مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس زمانے کا اسلوب یہ تھا کہ جب کوئی وفد دوسرے قبیلے کے پاس جاتا تھا تو وہ اپنا شاعر اور اپنا خطیب ساتھ لے کر جاتا تھا۔ باقاعدہ مذاکرات سے پہلے خطیب اور شاعر کا مقابلہ ہوتا تھا، وفد کا خطیب اپنی قوم کے خصائل بیان کرتا تھا کہ ہم یہ ہیں، ہم وہ ہیں۔ اسی طرح شاعر اپنی شاعری میں اپنے آباؤ اجداد، اپنے بڑوں اور اپنے نامور افراد کے کارناموں کا ذکر کرتا تھا۔ جواب میں میزبان قبیلے کا خطیب اور شاعر اپنے قبیلے کی تعریف بیان کرتا تھا، اس کے بعد پھر باقاعدہ گفتگو شروع ہوتی تھی۔ بنو تمیم کا وفد بھی ایسا اکھڑ تھا کہ آکر حجرہ مبارکہ کے باہر سے ہی آواز دی یا محمدُ اُخرج الینا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم باہر آکر ہماری بات سنیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور پھر ملاقات کے لیے بٹھایا۔ اُقرع بن حابسؓ جو بنو تمیم کے وفد کی قیادت کر رہے تھے، ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے وفد کے خطیب سے کہا کہ اٹھو اور بات شروع کرو، اس نے اٹھ کر اپنی قوم کے فضائل و مناقب بیان کیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطیب تھے ثابت بن قیسؓ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کا لقب رکھا تھا خطیب الاسلام۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابتؓ سے کہا کہ اٹھو اور جواب دو، ثابت بن قیسؓ اٹھے اور اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب بیان کیے۔ اس کے بعد اقرع بن حابسؓ نے اپنے وفد کے شاعر سے

کہا کہ اٹھ کر اپنا کلام کہو، اس نے اٹھ کر اپنے قبیلے کی بہادری اور کارناموں کو شاعری میں بیان کیا۔ حضور ﷺ نے جواب میں اپنے شاعر حسان بن ثابتؓ سے کہا کہ اٹھو اور اپنا کلام کہو۔ حسان بن ثابت اپنے دور کے چوٹی کے شاعر تھے اور حضور ﷺ کے ذاتی شاعر تھے، انہیں شاعر رسول اللہ کا لقب حاصل تھا۔ چنانچہ وہ اٹھے اور اشعار میں اسلام کے مناقب اور حضور ﷺ کی مدح بیان کی۔ جب مذاکرات پورے ہوئے تو وفد کے سربراہ اقرع یہ کہہ کر اٹھے کہ بخدا محمد ﷺ کا خطیب بھی ہمارے خطیب سے بڑا خطیب ہے اور محمد ﷺ کا شاعر بھی ہمارے شاعر سے بڑا شاعر ہے۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا اسلوب یہ تھا کہ جو زبان مخاطب سمجھتا تھا، اسی زبان میں آپ ﷺ اس سے بات کرتے تھے، یہ دعوت کا بنیادی اسلوب ہے۔

آج کی گفتگو میں پہلی بات میں نے یہ عرض کی کہ جناب نبی کرم ﷺ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء کرامؑ کسی خاص علاقہ، قوم یا مخصوص عرصہ کے نبی تھے اور یوں ان کی نبوت کا دائرہ کار بھی علاقہ، قوم یا کسی خاص وقت محدود تھا۔ لیکن جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام علاقوں، تمام قوموں اور قیامت تک کے لیے نبوت عطا کی۔ یوں آپ ﷺ کی شریعت قیامت تک آنے والی نسل انسانی کے تمام طبقات کے لیے ہے۔

دوسری بات میں نے یہ عرض کی کہ وہ غیر مسلم مؤرخین جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر اور طاقت کے بل پر دنیا میں پھیلا ہے، ان کا یہ دعویٰ انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ اس لیے کہ مکہ میں نبی کریم ﷺ کی دعوت کا پہلا تیرہ سالہ دور انتہائی مظلومیت کا اور دعوتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹوں کا دور تھا، اس دور میں بھی بہت سے مقامی اور غیر مقامی لوگ قرآن کریم کی عظمت اور حضور ﷺ کے کردار سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے اور ان لوگوں نے بھی اپنی زندگیوں کو درپیش مشکلات و خطرات کا سامنا اسی طرح کیا جس طرح خود جناب نبی کریم ﷺ نے اپنی ذات کے حوالے سے کیا۔ جبکہ تلوار کا استعمال حضور ﷺ اور ان کے اصحابؓ نے پہلے تو اپنے دفاع میں اور بعد میں انصاف پر مبنی حکومت قائم کرنے

کے لیے کیا، ایسی حکومت جس کی بنیاد وحی الٰہی اور جناب نبی کریم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق و کردار پر تھی۔ پھر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مشرق بعید انڈونیشیا، ملائیشیا وغیرہ کی طرف مسلمانوں کا کبھی کوئی لشکر جنگ کے لیے نہیں گیا لیکن وہاں کروڑوں مسلمان بستے ہیں جو عرب کے مسلمان تاجروں کے کردار اور اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔

تیسری بات میں نے یہ عرض کی کہ دعوتِ اسلام کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل کیا تھا۔ پہلا یہ کہ داعی کے دل میں نسل انسانی کے لیے ہمدردی ہو اور ان کو مسلمان بنانے کے لیے تڑپ ہو۔ دوسرا یہ کہ داعی کا لب و لہجہ نرم اور اندازِ گفتگو شفیقانہ ہو تاکہ جسے دعوت دی جا رہی ہو، وہ داعی کو اپنا خیر خواہ سمجھے۔ تیسرا یہ کہ جسے دعوت دی جا رہی ہے اس کی ذہنی سطح اور نفسیات کا لحاظ کیا جائے اور یہ تسلی کی جائے کہ مخاطب تک اصل بات پہنچ گئی ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

خاندان نبوت ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، ایک حضرت اسحاق علیہ السلام اور دوسرے حضرت اسماعیل علیہ السلام۔ یوں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں دو سلسلے چلے۔ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے جن کا لقب "اسرائیل" تھا جو کہ عبرانی زبان میں "عبد اللہ" کو کہتے ہیں یعنی اللہ کا بندہ۔ حضرت اسحاقؑ سے بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں تقریباً تین ہزار پیغمبر مبعوث فرمائے۔ جبکہ حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے صرف ایک ہی پیغمبر ہوئے جو کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے قریش کا خاندان تھا جس کی ایک شاخ بنو ہاشم خاندان کی تھی، اس بنو ہاشم خاندان میں حضور ﷺ مبعوث ہوئے۔

نبی کریم ﷺ کے والدین

حضرت عبد اللہؓ اور حضرت آمنہؓ جناب نبی کریم ﷺ کے والدین تھے، حضور ﷺ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ آپ ﷺ کے والد محترم، جناب عبد المطلب کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ننھال سے آپ ﷺ کا تعلق بنو نجار سے تھا جو کہ یثرب شہر کا ایک قبیلہ تھا۔ یثرب اب مدینہ منورہ کہلاتا ہے۔ والد محترم عبد اللہ حضور ﷺ کی ولادت سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے، آپ ﷺ غالباً پانچ یا چھ سال کے تھے جب آپ ﷺ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا۔ آپ ﷺ نے بنو سعد کی ایک خاتون حلیمہ سعدیہ کا دودھ پیا جن کے خاوند ابو کبشہؓ کے نام سے معروف ہیں۔ انہی کی وجہ سے قریش کے بعض سردار طنز کے طور پر جناب نبی کریم ﷺ کو ابن ابی کبشہ کہا کرتے تھے۔ جب قیصر روم کے دربار میں ابو سفیانؓ پیش

ہوئے اور قیصر روم کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بات ہوئی تو ابو سفیانؓ نے دیکھا کہ قیصر روم نے رسول اللہ ﷺ اور ان کے خط کو بہت اہمیت دی، گفتگو سے فارغ ہو کر باہر آئے تو ابو سفیانؓ نے کہا أمر أمر ابن کبشۃ کہ ابو کبشہ کے بیٹے کی بات تو بہت بڑی ہو گئی ہے۔

ابو کبشہ اور حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے رضاعی ماں باپ تھے، دونوں مسلمان ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے آخر وقت تک ان کا خیال رکھا اور یہ دونوں صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ کی کوئی حقیقی بہن یا بھائی نہیں تھا۔ غزوۂ حنین کی لڑائی کے بعد ایک خاتون حضرت شیماءؓ نے آپ ﷺ کی رضاعی بہن ہونے کا دعویٰ کیا اور آپ کو بچپن کے واقعات یاد دلائے تو حضور ﷺ نے اس خاتون کے رضاعی بہن ہونے کی تصدیق کی اور اسے اکرام کے ساتھ تحفے تحائف دے کر رخصت کیا۔

نبی کریم ﷺ کی ازواج

جناب رسول اللہ ﷺ کی ازواج میں نکاح کی ترتیب کے لحاظ سے حضرت خدیجہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینب ام المساکینؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت صفیہؓ کے نام آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی کل ۱۱ بیویاں تھیں جبکہ بیک وقت ۹ تھیں۔ آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ ﷺ کی دو بیویاں فوت ہوئیں، ایک حضرت خدیجہؓ اور دوسری حضرت زینب ام المساکینؓ۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

آپ ﷺ کی پہلی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ قریش کی بڑی باعزت خاتون تھیں۔ وہ ایک تجارت پیشہ اور مالدار خاتون تھیں۔ جب حضور ﷺ کا حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح ہوا تو آپ ﷺ پچیس برس کے جبکہ حضرت خدیجہؓ چالیس برس کی تھیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا پہلا نکاح تھا جبکہ حضرت خدیجہؓ اس سے پہلے یکے بعد دیگرے دو خاوندوں سے

بیوہ ہو چکی تھیں۔ حضور ﷺ کا حضرت خدیجہؓ کے ساتھ یہ نکاح پچیس برس تک قائم رہا۔ ان پچیس سالوں کے دوران حضرت خدیجہؓ تنہا حضور ﷺ کے نکاح میں رہیں۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے وقت جناب نبی کریم ﷺ کی عمر پچاس برس تھی۔ اپنی عمر کے پچیس سے پچاس سال کے عرصے تک حضور ﷺ نے اور کوئی شادی نہیں کی، حضرت خدیجہؓ حضور ﷺ کی سب سے لمبی مدت کی بیوی تھیں۔ نبی کریم ﷺ آخر وقت تک حضرت خدیجہؓ کو یاد کرتے تھے اور ان کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے کبھی کسی پر رشک نہیں آیا سوائے خدیجہؓ کے، جب بھی کوئی بات ہوتی تو آپ ﷺ فرماتے کہ خدیجہؓ یوں کیا کرتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے کسی بات پر حضرت خدیجہؓ کا نام لیا تو میں بول پڑی کہ یارسول اللہ ﷺ آپ کیا اس بڑھیا کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان سے اچھی عورتیں دی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر حضرت خدیجہؓ کا دفاع کرتے ہوئے فرمایا کہ خدیجہؓ نے اس وقت میری تصدیق کی جب لوگ مجھے جھٹلاتے تھے، اس نے مجھ پر اپنا مال بھی خرچ کیا اور مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔

حضرت خدیجہؓ اور حضور ﷺ کے چچا ابو طالب کی وفات قریب قریب ہوئی۔ گھر میں سب سے زیادہ حضور ﷺ کا ساتھ دینے والی حضرت خدیجہؓ تھیں جبکہ گھر سے باہر خاندان میں سب سے زیادہ محافظ اور مددگار جناب ابو طالب تھے۔ ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انھوں نے چچا ہونے کے ناطے سے چچا ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ابو طالب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شعب ابو طالب میں بھی محصور رہے۔ جناب ابو طالب کی زندگی میں کسی کو حضور ﷺ کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی، جسے بھی کوئی شکایت ہوتی تو وہ ابو طالب سے کرتا تھا کہ اپنے بھتیجے سے یہ بات کرو، اپنے بھتیجے کو یہ سمجھاؤ۔ ابو طالب کی شخصیت کا ایک رعب اور مقام تھا۔ جس سال یکے بعد دیگرے جناب ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو وہ سال حضور ﷺ کے لیے بہت

پریشانی کا تھا کہ عالم اسباب میں جو دو بڑے سہارے تھے، دونوں ختم ہو گئے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اسے عام الحزن قرار دیا کہ یہ میرا غم کا سال ہے۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد قریش ہی کی ایک خاتون حضرت سودہ بنت زمعہؓ سے حضور ﷺ کا نکاح ہوا۔ یہ بھی ایک بیوہ خاتون تھیں اور حضور ﷺ کے مکی دور میں ہی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ حضرت سودہؓ جسمانی ساخت کے لحاظ سے اونچی لمبی اور بھاری تھیں۔ ان کی تاریخ وفات کے متعلق اختلاف ہے، عام خیال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کے آخری عرصے میں وفات پائی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

حضرت عائشہؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی تھیں اور ازواج مطہرات میں نبی کریم ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ 9 سال کی عمر میں رسول اللہ ﷺ کے عقد میں آئیں اور آپ ﷺ کے وصال کے وقت ان کی عمر 18 سال تھی۔ حضرت عائشہؓ سے نبی کریم ﷺ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت عائشہؓ ایک ذہین، فصیح اللسان اور سخی خاتون تھیں، ان کا علمی مقام یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں نہ صرف فتوے دیا کرتی تھیں بلکہ دوسرے اکابر صحابہؓ کے فتوؤں پر نقد کیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد ایک دفعہ کسی نے انہیں ایک لاکھ درہم ہدیہ بھیجا جو انہوں نے شام ہونے سے پہلے پہلے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت عائشہؓ کی شاگرد عمرہؓ اس کے متعلق بتاتی ہیں کہ ہم سب روزے سے تھے، حضرت عائشہؓ نے یہ رقم تقسیم کرنا شروع کر دی کہ یہ برتن بھر کر فلاں کو دے آؤ اور یہ رقم فلاں کے گھر دے آؤ، سارا دن ہم یہی کام کرتے رہے۔ روزہ کھولنے سے کچھ وقت پہلے حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے؟ میں نے حضرت عائشہ کو بتایا کہ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ناراضگی سے فرمایا کہ پہلے یاد کراتے تو میں افطاری کے لیے کچھ درہم رکھ

لیتی، اب کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے پانی سے روزہ کھولو۔ حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد تقریباً45 سال تک زندہ رہیں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

حضرت حفصہؓ حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی تھیں۔ ان کے خاوند حضرت خنیسؓ غزوہ بدر میں زخمی ہوئے اور بعد میں انہی زخموں کی وجہ سے شہید ہوئے۔ حضرت حفصہؓ جب بیوہ ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے ان کے نکاح کے متعلق بات کی لیکن حضرت ابو بکرؓ نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ یہ بات حضرت عمرؓ کو بہت ناگوار گزری لیکن بعد میں جب حضرت عمرؓ کو یہ بات پتہ چلی تو اطمینان ہو گیا کہ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے حضرت حفصہؓ کے متعلق پہلے سے تذکرہ فرمایا ہوا تھا۔ چنانچہ ۲ھ میں حضور ﷺ کا حضرت حفصہؓ سے نکاح ہوا۔ انہوں نے امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

حضرت زینب ام المساکین رضی اللہ عنہا

حضرت زینبؓ کے خاوند عبد اللہ بن جحشؓ جنگ اُحد میں شہید ہوئے تو حضور ﷺ نے ان کے ساتھ نکاح کر لیا لیکن حضور ﷺ کے ساتھ نکاح کے چند مہینے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت زینبؓ غرباء کو کھانا کھلانے اور مساکین کی مدد میں مشہور تھیں اس لیے انہیں ام المساکین کہا جاتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد حضور ﷺ کی صرف یہی زوجہ تھیں جو حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں فوت ہوئیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام سلمہؓ کا اصل نام ہند تھا، ذہین اور دانشمند خاتون تھیں۔ ان کے خاوند ابو سلمہؓ بھی غزوۂ احد میں شہید ہوئے، نبی کریم ﷺ نے ابو سلمہؓ کی نماز جنازہ پڑھانے کے بعد ان کی بہادری کی بہت تعریف کی۔ حضور ﷺ نے خود ام سلمہؓ کو نکاح کا پیغام بھجوایا، چنانچہ غزوۂ احد کے بعد نبی کریم ﷺ سے ان کا نکاح ہوا۔ عام خیال یہ ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وفات ازواجِ مطہرات میں سب سے آخر میں ہوئی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

حضرت زینبؓ حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ کی بیوی تھیں۔ انہوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تو اللہ رب العزت نے ان کا نکاح جناب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کرنے کا قرآن کریم میں اعلان کر دیا۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ حضور ﷺ کے اس نکاح کا قرآن کریم میں ذکر ہے جس پر حضرت زینبؓ بہت فخر کیا کرتی تھیں۔ حضرت زینبؓ حضور ﷺ کے خاندان بنو ہاشم سے تھیں۔ محدثین ایک دلچسپ بات نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا، میری ازواج میں سے میرے بعد سب سے پہلے میرے پاس وہ آئے گی جس کا ہاتھ سب سے زیادہ لمبا ہو گا۔ اس پر بعض ازواج مطہرات نے یہ دیکھنے کے لیے اپنے ہاتھوں کی پیمائش کی کہ کس کا ہاتھ لمبا ہے۔ حالانکہ اس سے حضور ﷺ کی مراد زیادہ سخاوت کرنے والی یا زیادہ خرچ کرنے والی کی تھی اور یہ بات ام المؤمنین حضرت زینبؓ پر صادق آتی تھی۔ حضرت زینبؓ بہت سخی اور بڑے دل والی خاتون تھیں جو ہاتھ میں آتا لوگوں پر خرچ کر دیتیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق آپ ﷺ کی وفات کے بعد سب سے پہلے حضرت زینبؓ کی وفات ہوئی۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا

غزوۂ بنو مصطلق میں بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے جو لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ حضرت جویریہؓ لڑائی میں شکست کھانے والے قبیلے کے سردار کی بیٹی تھیں، وہ بھی قید ہو کر لونڈی بنیں اور ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئیں۔ حضور ﷺ نے ثابت بن قیس کو رقم ادا کر کے حضرت جویریہؓ کو آزاد کرایا اور ان سے نکاح کر لیا۔ جب لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی حضرت جویریہؓ کے قبیلے کے قیدیوں کو آزاد کرنا شروع کر دیا، یوں رسول اللہ ﷺ کے اس نکاح کی وجہ سے سینکڑوں قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا۔ حضرت جویریہؓ کا انتقال حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کے زمانے میں ہوا۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام حبیبہؓ کے خاوند نے عیسائیت قبول کرلی تھی چنانچہ اسی وجہ سے ان کی اپنے خاوند سے علیحدگی ہوگئی۔ روایات میں آتا ہے کہ نجاشی حبشہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ام حبیبہؓ کا نکاح پڑھایا۔ حضرت ام حبیبہؓ کی وفات بھی امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں ہوئی۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا

حضرت میمونہؓ اپنے خاوند ابورہم کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی خواہش پر یہ نکاح ہوا۔ حضرت عباسؓ نے ان کا نکاح پڑھایا جبکہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا

حضرت صفیہؓ غزوۂ خیبر میں قید ہوکر لونڈی بنیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کرلیا۔ حضرت صفیہؓ کے والد اور بھائی غزوۂ خیبر میں مارے گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صفیہؓ کے ساتھ بڑی الفت تھی اور حسب موقع ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گھریلو ماحول

ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روزانہ کا معمول یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز کے بعد تمام ازواج مطہرات کے حجروں میں باری باری جایا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام مسجد نبوی کے پیچھے حجروں میں تھا۔ ایک حجرہ حضرت عائشہؓ کا تھا جس میں اب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی قبور ہیں جبکہ ایک قبر کی جگہ ابھی باقی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مخصوص ہے۔ باقی ازواج مطہرات کے حجرے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمانوں پر اٹھالیا تھا اس لیے ان کو دوسرے انسانوں کی طرح موت نہیں آئی اور اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے امتی کی حیثیت سے دوبارہ دنیا میں بھیجیں گے۔ انسانوں میں سب سے لمبی عمر کے انسان حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر حضرت نوحؑ علیہ السلام کو لمبی عمر کا انسان مانا جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ لمبی عمر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے کہ ان کی اس وقت تقریباً دو ہزار سال عمر ہو گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ نازل ہوں گے اور حضرت امام مہدیؒ کے ساتھ مل کر دنیا میں اسلام کا غلبہ قائم کریں گے، ان کی شادی ہو گی، بچے ہوں گے، مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہو گا اور وہ میرے ساتھ قبر میں دفن ہوں گے۔ چنانچہ اس قبر کی جگہ اب بھی خالی ہے اور وہاں لکھا ہوا ہے کہ یہ قبر کی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مخصوص ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ روزانہ عصر کے بعد باری باری ہر زوجہ کے حجرے میں جاتے تھے، سب سے حال احوال پوچھتے تھے اور ضروریات کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے۔ رات کس زوجہؓ کے پاس گزاری جائے، اس کے لیے آپ ﷺ نے باریاں مقرر کر رکھی تھیں۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی دعا میں کہا تھا کہ یا اللہ! جو میرے اختیار میں ہے اس میں تو میں برابری کرتا ہوں، یعنی ازواج کے لیے خرچہ اور عطیات وغیرہ، لیکن جو میرے اختیار میں نہیں ہے یعنی دل کا رجحان اور میلان، اے اللہ اس میں میرا مواخذہ نہ کرنا۔ دلی معاملہ آپ ﷺ کا حضرت عائشہؓ کے ساتھ زیادہ تھا جو کہ ایک فطری بات تھی، دل کے معاملات کسی کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ حضرت عائشہؓ نوجوان، ذہین اور سمجھدار خاتون تھیں اور ازواج مطہرات میں حضور ﷺ کی سب سے زیادہ پسندیدہ تھیں۔ اور یہ بات بھی غیر فطری نہیں ہے کہ جہاں ایک سے زیادہ بیویاں بیک وقت ہوں وہاں آپس میں اختلاف کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ازواج مطہرات کی بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نوک جھونک رہتی تھی، محدثین اس بارے میں بہت سے واقعات ذکر فرماتے ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی اور یہ امت کی تعلیم کا ایک اہتمام تھا کہ مختلف مزاج کی عورتیں حضور ﷺ کے ساتھ مل جل کر رہیں، ان کی آپس میں معاصرت بھی ہو، نوک جھونک بھی ہو، لیکن اس سب کے باوجود ایک دائرے کی پابندی بھی ہو۔

ازواجِ مطہراتؓ میں سب سے زیادہ معاصرت حضرت عائشہؓ اور حضرت زینبؓ کے درمیان تھی۔ کبھی کبھی بات سخت بھی ہو جاتی تھی، دونوں حسب موقع ایک دوسرے پر فخر بھی جتلایا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر حضرت زینبؓ فرمایا کرتی تھیں کہ میرا قرآن کریم میں ذکر ہے فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِىْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ (سورۃ الاحزاب:۳۷) کہ پھر جب زید اس (زینب) سے حاجت پوری کر چکا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی گناہ نہ ہو۔ حضرت زینبؓ دوسری ازواجِ مطہرات سے فرمایا کرتی تھیں کہ تم سب کا نکاح زمین پر ہوا جبکہ میرا نکاح آسمانوں پر ہوا۔ تم میں سے کسی کے نکاح کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے لیکن میرے نکاح کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ سب ازواج اکٹھی ہوئیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے اس کے لیے انہوں نے آپس میں فیصلہ کر کے حضرت زینبؓ کو متکلم بنایا۔ حضرت زینبؓ نے لمبی گفتگو کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کو حضرت عائشہؓ کے بارے میں کچھ تحفظات ہیں وغیرہ۔ جب حضرت زینبؓ بات مکمل کر چکیں تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بھی اجازت ہے کہ میں کچھ بات کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں تمہارا بھی حق ہے۔ حضرت عائشہؓ بہت فصیح اللسان تھیں ان کی فصاحت اپنے زمانے میں ضرب المثل تھی۔ جب حضرت عائشہؓ نے گفتگو شروع کی تو سب ازواج خاموش ہو گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں ایک ہی جملہ فرمایا کہ آخر ابو بکرؓ کی بیٹی ہے، یعنی باقی ازواج سے کہا کہ اب بولو عائشہؓ کے سامنے۔ چنانچہ اس قسم کی باتیں ازواجِ مطہرات میں آپس میں معاصرت کی ہو جایا کرتی تھیں۔

یہ فطری بات ہے کہ ایک خاوند کی زیادہ بیویاں ہوں تو ان کا آپس میں کسی نہ کسی بات پر اختلاف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب منافقوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو ازواجِ مطہرات سے حضرت عائشہؓ کے کردار کے بارے میں پوچھا گیا۔ اس واقعہ کے گزر جانے کے بعد حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ مجھے سب سے زیادہ خطرہ زینبؓ سے تھا لیکن

حضرت عائشہؓ کے بارے میں سب سے زیادہ صفائی حضرت زینبؓ نے ہی دی۔ حضرت زینبؓ نے فرمایا ما علمت فیھا الا خیرا یا رسول اللہ ﷺ میں نے تو عائشہ میں خیر کے سوا کوئی بات نہیں دیکھی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ نے ازواج کے درمیان باہمی زندگی کا ایک نمونہ بتایا کہ یہ موقع ہوتا ہے فائدہ اٹھانے کا، لیکن حضرت زینبؓ نے باوجود معاصرت کے وہ بات کہی جسے وہ دیانت داری کے ساتھ سچ سمجھتی تھیں۔

خرچ کا معاملہ یہ تھا کہ جو کچھ حضور ﷺ کے پاس ہوتا آپ ﷺ برابر تقسیم فرما دیتے تھے۔ آپ ﷺ کا کوئی مستقل کاروبار تو تھا نہیں، غنیمت میں سے حصہ مل جاتا، بیت المال سے کوئی چیز مل جاتی، یا کوئی ہدیہ پیش کر دیتا تو حضور ﷺ ازواج میں تقسیم فرما دیتے۔ گھر کی صورتحال کے بارے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی ہم یعنی حضور ﷺ کے خاندان پر ایسا وقت نہیں گزرا کہ ہم نے عام قسم کی کھجوریں تین دن مسلسل پیٹ بھر کر کھائی ہوں، کئی کئی دن چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ کبھی کچھ کھجوریں مل جاتیں، کبھی ستو وغیرہ مل جاتے اور کبھی کچھ بھی نہ ملتا۔ فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ حیات تھے تو ہم میں سے ہر ایک کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑوں کا ہوتا تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت تھی کہ زندگی میں غیر ضروری سہولتیں اختیار نہ کی جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اختیاری طور پر اور حکمت کے طور پر یہ زندگی اختیار کی تھی اور حضور ﷺ کی زندگی کے بعد بھی ازواج مطہرات نے آخر وقت تک یہی طرز زندگی اپنائے رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد ازواج کے پاس مال زیادہ آتا تھا لیکن وہ سب ضرورت مندوں پر خرچ بھی ہو جاتا تھا۔

یہ جناب نبی کریم ﷺ کے گھر کا ماحول تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے زندگی بھر ہم ازواج کو گھر کے معاملات میں نہیں ٹوکا، حضور ﷺ سختی نہیں فرماتے تھے۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا کہ انا خیرکم لاھلی کہ میں تم میں سے اپنے خاندان کے ساتھ سب سے بہتر ہوں۔ البتہ دینی معاملے میں کمی بیشی ہوتی تو آپ ﷺ اس

کانوٹس لیتے تھے لیکن گھر کے اندر یا دنیوی معاملات میں کسی قسم کا کوئی نقصان ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ اس کے متعلق نرمی سے پیش آتے۔ رسول اللہ ﷺ گھر کے کاموں میں ہمارا ہاتھ بٹاتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حسب ضرورت گھر میں جھاڑو بھی دیا، جوتے بھی گانٹھے اور چارپائیاں بھی کسیں۔ اس طرح گھر کے دیگر کاموں میں حضور ﷺ ازواجِ مطہرات کی مدد فرمایا کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ کی اولاد

حضرت ابراہیمؓ کے علاوہ حضور ﷺ کی ساری اولاد حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھی۔ صرف حضرت ماریہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیمؓ کی ولادت ہوئی جو نبی کریم ﷺ کی لونڈی تھیں اور مصر کے بادشاہ مقوقس نے آپ ﷺ کو ہدیہ میں بھیجی تھیں۔

حضرت قاسم رضی اللہ عنہ

حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ کی اولاد میں، بیٹوں میں یقینی طور پر حضرت قاسمؓ کا نام آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت قاسمؓ اتنی عمر کو پہنچ گئے تھے کہ گھوڑے کی سواری کر لیتے تھے لیکن نبوت سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ باقی بیٹوں کے نام بعض روایات میں آتے ہیں، عبد اللہ، طاہر اور طیب۔ اس میں مؤرخین اختلاف کرتے ہیں کہ یہ الگ الگ بیٹے ہیں یا ایک ہی بیٹے کا نام عبد اللہ ہے اور لقب طاہر ہے۔ یہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے، قاسم چونکہ بڑے ہوئے تھے اس لیے ان کا ذکر روایات میں آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی کنیت ابو القاسم انہی کی وجہ سے تھی۔ چھوٹے بچوں کے نام تو روایات میں آتے ہیں لیکن ان کے بارے میں تفصیلات نہیں آتیں، بعض محدثین کہتے ہیں کہ دو بیٹے تھے، بعض کہتے ہیں کہ تین بیٹے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ عبد اللہ، طاہر، طیب ایک ہی بیٹے کے نام تھے۔

البتہ حضور ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں، چاروں جوان ہوئیں اور چاروں کی شادیاں ہوئیں۔ تین بیٹیوں کی اولاد ہوئی جبکہ ایک کی اولاد نہیں ہوئی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

آپ ﷺ کی بڑی بیٹی حضرت زینبؓ کا نکاح اپنے خالہ زاد ابو العاص بن ربیعؓ سے ہوا تھا جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے۔ یہ غزوۂ بدر میں کفار کی طرف سے تھے۔ غزوۂ بدر کے بعد ابو العاص حضور ﷺ کی قید میں آگئے تھے جبکہ دونوں کا نکاح باقی تھا کہ ابھی نکاح کے نئے قوانین نازل نہیں ہوئے تھے۔ حضرت زینبؓ نے اپنا ہار فدیہ میں دے کر انہیں رہا کروایا۔ ابو العاصؓ بعد میں ایک موقع پر مسلمان ہوگئے تھے اور پھر مسلمانوں کی طرف سے معرکوں میں شریک ہوتے رہے، بہت بہادر آدمی تھے۔ ان کا ذکر نبی کریم ﷺ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ ابو العاصؓ نے مجھے میری بیٹی کے بارے میں کبھی تنگ نہیں کیا۔ کسی باپ کا اپنی بیٹی کے حوالے سے داماد کا خیر سے ذکر کرنا بڑی بات ہوتی ہے۔ حضرت زینبؓ کی اولاد میں ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی۔ بڑی بیٹی امامہؓ تھیں جبکہ بیٹے علی تھے۔ امامہؓ حضور ﷺ کی بہت لاڈلی نواسی تھیں، روایات میں آتا ہے کہ امامہؓ نماز کے دوران حضور ﷺ کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں، حضور ﷺ قعدے میں بیٹھتے تھے تو امامہؓ کبھی کندھے پر چڑھ جاتیں اور کبھی آکر گود میں بیٹھ جاتی تھیں۔ حضور ﷺ نماز کے دوران سجدے میں جاتے تھے تو یہ گردن پر چڑھ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ایک روایت میں تو یوں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک دفعہ امامہؓ کو اپنی گود میں اٹھا کر نماز مکمل کی۔

جناب رسول اللہ ﷺ بچوں سے بہت شفقت فرمایا کرتے تھے، بچوں کو گود میں اٹھانا، ان کو پیار کرنا، انہیں بوسہ دینا، ان کے سر پر ہاتھ پھیرنا، ان کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرنا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں بچوں کے ساتھ حضور ﷺ سے زیادہ شفقت کرنے والا نہیں دیکھا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ بچوں کو بہلانے کے لیے زبان ہلا کر دکھایا کرتے تھے، آپ ﷺ بچوں کے ساتھ بچہ بن جایا کرتے تھے۔ امامہؓ جوان ہوئیں تو حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کی وصیت کے مطابق حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے امامہؓ سے نکاح کیا۔ حضرت زینبؓ کے ایک بیٹے تھے جن کا نام علیؓ تھا۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا

حضور ﷺ کی دوسری بیٹی حضرت رقیہؓ تھیں۔ حضرت رقیہؓ کا نکاح حضور ﷺ نے پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے کیا تھا، نکاح ہو گیا تھا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ حضور ﷺ کی تیسری بیٹی ام کلثوم ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ کے نکاح میں تھیں۔ اس دوران دعوتِ اسلام کا سلسلہ شروع ہو گیا، ابولہب نے اس عداوت میں اعلان کر دیا کہ میں اپنے بیٹوں کی شادیاں حضور ﷺ کی بیٹیوں سے نہیں کروں گا۔ پھر حضرت رقیہ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے ہوا، حضرت عثمانؓ جب ہجرت کر کے حبشہ گئے تو حضرت رقیہؓ ان کے ساتھ تھیں، حبشہ میں ان کا بیٹا عبد اللہؓ پیدا ہوا۔ حضرت عثمانؓ انہی کے حوالے سے ابوعبد اللہؓ کہلاتے تھے۔ یہ حضور ﷺ کا دوسرا نواسہ جبکہ حضرت رقیہؓ کے بطن سے پہلا بیٹا تھا، چھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ ایسے کہ مدینہ منورہ واپس آئے، ایک مرتبہ کھیل رہے تھے کہ کسی دوسرے بچے نے چھڑی ماری جو آنکھ میں لگ گئی، اسی زخم سے پھر وفات ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ مدینہ میں ہوتے ہوئے بھی بدر کی لڑائی میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت رقیہؓ گھر میں بیمار تھیں، حضرت عثمانؓ کے علاوہ اور کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے خود حضرت عثمانؓ سے گھر پر رکنے کا کہا تھا کہ رقیہؓ اٹھ نہیں سکتی، پانی نہیں پی سکتی، معذور ہے، اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ حضرت رقیہ کی تیمار داری میں مدینہ منورہ میں رکے رہے اور پھر اسی حالت میں غزوۂ بدر کے بعد حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا

حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضور ﷺ نے اپنی دوسری بیٹی ام کلثوم حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دی، اسی لیے حضرت عثمانؓ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے یعنی دو نوروں والا۔ ایک بیٹی کے بعد دوسری بیٹی کو نکاح میں دینا، یہ داماد پر بے پناہ اعتماد کی علامت ہے۔ جب حضرت ام کلثومؓ بھی فوت ہو گئیں تو اس وقت حضور ﷺ کی بیٹیوں میں صرف حضرت فاطمہؓ زندہ تھیں اور حضرت علیؓ کے نکاح میں تھیں۔ حضور ﷺ نے حضرت عثمانؓ سے

ایک جملہ فرمایا کہ اے عثمان! اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں تیرے نکاح میں دیتا جاتا۔ حضرت ام کلثومؓ کی اولاد نہ تھی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

حضور ﷺ کے تیسرے داماد حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ دامادوں میں حضرت علیؓ حضور ﷺ کے سب سے زیادہ چہیتے داماد تھے جبکہ بیٹیوں میں حضرت فاطمہؓ حضور ﷺ کی سب سے زیادہ چہیتی بیٹی تھیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ سب سے چھوٹا بچہ زیادہ لاڈلا ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کو حضرت فاطمہؓ سے بہت محبت تھی۔ آپ ﷺ کسی سفر پر جانے سے پہلے سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملنے جاتے، آپ ﷺ سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے۔ جب حضرت فاطمہؓ جوان ہوئیں تو مختلف جگہوں سے شادی کے پیغامات آتے جن پر حضور ﷺ خاموش ہو جاتے تھے۔ لیکن جب حضرت علیؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ اگر فاطمہؓ کا نکاح میرے ساتھ ہو جائے تو اس پر حضور ﷺ مسکرائے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ شاید حضور ﷺ اسی انتظار میں تھے۔ حضرت علیؓ درویش آدمی تھے، حضور ﷺ نے پوچھا کچھ پاس ہے بھی یا نہیں؟ حضرت علیؓ نے بتایا، یارسول اللہ ﷺ کچھ بھی نہیں ہے۔ پوچھا مہر دینے کے لیے کچھ ہے؟ بتایا، یارسول اللہ ﷺ وہ بھی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا وہ زرہ کہاں ہے جو تمہیں غنیمت میں ملی تھی؟ بتایا، وہ میرے پاس ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ لے کر آؤ۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے وہ زرہ لے کر بیچ دی جسے حضرت عثمانؓ نے خریدا۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ اس میں سے مہر بھی ادا کرنا اور کچھ سامان وغیرہ بھی خریدنا۔ اور جب نکاح ہو گیا تو رہائش کا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ حضرت علیؓ تو حضور ﷺ کے پاس ہی رہتے تھے۔ ایک انصاری صحابیؓ تھے حضرت حارثؓ، وہ کہنے لگے کہ حضور ﷺ میرے پاس ایک مکان فارغ ہے، میری اس سے بڑی سعادت کیا ہو گی کہ آپ ﷺ کی بیٹی اور داماد وہاں رہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ وہاں منتقل ہو گئے۔ حضور ﷺ کی زندگی میں حضرت فاطمہؓ کے علاوہ آپ ﷺ کی ساری اولاد فوت ہو گئی تھی۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ بیماری کی حالت میں تھے تو حضرت فاطمہؓ آیا کرتی تھیں اور حضور ﷺ کا حال احوال پوچھا کرتی تھیں۔ آپ ﷺ کی وفات سے کچھ دن پہلے حضرت فاطمہؓ آئیں اور آکر حال احوال پوچھا، حضور ﷺ نے بھی ان کی خیریت دریافت کی۔ حضور ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کے کان میں کچھ بات کہی جس سے حضرت فاطمہؓ زاروقطار رونے لگ گئیں۔ اس پر آپ ﷺ نے دوبارہ حضرت فاطمہؓ کے کان میں کچھ کہا تو وہ ہنسنے لگ گئیں۔ حضرت فاطمہؓ حضور ﷺ کے پاس سے اٹھ کر حضرت عائشہؓ کے پاس گئیں تو انہوں نے پوچھ لیا کہ کیا بات تھی کہ پہلے حضور ﷺ نے کچھ کہا تو آپ رونے لگ گئیں اور دوبارہ کچھ کہا تو آپ ہنسنے لگ گئیں۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ کان میں بات کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ راز کی بات تھی۔ حضرت فاطمہؓ نے وہ بات رسول اللہ ﷺ کی حیات میں کسی کو نہیں بتائی۔ حضور ﷺ کے انتقال کے بعد جب حالات معمول پر آئے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ سے پھر وہی بات پوچھی۔ اس پر وہ کہنے لگیں کہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے کان میں کہا تھا کہ فاطمہ! میں دنیا سے جا رہا ہوں۔ باپ کی وفات کی خبر کا ایک بیٹی کو کتنا صدمہ ہو سکتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کہتی ہیں کہ جب میں نے رونا شروع کیا تو حضور ﷺ نے میرے کان میں پھر کہا کہ میرے بعد سب سے پہلے تم میرے پاس آؤ گی۔

صوفیاء فرماتے ہیں کہ دیکھو، یہ محبت کا رشتہ کیسا رشتہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت فاطمہؓ کو اپنی وفات کی خبر دی تو آپ رو پڑیں لیکن جب ان کی وفات کی خبر دی تو اس پر خوش ہو گئیں۔ اب کسی کو وفات کی خبر دی جائے تو اس کا کیا رد عمل ہونا چاہیے۔ یہ محبت کے رشتے ہوتے ہیں کہ جن میں زندگی و موت کا معاملہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو ان کی موت کی خبر دی تو وہ خوش ہو گئیں اور ہنسنے لگیں کہ والد سے جدائی کے دن زیادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ تقریباً چھ مہینے حیات رہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سب سے چھوٹی، سب سے چہیتی اور سب سے لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا فاطمہ بضعۃ منی فاطمہ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔

یہ فطری بات ہے کہ انسان کو کچھ باتیں طبعی طور پر ناگوار گزرتی ہیں۔ ابو جہل کی بیٹی مسلمان ہوگئی تھی اور صحابیہ بن کر مدینہ منورہ آگئی تھی۔ حضرت علیؓ کے دل میں اس کے ساتھ نکاح کا خیال آیا اور یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی کہ عرب میں تعددِ ازدواج کا عام رواج تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہ فرمایا جس پر حضرت علیؓ نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ حالانکہ وہ صحابیہ تھی لیکن یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہؓ کے ساتھ طبعی رشتہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گوارا نہ کیا۔ حضرت فاطمہؓ بہت باحیا تھیں۔ ایک مرتبہ اسماء بنت عمیسؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ جب ہم ہجرت کر کے حبشہ گئے تو وہاں میں نے جنازے کا ایک طریقہ دیکھا تھا کیا میں وہ بتاؤں آپ کو؟ فرمایا، ہاں بتاؤ۔ اسماء نے طریقہ بتایا کہ وہاں کے لوگ میت کی چارپائی کے دونوں طرف درخت کی ٹہنیاں پھنسا کر اس کا محراب بناتے تھے اور پھر اس کے اوپر پردہ ڈال دیتے تھے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ میرے جنازے پر ایسا ہی کرنا۔

حضرت فاطمہؓ کے تین بیٹے تھے۔ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت محسنؓ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں جن بچوں نے پرورش پائی ان میں حضرت امامہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کو آرام فرما رہے تھے کہ حضرت حسنؓ آپ کے پیٹ پر چڑھ کر بیٹھے اور پیشاب کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھ کر کپڑے پاک کرنے کا انتظام کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بنو تمیم کے سردار اقرع بن حابسؓ پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے غالباً حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ کو بوسہ دیا۔ اقرع نے حیرانگی سے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں؟ میرے دس بچے ہیں، میں نے تو کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ایک روایت کے مطابق فرمایا کہ خدا نے اگر تیرے سینے میں پتھر کا دل رکھ دیا ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ حضرت حسنؓ جو سامنے سے گزر رہے تھے، ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رہا نہ

گیا، آپ ﷺ منبر سے اتر کر گئے، حضرت حسنؓ کو اٹھا کر اپنے ساتھ منبر پر لائے اور پھر اسی طرح خطبہ ارشاد فرمانا شروع کر دیا۔ پھر یہ پیشین گوئی فرمائی ان ابنی ھذا سیدًا وسیصلح اللہ بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین کہ یہ میرا بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروائے گا۔

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ

آپ ﷺ کے آخری بیٹے حضرت ابراہیمؓ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے۔ بعض روایات میں ایک سال اور بعض روایات میں دو سال کا ذکر آتا ہے کہ اِس عمر میں ان کا انتقال ہو گیا تھا، حضور ﷺ ان کی وفات پر بہت غمگین ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمَ لَمَحْزُوْنُوْنَ اے ابراہیمؓ! ہم تمہاری جدائی پر بہت غمزدہ ہیں۔ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک صحابیؓ نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ہمیں رونے سے منع فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ زبان کے رونے سے منع کرتا ہوں آنکھ کا رونا تو فطری ہے۔ زبان کا رونا منع ہے یعنی شکوہ کرنا اور بین کرنا وغیرہ لیکن جب آدمی غمگین ہو تو آنکھوں سے آنسو بہتے ہی ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے متعلقین

حضور ﷺ کے اہل خاندان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جو گھر کے افراد سمجھے جاتے تھے۔ دو تین شخصیات ایسی تھیں کہ جنہیں باہر سے آنے والا گھر کے افراد ہی سمجھتا تھا۔

حضرت بلالؓ فرماتے ہیں کہ ہجرت سے لے کر حضور ﷺ کے وصال تک، رسول اللہ ﷺ کے گھر کے کام کاج میری ذمہ داری ہوا کرتے تھے۔ کوئی رقم آتی تو گھر کے خرچ اور گھر کی ضروریات کے لیے میرے حوالے ہو جاتی تھی، گھر کے متعلق کوئی بھی کام ہوتا حضور ﷺ مجھ سے کہتے تھے کہ بلال! فلاں فلاں کام کرنا ہے۔

دوسرے عبد اللہ بن مسعودؓ تھے جن کے پاس حضور ﷺ کی مسواک اور بچھونا وغیرہ ہوتا تھا۔ حضور ﷺ کے لیے قضائے حاجت یا وضو کے پانی وغیرہ کا بندوبست کرنا، یہ ان کا کام تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا تو لقب ہی پڑ گیا تھا صَاحِبُ الْوِسَادَة کہ یہ

حضور ﷺ کے بچھونے والے ہیں۔ مدینہ منورہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ حضور ﷺ کے ذاتی خادم کی ذمہ داری نبھاتے تھے۔

تیسرے آدمی حضرت انس بن مالکؓ تھے جو حضور ﷺ کے ذاتی خادم تھے، ان کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔ ان کی والدہ محترمہ ہجرت سے پہلے مسلمان ہوگئی تھیں، ان کے خاوند کا نام مالک آتا ہے جو ان کے قبول اسلام سے ناراض ہو کر گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ حضرت انسؓ کی والدہ نے پھر ابو طلحہؓ سے نکاح کیا۔ حضور ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی عمر دس سال تھی۔ والدہ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس اور تو کچھ نہیں ہے لیکن یہ بچہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہے، پھر انس بن مالکؓ آپ ﷺ کی خدمت میں رہے۔ گھر میں کئی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے، کسی کو بلانا، کسی کو پیغام پہنچانا، گھر کی دیگر ضروریات وغیرہ۔ حضرت انسؓ نے دس سال تک حضور ﷺ کی خدمت کی، اس پر حضور ﷺ نے حضرت انسؓ کو ایک دعا دی جو کہ ایک مشہور دعا ہے۔ حضور ﷺ نے دعا فرمائی اللّٰھم بارک لہ فی عمرہ ومالہ واکثر ولدہ کہ اے اللہ! اسے مال بھی بہت زیادہ دے اور اولاد بھی بہت زیادہ دے۔ چنانچہ سب سے آخر میں جن چند صحابہؓ نے وفات پائی، حضرت انسؓ ان میں سے ایک تھے۔ مختلف روایات کے مطابق ۱۰۲ھ یا ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ تقریباً ۱۱۲ سال کی عمر پائی، حضرت انسؓ کی براہ راست اولاد ۲۰۰ سے زیادہ تھی جبکہ بے حساب دولت کے مالک تھے۔

میں نے رسول اللہ ﷺ کے کنبے اور خاندان کا مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ پر کروڑوں درود نازل فرمائیں، آپ ﷺ کی ازواج پر، آپ ﷺ کی اولاد پر، آپ ﷺ کے تمام متعلقین پر اور قیامت تک آنے والے آپ ﷺ کے تمام اتباع پر اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت پر چلنے کی، آپ ﷺ کے اسوہ کو اپنانے کی اور حضور ﷺ کی سنت کا ذوق بیدار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

اخلاق حسنہ، سیرت نبوی ﷺ کا سب سے نمایاں پہلو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی انسانی تاریخ کی وہ منفرد اور ممتاز ترین شخصیت ہے جس کے حالات زندگی، عادات و اطوار، ارشادات و فرمودات، اور اخلاق حسنہ اس قدر تفصیل کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی ایک کھلی کتاب کے طور پر نسل انسانی کے سامنے ہے اور آپ ﷺ کی معاشرتی و خاندانی حتیٰ کہ شخصی اور پرائیویٹ زندگی کا بھی کوئی پہلو تاریخ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔ اسے محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ انسانی تاریخ اپنے دامن میں جناب رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور شخصیت کے احوال و اقوال کو اس اہتمام کے ساتھ محفوظ نہیں رکھ سکی۔ بلکہ یہ قدرتِ خداوندی کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کے تکوینی فیصلے کا آئینہ دار ہے کہ جب اللہ رب العزت نے اپنے پاکیزہ کلام قرآن کریم میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو پوری نسل انسانی کے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دیا تو اس اسوۂ حسنہ اور نمونۂ کامل کا اپنی تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہنا اس حکم خداوندی کا منطقی تقاضہ ہے۔ اور یہ منطقی تقاضہ ایک معجزہ کے طور پر تاریخ انسانی کا ناقابل فراموش باب بن چکا ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ ایک انسان زندگی کے کسی بھی شعبہ میں قدم رکھنے اور آگے بڑھنے سے پہلے اپنے سے بہتر شخص کے عمل و کردار کو بطور نمونہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جو شخص کسی بھی حوالے سے اس کی نظروں میں بہتر اور خوب قرار پاتا ہے اس کی پیروی کو وہ اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ "آئیڈیل کی تلاش" کا تصور اسی انسانی

فطرت کا اظہار ہے اور اللہ رب العزت نے نسل انسانی کی ہدایت و راہنمائی کے نظام میں اس کی فطرت کے اس پہلو کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورہ فاتحہ میں انسان کو ہدایت کے لیے جو دعا سکھائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

"اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے پر جو تیرے غضب کا شکار ہوئے اور گمراہ ہوئے۔"

یہ انعام یافتہ لوگ جن کے نقش قدم پر چلنے کی سورہ فاتحہ میں تلقین کی گئی ہے بلاشبہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے سچے پیروکاروں کا مقدس گروہ ہے جو اپنے کردار و اخلاق کے اعتبار سے نسل انسانی کا سب سے ممتاز طبقہ ہے۔ اور نسل انسانی نے اپنے اپنے دور میں اس طبقہ کے ہر فرد سے راہنمائی اور ہدایت حاصل کی ہے۔ لیکن ان نیک اور پارسا شخصیات کی زندگیاں اپنی اپنی جگہ ہدایت کا منبع ہونے کے باوجود آج کے انسان کے لیے تاریخ کے صفحات پر اس انداز سے محفوظ نہیں ہیں کہ وہ ان سے اپنی زندگی کے مسائل و مشکلات میں راہنمائی حاصل کر سکے۔ سوائے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے کہ آج کا انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں راہنمائی حاصل کرنا چاہے تو اسے آنحضرت ﷺ کے حالاتِ زندگی یا اقوال و ارشادات میں راہنمائی کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور مل جائے گی۔ یہ محض عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے آزمائش کی کسی بھی کسوٹی پر آج بھی پرکھا جا سکتا ہے۔

آج نسل انسانی جس ذہنی انتشار، دلی بے اطمینانی اور معاشرتی انارکی کا شکار ہے اس نے ان تمام نظریات، افکار، فلسفوں اور نظاموں کے بھرم توڑ کر رکھ دیے ہیں جن کے تانے بانے خود انسان ہزاروں برس سے اپنے اردگرد بنتا آ رہا ہے، اور جن کے سہارے انسانی معاشرۃ کو امن و سکون کی منزل سے ہمکنار کرنے کا کوئی بھی خواب تعبیر کا دامن نہیں تھام سکا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ بے راہ روی کے تپتے ہوئے ریگستان میں بھٹکنے والی

انسانی سوسائٹی کی راہنمائی اس سرچشمہ ہدایت کی طرف کی جائے جو سب سے زیادہ محفوظ، شفاف، شفابخش اور خوش ذائقہ ہے۔ اور بلاشبہ وہ جناب رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے جس کی پیروی کے بغیر نسل انسانی امن وسکون کی حقیقی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سراپا مجموعہ صفاتِ حمیدہ ہے۔ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اربابِ بصیرت اور اہل فکر و دانش سے خراج عقیدت وصول نہ کر چکا ہو۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو جس نے دوست و دشمن سب کو اس بارگاہ خیر و حسن میں سرنیاز خم کرنے پر مجبور کر دیا، آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ ہیں جسے اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ کہہ کر

قران کریم نے "خلق عظیم" سے تعبیر کیا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کَانَ خُلُقُہُ الْقُرآن کہہ کر اسے قرآن پاک کی عملی تعبیر و تفسیر قرار دیا ہے۔

جناب رسالت مآب ﷺ ایک حدیث میں خود اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاق کہ مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ "مجھے اچھے کام مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے"۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اچھے کاموں یعنی مکارم اخلاق کو جن بلندیوں سے ہمکنار کیا ان کی مثال پیش کرنے سے تاریخ آج تک قاصر ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو بھی اچھی عادات اور بہتر معاملات کی تلقین فرمائی ہے۔ اور اخلاق کریمانہ انہی دو امور سے عبارت ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے مجھے تم سب میں سب سے زیادہ اچھا وہ شخص لگتا ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں اور سب سے برا میرے نزدیک وہ ہے جو برے اخلاق کا حامل ہے۔

ایک اور حدیث کے مطابق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صاحب ایمان، شخص اچھے اخلاق کی بدولت ان لوگوں جیسا مقام حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفل پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے کے عادی ہیں۔

ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا کہ زیادہ کامل ایمان ان لوگوں کا ہے جو اچھے اخلاق والے ہیں۔

ایک صحابیؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! انسان کو سب سے بہتر چیز کون سی عطا ہوئی ہے؟ فرمایا، اچھے اخلاق۔

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی اکرم ﷺ نے آخری ملاقات میں جو وصیت کی اس میں فرمایا کہ تم لوگوں کے ساتھ اپنے اخلاق بہتر بناؤ۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسالت مآب ﷺ اپنے بارے میں یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! تو نے جس طرح میری جسمانی بناوٹ کو بہتر بنایا ہے اس طرح میری عادات و اخلاق کو بھی بہتر کر دے۔

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے جھوٹ ترک کر دیا اس کا ٹھکانہ جنت کے آغاز میں ہوگا، جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا ترک کیا اس کا ٹھکانہ جنت کے درمیان ہوگا، اور جس نے اپنی ساری عادات و اخلاق کو بہتر بنالیا اسے جنت کے سب سے اوپر والے حصہ میں جگہ ملے گی۔

اخلاق و عادات کے حوالہ سے جناب رسول اللہ ﷺ نے صرف اپنی زندگی اور عمل کا نمونہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اپنی تعلیمات و ہدایات میں اچھے اور برے اخلاق کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی ہے۔ آپ ﷺ نے اخلاق حسنہ کا ایک ایسا معیار مقرر کر دیا ہے جو ڈیڑھ ہزار سال کے لگ بھگ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس باب میں حرف آخر ہے۔ آپ ﷺ نے اچھے اخلاق کی تفصیل بیان فرمائی ہے، اچھی عادات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ہر ایک کے فوائد سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے، اور پھر خود ان پر عمل کر کے اس کا نمونہ پیش کیا

ہے۔ اسی طرح جناب نبی کریم ﷺ نے برے اخلاق اور بد عادات کا تذکرہ فرمایا ہے، ان کے نتائج سے لوگوں کو خبردار کیا ہے، اور خود اس سے بچ کر بری عادات سے گریز کی عملی تربیت دی ہے۔

یہ انسانی معاشرہ پر درسگاہِ نبوی ﷺ کا سب سے بڑا احسان ہے کہ اسے اخلاق کریمانہ کی تعلیم اور اس پر عملدرآمد کا پورا پیکیج ایک ہی جگہ حسین توازن کے ساتھ مل رہا ہے۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ ان کی تربیت یافتہ جماعت (صحابہ کرامؓ) کی اجتماعی زندگی بھی کھلی کتاب کی صورت میں لوگوں کے سامنے ہے جو اجتماعی اخلاق و آداب اور عادات واطوار میں قیامت تک انسانی معاشرہ کی راہنمائی کرتی رہے گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

تجارت اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

تجارت وہ ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی معاشرے کا نظام نہیں چل سکتا، اللہ تعالیٰ نے تجارت کو انسانوں کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق زراعت، تجارت، ملازمت، اور مال غنیمت کمائی کے وہ حلال اور جائز طریقے ہیں جن کے ذریعے انسان اپنی ضروریات زندگی مہیا کر سکتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے تجارت کو کمائی کے بہترین ذرائع میں ارشاد فرمایا ہے، بہت سی روایات ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے تجارت کی فضیلت و اہمیت ذکر فرمائی ہے، درجات بیان فرمائے ہیں اور تجارت کے متعلق احکامات ارشاد فرمائے ہیں۔ احادیث میں کتاب البیوع کے عنوان سے مستقل کتابیں ہیں اور تجارت و کاروبار کے حوالے سے جناب رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات واضح ہیں۔

جناب نبی کریم ﷺ نے خود بھی نبوت سے پہلے تجارت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور اس پر بہت سی روایات ہیں کہ آپ ﷺ لین دین کیسے کرتے تھے اور کاروباری معاملات کیسے طے فرماتے تھے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضور ﷺ کی شادی کا سبب بھی تجارت ہی تھا۔ حضرت خدیجہؓ قریش کی ایک باعزت تاجر خاتون تھیں اور ان کا تجارتی قافلہ شام کے علاقے میں جایا کرتا تھا۔ وہ خود تو تجارت کے لیے نہیں جاتی تھیں لیکن ان کے نمائندے اور کارندے جاتے تھے۔ تجارت کے سارے عمل کا انحصار صرف نمائندوں پر ہو تو معاملہ اتنا قابل بھروسہ نہیں رہتا اس لیے حضرت خدیجہؓ کو تلاش ہوتی تھی کہ کوئی دیانت دار اور قابل اعتماد آدمی ان کی تجارت کو

سنبھالے۔ جناب نبی کریم ﷺ کے بارے میں مکہ مکرمہ میں یہ مشہور تھا کہ آپ امین ہیں، صادق ہیں، سچے ہیں، دیانت دار ہیں، با اخلاق اور قابل اعتماد ہیں۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جو کچھ انہوں نے حضور ﷺ کے متعلق سن رکھا ہے یہ کہاں تک ٹھیک ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیجا اور پیشکش کی کہ آپ ایک سال میرے تجارتی قافلے کی سربراہی کریں۔ اس پر حضور ﷺ حضرت خدیجہؓ کا تجارتی قافلہ لے کر شام گئے اور پھر واپس آئے، یہ تجارتی سفر حضرت خدیجہؓ کے حضور ﷺ پر اعتماد کا باعث بنا اور پھر حضور ﷺ کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کے رشتے کا سبب بھی بنا، یوں آنحضرت ﷺ کی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ یہ شادی اتنی بابرکت ثابت ہوئی کہ حضور ﷺ کی بعثت اور نبوت کے اعلان کے بعد حضرت خدیجہؓ کا سارا مال حضور ﷺ پر ہی خرچ ہوا۔

سچے اور دیانت دار تاجر کا رتبہ

جناب رسول اللہ ﷺ نے تجارت کے حوالے سے مختلف مسائل بیان فرمائے اور آداب بھی۔ اس بارے میں آپ ﷺ کی ایک جامع حدیث روایت ہوئی ہے اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ کہ سچا اور دیانت دار تاجر (جنت میں) نبیوں، صدیقین، شہداء اور صالح لوگوں کے ساتھ ہو گا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اس ارشاد میں حضور ﷺ نے دونوں باتوں کا احاطہ کیا ہے۔ پہلی یہ کہ گفتگو میں سچا ہو، دوسرا یہ کہ مال کے معاملے میں دیانت دار ہو۔ یعنی بات طے کرتے وقت جھوٹ نہ بولتا ہو اور فروخت کے وقت مال میں گڑبڑ نہ کرتا ہو۔ یہی دو باتیں تجارت کی بنیاد ہیں کہ بات سچی ہونی چاہیے اور مال خالص ہونا چاہیے، لیکن بطور تاجران دونوں باتوں پر عمل آسان کام نہیں ہے۔ ایک تاجر کے لیے اس رتبے کا حصول ناممکن تو نہیں ہے لیکن مشکل ضرور ہے۔ گفتگو میں سچائی کے متعلق جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ آدمی جو قسم اٹھا کر مال بیچتا ہے اس کا مال تو بک جاتا ہے لیکن اس میں برکت نہیں رہتی، یعنی ایسا آدمی جو قسمیں اٹھا کر اپنے مال کے متعلق لوگوں کو یقین دلاتا ہے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی ہیں جن پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ ایک المنان وہ آدمی جو کسی کے ساتھ احسان کر کے جتلائے یعنی کسی کی مشکل میں کام آیا اور اس کے ساتھ نیکی کی لیکن بعد میں کسی موقع پر جتلا بھی دیا کہ میں نے فلاں وقت تمہارے ساتھ یہ نیکی کی تھی۔ قرآن کریم میں ہے کہ جتلانے کے ساتھ نیکی برباد ہو جاتی ہے۔ فرمایا ایسا شخص جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ دوسرے آدمی کے متعلق فرمایا مد من الخمر شراب پر دوام کرنے والا، یعنی شراب کا عادی شخص جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ تیسرے آدمی کے متعلق فرمایا اَلْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچنے والا۔ یعنی ایسا شخص بھی جنگ کی خوشبو نہیں سونگھ پائے گا جو جھوٹی قسم کے ذریعے اپنے گاہکوں کو اعتماد دلا کر خراب مال بیچتا ہو۔

تجارت کے اصول و ضوابط

جناب رسول اللہ ﷺ نے تجارت کی ہر ایسی قسم کی مذمت فرمائی ہے جس میں دھوکہ اور فریب ہو، جس میں جھوٹ اور بد دیانتی ہو، یا جس میں عام لوگوں کو پریشانی اور نقصان ہو۔ حضور ﷺ نے ایسی صو[illegible]توں کو عتا[illegible] تعبیر کیا اور انہیں ممنوع قرار دیا۔

دھوکے سے خراب مال بیچنا

ایک روایت میں آتا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ بازار میں تشریف لے جا رہے تھے دیکھا کہ ایک صاحب غلہ بیچ رہے تھے، گندم یا جَو کا ڈھیر تھا۔ حضور ﷺ گزرتے ہوئے اس کے پاس رکے اور معائنے کی غرض سے غلے کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ وہ غلہ اوپر سے خشک تھا لیکن اندر سے گیلا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ بیچنے والے نے کہا یا رسول اللہ بارش ہو گئی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا بارش غلے کے اندر ہو گئی تھی؟ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا جس نے ہمیں تجارت میں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ خراب مال چھپا کر صحیح مال کے ساتھ بیچنا بھی دھوکے کی ایک قسم

ہے۔ تو جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تاجر جنت میں نبیوں کا ساتھی ہو گا لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ گفتگو میں سچا ہو اور مال میں دیانت دار ہو۔

جھوٹی بولی دینا

ایک روایت میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا لَا تَنَاجَشُوْا کہ نجش مت کرو۔ نجش یہ ہے کہ خریدنے کے ارادے کے بغیر صرف مال کی قیمت بڑھانے کے لیے بولی دینا۔ مثلاً کسی چیز کی نیلامی ہو رہی ہے جس کے لیے لوگ اپنی اپنی بولی دے رہے ہیں، ان میں سے ایک آدمی خریدنا تو نہیں چاہتا لیکن صرف بھاؤ میں گڑبڑ کرنے کے لیے بولی دے رہا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے حرام اور جھوٹ قرار دیا۔

تجارتی مال پر اجارہ داری

جناب رسول اللہ ﷺ نے تلقی سے منع فرمایا۔ اس زمانے کے عرف میں جو تجارت کے اندر خرابی کی باتیں ہوتی تھیں حضور ﷺ نے ان کی نشاندہی کی۔ تلقی کیا ہے؟ اس دور میں بھی تجارت کی منڈیاں لگتی تھیں جس میں باہر سے قافلے آتے تھے اور سامان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ آج کا زمانہ تو ترقی یافتہ ہے، سڑکیں ہیں، ریل گاڑیاں اور جہاز ہیں جن کی وجہ سے سامان کی آمد و رفت اور خرید و فروخت بہت جلد ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں منڈیاں تو ایسے ہی لگتی تھیں لیکن آمد و رفت کا سلسلہ بہت سست رفتار ہوتا تھا، مہینوں بعد دور دراز سے قافلے آتے تھے جن سے مقامی خریدار سامان خرید لیتے تھے، اس کے بعد پھر اگلے قافلے کا انتظار ہوتا تھا۔ اسی طرح مقامی لوگ بھی تجارتی قافلے لے کر دوسرے علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ سال میں چند قافلے آتے تھے جن پر سارے سال کے گزر اوقات کا دارومدار ہوتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ جب بیرونی قافلے آتے تو مقامی علاقے کے بڑے تاجر قافلے کے پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں جا کر انہیں روک لیتے تھے اور ان سے سارا سامان خرید کر انہیں رخصت کر دیتے تھے۔ یعنی انہیں شہر میں داخل ہونے ہی نہیں دیتے تھے اور چند میل کے فاصلے پر جا کر قافلے والوں سے سارا سامان خرید لیتے تھے اور انہیں واپس بھیج دیتے

تھے۔ اب یہ سارا سامان چند بڑے تاجروں کے پاس ہوتا تھا جسے وہ اپنی مرضی کے وقت پر اور اپنی مرضی کی قیمت پر بیچتے تھے۔ اس زمانے میں یہ صورت مقامی لوگوں کے لیے سخت نقصان دہ ہوتی تھی۔ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم اَنْ تَلَقَّی الرُّکْبَانَ جناب رسول اللہ ﷺ نے تاجروں کو اس طرح منڈی میں پہنچنے سے پہلے قافلوں سے سامان خریدنے سے منع فرما دیا۔ یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ مال کو منڈی میں آنے دو، منڈی میں مقابلے پر جو ریٹ لگے گا اس کے مطابق لوگ اسے خریدیں گے۔ ایک آدمی یا چند آدمیوں کا سارے سامان پر اجارہ داری بنالینا اور پھر اسے اپنی مرضی کے بھاؤ پر بیچنا عام خریداروں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس لیے کہ جب منڈی میں مال آتا ہے تو زیادہ خریدار ہوتے ہیں اور مال کا بھاؤ کھلے ماحول میں طے ہوتا ہے۔

جمعہ کے اوقات میں تجارت

جناب رسول اکرم ﷺ ایک دفعہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک کسی نے باہر سے آکر آواز لگائی کہ تجارت کا قافلہ آگیا ہے۔ اب ہر ایک کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر دیر ہوگئی تو قافلے کا سارا سامان شام تک بک جائے گا اور میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا، پھر اگلے قافلے کا انتظار کرنا پڑے گا جو کہ ایک صبر آزما کام ہوگا۔ لوگوں کو یہ خدشہ تھا کہ یہ قافلہ اگر نکل گیا تو اگلا قافلہ دو چار مہینے کے بعد آئے گا اور یوں انہیں مقامی لوگوں سے مال خریدنا پڑے گا جو مہنگا دیں گے، یا معلوم نہیں مال کی مطلوبہ مقدار بھی ان سے ملتی ہے یا نہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنا مفاد دیکھتا ہے۔ چنانچہ ایک ایک کر کے لوگ اٹھنا شروع ہوگئے، روایت میں آتا ہے کہ مجمع میں گیارہ آدمی رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کے بارے میں تنبیہ فرمائی وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِانْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (سورۃ الجمعۃ: 11) اور جب لوگ تجارت یا تماشہ دیکھتے ہیں تو اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، کہہ دو جو اللہ کے پاس ہے وہ تماشے اور تجارت سے کہیں بہتر ہے اور اللہ بہتر روزی دینے والا ہے۔ فرمایا، پہلے اطمینان سے نماز پڑھو اور پھر نماز کے بعد تجارت کرو۔ ویسے بھی جمعے کی اذان سے

لے کر نماز کے اختتام تک تجارت کے لیے ممنوع وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورۃ الجمعۃ: ۹) اے ایمان والو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو ذکر الٰہی (خطبہ و نماز) کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، تمہارے لیے یہی بات بہتر ہے اگر تم سمجھو۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ ذہن میں آ گیا کہ حضرت امام مالکؒ کے ایک شاگرد تھے امام یحییٰ بن یحییٰ اندلسیؒ جن کی روایت سے موطا امام مالک ہمارے ہاں پڑھائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت امام مالکؒ پڑھا رہے تھے اور سینکڑوں شاگرد سامنے بیٹھے ہوئے تھے، ان میں یحییٰ بن یحییٰ بھی تھے جو اندلس سے پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کسی نے آواز لگا دی کہ مدینہ میں ہاتھی آ گیا ہے۔ ہاتھی عرب کا جانور نہیں ہے اور انجانی چیز دیکھنے کا ہر آدمی کو شوق ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا، شاگرد وہاں سے کھسکنا شروع ہو گئے کہ جا کر دیکھتے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے، امام صاحبؒ تو یہیں ہوتے ہیں پھر پڑھ لیں گے لیکن ہاتھی پتہ نہیں شام تک رہتا ہے یا نہیں۔ تھوڑی دیر میں سارا مجمع غائب تھا اور صرف یحییٰ بن یحییٰ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت امام مالکؒ نے پوچھا کہ یہ کیا ہوا؟ انہیں بتایا گیا کہ سب لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے ہیں۔ یحییٰ سے پوچھا کہ بھئی تم کیوں نہیں گئے؟ انہوں نے کہا استاد محترم! میں اندلس سے ہاتھی دیکھنے نہیں آیا آپ سے حدیث پڑھنے کے لیے آیا ہوں۔ میں اتنی دور سے سفر کر کے آپ سے علم حاصل کرنے آیا ہوں جنہیں ہاتھی دیکھنا ہے جا کر دیکھیں۔ امام مالکؒ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں ہو گی لیکن اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن یحییٰ کو یہ اعزاز بخشا کہ آج ہمارے ہاں جو موطا امام مالک پڑھی جاتی ہے وہ اسی شاگرد کی روایت کی ہوئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے صلہ تھا۔

ذخیرہ اندوزی

اسی طرح ذخیرہ اندوزی سے جناب نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ اس زمانے میں بھی یہ ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے کہ بڑے تاجر بہت زیادہ مال خرید کر ذخیرہ کر لیتے ہیں جس کی

وجہ سے منڈی میں مال کی کمی واقع ہوتی ہے اور اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ پھر حسب موقع یہ تاجر اس ذخیرہ کیے ہوئے مال کو مہنگے داموں بیچتے ہیں۔ فقہاء نے اس کی درجہ بندی کی ہے کہ اگر کسی چیز کے ذخیرہ کرنے سے مارکیٹ میں عام لوگوں کو نقصان ہوتا ہو کہ لوگوں کو مال ہی میسر نہیں آتا یا عام بھاؤ سے زیادہ قیمت میں خریدنا پڑتا ہے تو ایسا ذخیرہ کرنا حرام ہے۔ مثلاً کسی تاجر نے ضرورت کی کوئی چیز خرید کر ذخیرہ کر لی جس کی وجہ سے منڈی سے وہ چیز عدم دستیاب ہو گئی تو ایسا کرنا تاجر کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر تاجر کے بہت زیادہ مال خرید کر ذخیرہ کرنے سے منڈی میں مال کی سپلائی میں فرق نہیں پڑا اور لوگوں کو دوسرے ذرائع سے وہ چیز میسر ہے، لیکن تاجر کی نیت یہ ہے کہ جب مال کی قیمت بڑھے گی تو میں اپنا مال منڈی میں لاؤں گا تو ایسا کرنا کراہت کے درجے میں ہو گا۔ اگر تاجر کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے منڈی میں مال کی سپلائی بند ہو جاتی ہے یا مال مہنگا ہو جاتا ہے تو پھر یہ حرام اور کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے۔

سودی کاروبار

تجارت کے حوالے سے ایک بہت اہم مسئلہ سود کا ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں ذکر ہے۔ تجارت کہتے ہیں ایک جنس سے دوسری جنس کے تبادلے کو۔ یعنی ایک چیز میرے پاس ہے اور دوسری چیز آپ کے پاس ہے، ہم اپنی اپنی ضرورت کے مطابق جب ان چیزوں کا آپس میں تبادلہ کریں گے تو اس میں مجھے بھی نفع ہو سکتا ہے اور آپ کو بھی۔ ایک جنس کا دوسری جنس سے تبادلہ تجارت کہلاتا ہے، لیکن ایک جنس کا اسی جنس سے تبادلہ کمی بیشی کی صورت میں سود کہلاتا ہے۔ جاہلیت کے دور میں دونوں باتیں چلتی تھیں۔ تجارت بھی ہوتی تھی کہ گندم کا کھجوروں سے تبادلہ، سونے کا چاندی سے تبادلہ، غلے کا کپڑے سے تبادلہ وغیرہ۔ اس طرح سود بھی چلتا تھا کہ روپے کا روپے سے تبادلہ اور اس میں کمی بیشی وغیرہ۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا اور سختی کے ساتھ اس سے منع فرما دیا۔ قرآن کریم نے جب سود کو حرام قرار دیا تو مشرکین نے اس پر اعتراض کیا قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (سورۃ البقرۃ: ۲۷۵) انہوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو سود کے جیسی ہی ہے۔ مشرکین مکہ کا کہنا

تھا کہ اِس میں اور اُس میں کیا فرق ہے، یہ بھی تجارت ہے اور وہ بھی تجارت ہے۔ آج بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ سود بھی تجارت ہی ہے۔ اس دور میں بھی یہی بات کہی گئی کہ ایک جنس کے ساتھ دوسری جنس کے تبادلے میں بھی نفع ہے، اور ایک جنس کے ساتھ اسی جنس کے تبادلے میں بھی نفع ہے۔ لیکن قرآن کریم نے صاف بتایا کہ تجارت اور سود متضاد چیزیں ہیں۔ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (سورۃ البقرۃ: ۲۷۵) اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

یعنی قرآن کریم نے اس اعتراض کا ذکر کیا اور پھر وہی بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے جبکہ سود کو حرام قرار دیا ہے۔ آج ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ کسی مجبور کو پیسے دینا اور اس سے اصل رقم سے زائد وصول کرنا قرض کی ایک صورت ہے جس کا تجارت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے جبکہ قرآن کریم نے سود کو تجارت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں جناب نبی کریم ﷺ کے ساتھ پیش آنے والے دو واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ مسلم شریف میں بھی اس کا ذکر ہے اور ابو داؤد میں بھی۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے گھر کے لین دین کے معاملات کے ذمہ دار حضرت بلالؓ تھے یعنی گھر کے لیے سودا سلف لینا، کھجوریں، آٹا، اور دیگر گھریلو ضروریات کی خرید و فروخت وغیرہ۔ حضرت بلالؓ نے ایک دفعہ کھجوریں خریدیں اور حضور ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کیں کہ یا رسول اللہ ﷺ میں آپ کے لیے یہ کھجوریں خرید کر لایا ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا، یہ اتنی اچھی کھجوریں کہاں سے لے آئے ہو؟ حضرت بلالؓ نے بتایا کہ یا رسول اللہ! وہ آپ کے حصے میں جو خمس کی عام قسم کی کھجوریں آئی تھیں میں نے وہ زیادہ کھجوریں بازار میں دے کر ان کے بدلے میں اچھی قسم کی تھوڑی کھجوریں لے لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عین الربوا یہ تو بالکل سود ہے، انہیں واپس کر کے آؤ۔ حضرت بلالؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! پھر اچھی کھجوریں لانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ رقم کے عوض عام قسم کی کھجوریں بیچو اور پھر اس رقم کے عوض اچھی قسم کی کھجوریں خریدو، یعنی درمیان میں تیسری جنس لے آؤ۔

اسی طرح مسلم شریف کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جناب نبی کریم ﷺ نے خیبر کے علاقہ میں وہاں کی پیداوار سے بیت المال کا حصہ وصول کرنے کے لیے ایک عامل بھیجا جب وہ واپس آیا تو اس کے پاس ساری کھجوریں اچھی قسم کی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو بہت اچھی کھجوریں ہیں۔ پھر پوچھا کیا خیبر میں ساری کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟ عامل نے بتایا کہ یارسول اللہ نہیں ہر قسم کی کھجوریں ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ نے پوچھا پھر تمہارے پاس یہ سب کھجوریں اچھی قسم کی کیسے آگئیں؟ عامل نے بتایا کہ یارسول اللہ مجھے موصول تو ہر قسم کی کھجوریں ہوئی تھیں لیکن میں نے وہ سب کھجوریں دے کر ان کے عوض اچھی قسم کی کھجوریں لے لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو تم نے سود کا کاروبار کیا ہے۔ عامل نے پوچھا یارسول اللہ پھر میں کیا کرتا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پیسوں کے عوض وہ کھجوریں بیچتے اور پھر ان پیسوں کے عوض یہ اچھی کھجوریں خریدتے۔

آنحضرت ﷺ نے جاہلیت کے زمانے میں رائج سود کو، جو کہ بیع کا ایک طریقہ سمجھا جاتا تھا، اسے حرام قرار دے دیا۔ آپ ﷺ نے جوا بھی حرام قرار دیا، لاٹری بھی حرام قرار دی اور سٹہ بھی حرام قرار دے دیا۔ یہ ساری صورتیں وہ ہیں جن میں غیر متوقع اور غیر فطری منافع ملتا ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی نفسیات کی تخریب کا باعث بنتی ہیں۔

اسلام کے اور مروجہ نظامِ تجارت میں فرق

جناب نبی کریم ﷺ نے تجارت میں حصہ لیا ہے، تجارت کی تلقین کی ہے، تجارت کے مسائل واحکام بیان کیے ہیں اور تجارت کے متعلق ایک مستقل نظام دیا ہے جس پر اسلام میں تجارت کی بنیاد ہے۔ اسلام کے نظامِ تجارت میں اور آج کے مروجہ نظامِ تجارت میں ایک بنیادی فرق ہے جو ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ دنیا کا جو مروجہ سسٹم ہے اس میں جائز اور ناجائز کی بنیاد مارکیٹ کی طلب پر ہے کہ جو چیز مارکیٹ کی ضرورت بن جائے وہ جائز ہو جاتی ہے اور جو چیز مارکیٹ کے لیے فضول ہو جائے وہ ناجائز ہو جاتی ہے۔ یعنی جائز اور ناجائز کا مدار مارکیٹ کی ڈیمانڈ پر ہے۔ سوسائٹی شراب مانگتی ہے تو شراب دے دو، سوسائٹی زنا کے

کاروبار کا تقاضا کرتی ہے تو اس کی اجازت دے دو، سوسائٹی جوے کے اڈے مانگتی ہے تو اس کی یہ ڈیمانڈ پوری کر دو، سوسائٹی نشہ آور ادویات مانگتی ہے تو وہ دے دو۔ جیسا کہ آج کل کچھ مغربی ممالک میں یہ صورتحال عام ہے جس کے نتیجے میں ادویات کی شکل میں نشہ آور اشیاء کو لوگوں کے لیے جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ یعنی بنیادی اصول یہ ہے کہ مارکیٹ میں جس چیز کی کھپت ہے اس کی سہولت مہیا کر دو۔ لیکن اسلام میں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کا فیصلہ آسمانی تعلیمات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اسلام تجارت کے انہی اصولوں کو جائز قرار دیتا ہے جو انسانی اخلاقیات، انسان کی حقیقی ضروریات اور انسانی معاشرے کے دنیوی اور اخروی نفع کے لیے بہتر ہیں۔

جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی سے قیامت کے دن مال کے حوالے سے دو چیزوں کے متعلق سوال ہو گا مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَ وَفِیْمَا اَنْفَقَ مال کمایا کہاں سے تھا اور خرچ کہاں پر کیا؟ کمائی کے ذرائع جائز تھے یا ناجائز؟ اور جن چیزوں پر خرچ کیا وہ جائز تھیں یا ناجائز؟ اِن دو باتوں میں سارا معاملہ آ جاتا ہے۔ کمائی کے ذرائع اور مصرف کے مقامات دونوں جائز ہوں گے تب بات بنے گی ورنہ آدمی گناہ گار ٹھہرے گا۔ اسلام نے کمائی کے ذرائع بھی محدود کیے ہیں کہ فلاں ذریعۂ آمدن جائز ہے اور فلاں ناجائز ہے۔ اور خرچ کرنے کے معاملے میں بھی انسان کو کھلی چھٹی نہیں دی گئی کہ جہاں چاہو خرچ کر لو بلکہ مصرف کے مقامات کے متعلق بھی واضح کیا گیا ہے کہ فلاں جگہ خرچ کرنے کے لیے جائز ہے اور فلاں ناجائز۔ اور یہی اسلامی معیشت و تجارت کا بنیادی دائرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان مسائل و احکامات کو سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کا اسوۂ حسنہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَیْكَ اَنَبْنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ (۴)

یوں تو تمام انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والتسلیمات کی مبارک زندگیاں پوری نسل انسانی کے لیے مشعل راہ اور اسوۂ حسنہ ہیں لیکن سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بعد قرآن کریم میں جس شخصیت کی زندگی اور کردار کو بطور خاص اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے وہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔ جن کے بارے میں سورۃ الممتحنہ میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تمہارے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کی زندگیوں میں اسوۂ حسنہ (عمدہ نمونہ) ہے۔ اور اس تلقین کے ساتھ ان کے کردار کے جس پہلو کو اہمیت کے ساتھ اسی سورۃ میں اجاگر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے قوم کے اجتماعی کفر اور اس کفر پر ڈٹ جانے والوں سے واضح طور پر برأت کا اعلان کیا، اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی بھی بندگی و اطاعت کی جاتی تھی ان سب معبودوں اور خود ساختہ خداؤں سے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے قوم پر واضح کر دیا کہ جب تک تم ان جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک اللہ کی بندگی اور اطاعت پر نہیں آجاتے تمہارے ساتھ ہمارا دوستی کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ہم تمہارے اس نظام کو کسی حالت میں قبول کر سکتے ہیں۔ یہ سورۃ الممتحنہ کی اس آیت

کریمہ کا مختصر مفہوم ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دے کر مسلمانوں کو ان کی پیروی کی تلقین کی گئی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے وہ جلیل القدر پیغمبر ہیں جن کی یاد مختلف حوالوں سے ہر سال پوری دنیا میں منائی جاتی ہے اور چونکہ ملت اسلامیہ حضرت ابراہیمؑ کے مشن اور دین کی اصل وارث ہے اس لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خاندان کی روایات کو زندہ رکھنے اور ان کی پیروی کرنے کا اہتمام بھی سب سے زیادہ وہی کرتی ہے۔

بیت اللہ شریف کا طواف کیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے تعمیر کر کے وادی مکہ کو ایک بار پھر آباد کیا،

صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی جاتی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ محترمہ حضرت سیدہ ہاجرہؓ نے اپنے شیر خوار پیاسے بچے حضرت اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں چکر کاٹے تھے۔

مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نفل ادا کر کے حضرت ابراہیمؑ کی یاد تازہ کی جاتی ہے، اور سب سے بڑھ کر منیٰ میں لاکھوں جانور ذبح کر کے حضرت ابراہیمؑ کی عظیم قربانی کو یاد کیا جاتا ہے جہاں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر جواں سال بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی گردن پر چھری رکھ کر اپنی طرف سے انہیں قربان کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس عظیم جذبۂ قربانی کو قبولیت سے نوازتے ہوئے چھری سے کاٹنے کی صلاحیت سلب کر لی، حضرت اسماعیلؑ زندہ رہے اور قربانی بھی ہو گئی۔ بلکہ ایسی قربانی ہوئی کہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کی یاد کو آنے والی نسلوں میں باقی رکھنے کا وعدہ فرما لیا اور اسی وعدۂ خداوندی کے مطابق نہ صرف ہر سال لاکھوں جانور منیٰ میں ذبح ہوتے ہیں بلکہ دنیا میں کروڑوں جانور حضرت اسماعیلؑ اور ان کے عظیم المرتبت باپ کی اس عظیم قربانی کی یاد میں قربان ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ ہم نے انہیں مختلف آزمائشوں میں ڈالا اور جب وہ ہر امتحان و آزمائش میں کامیاب ہوئے تو ہم نے انہیں نسل انسانی کا امام بنا دیا۔ اور یہ ان کی امامت ہی کا اظہار ہے کہ ہر آسمانی مذہب کے پیروکار خود کو حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہودی خود کو ابراہیمی کہتے ہیں اور عیسائیوں کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین عرب بھی ابراہیمی کہلاتے تھے اور انہوں نے خانہ کعبہ میں پرستش کے لیے جو بت نصب کر رکھے تھے ان میں حضرت ابراہیمؑ کا مجسمہ بھی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان سب دعووں کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ مشرک اور بت پرست نہیں تھے بلکہ مؤحد اور بت شکن تھے، اس لیے ان کے دین کے وارث مسلمان ہیں جو بت پرستی سے نفرت کرتے ہیں اور توحید خداوندی کے علمبردار ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم قربانیوں اور آزمائشوں میں ایک بڑی آزمائش یہ تھی جس کا ذکر قرآن کریم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ وہ ظلم، کفر اور شرک پر قائم سوسائٹی اور قوم کے خلاف تن تنہا کھڑے ہوگئے اور توحید خداوندی کا پرچم بلند کیا۔ ان کی دعوت صرف سمجھانے تک محدود نہیں رہی بلکہ قوم کے اجتماعی کفر کو کھلے بندوں چیلنج کیا، انہیں لاجواب کیا اور خود اپنی قوم کے بت خانے میں گھس کر بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ قرآن کریم حضرت ابراہیمؑ کی اس بت شکنی کے بعد قوم کی پنچائیت کے سامنے ان کی پیشی کا واقعہ بیان کرتا ہے

قَالُوٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ (62) قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (63) فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ (64) ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (65) قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (66) اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (67)

کہ جب قوم کے سرداروں نے سوال کیا کہ اے ابراہیمؑ! ہمارے خداؤں کا یہ حشر تم نے کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کے درمیان یہ بڑا بت جو سلامت کھڑا ہے اس نے

کیا ہو گا، اور تم خود ان سے ہی کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ ان کا یہ حشر کس نے کیا ہے؟ پنچائیت والوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور سب کے سب سر جھکائے یہ کہہ رہے تھے کہ اے ابراہیمؑ! تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے یہ خدا کلام نہیں کیا کرتے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اسی لمحے کا انتظار تھا، فوراً گویا ہوئے کہ افسوس ہے تم اور تمہارے ان معبودوں پر، کیا اب بھی تم سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو؟

اور وہ مکالمہ اس سے بھی بڑھ کر تھا جو شاہی دربار میں نمرود کے ساتھ ہوا جو وقت کا بادشاہ تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ خدائی اختیارات اس کے پاس ہیں اور وہ موت و حیات کا مالک ہے۔ مگر جب حضرت ابراہیمؑ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ کہ میرا رب سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے، تیرے پاس اگر خدائی اختیارات ہیں تو سورج کو مغرب سے طلوع کر کے دکھاؤ۔ قرآن کریم کا کہنا ہے کہ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ نمرود اس سوال پر مبہوت و ششدر ہو کر رہ گیا اور اس کے تمام تر جاہ و جلال، لاؤ لشکر اور کروفر کے باوجود فتح و کامرانی حضرت ابراہیمؑ کے حصے میں آئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور مشاہدات و محسوسات کی زبان کا دور تھا اور ہر بات کو اسی معیار پر سمجھا اور پرکھا جاتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی قوم کے عام لوگوں کے سامنے، پنچائیت کے سامنے اور پھر بادشاہِ وقت کے سامنے اسی زبان میں گفتگو کی۔ انہوں نے بتوں کے ٹوٹ جانے اور کلام نہ کرنے کو، ستاروں اور چاند کے ڈوب جانے کو، اور سورج کے مشرق سے طلوع ہونے کے کھلے مشاہدات کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اپنے استدلال کی بنیاد بنایا اور قوم کے ہر طبقے کو خود اس کی زبان میں لاجواب کر دیا۔ اس دور میں مشاہدات کی زبان کے غلبے کا یہ عالم تھا کہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق خود حضرت ابراہیمؑ نے بھی اللہ تعالیٰ سے درخواست کر دی کہ وہ انہیں اس بات کا مشاہدہ کرائیں کہ مردوں کو زندہ کیسے کیا جاتا ہے۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ

لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (260)

اور یاد کر جب ابراہیمؑ نے کہا اے میرے پروردگار! مجھ کو دکھا کہ تو مردے کو کس طرح زندہ کرے گا، فرمایا کہ کیا تم یقین نہیں لاتے؟ کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے، فرمایا تو چار جانور اڑنے والے پکڑ پھر انہیں اپنے ساتھ مانوس کرلے پھر (انہیں ذبح کرنے کے بعد) ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دے پھر ان کو بلا تیرے پاس جلدی سے آئیں گے، اور جان لے کہ بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

اس لیے جہاں حج، طواف، سعی، قربانی اور مقامِ ابراہیم کے نوافل حضرت ابراہیمؑ کی یاد کو تازہ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نسبت کا اظہار ہیں وہاں کفر و ظلم کے اجتماعی نظام کے خلاف صف آراء ہونا اور منطق و استدلال کے مروجہ اسلوب کو اختیار کرکے کفر و باطل کو لاجواب کرنا بھی سنت ابراہیمیؑ ہے۔ اور قرآن کریم نے اسی سنت ابراہیمیؑ کو سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اور زیادہ نمایاں کرکے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی سمجھنے عمل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

خطبہ حجۃ الوداع کے چند اہم نکات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

مغرب میں انسانی تاریخ کے تاریک دور اور روشن دور کی تقسیم کا واضح تصور موجود ہے اور ان میں حدِ فاصل انقلابِ فرانس کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ انقلاب جو یورپ میں جمہوری دور کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا، اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں رونما ہوا اور اس نے مغربی دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ چنانچہ مغرب میں انقلاب فرانس سے پہلے کے دور کو تاریک دور اور قرون مظلمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جبکہ انقلاب فرانس کے بعد کا دور روشنی، علم، انسانی حقوق اور تمدن کا دور کہلاتا ہے۔ اسی طرح اہل اسلام میں بھی دور جاہلیت اور دور اسلام کی تقسیم کا ایک واضح تصور موجود ہے۔ چنانچہ جناب نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل کے کسی بھی واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے دور جاہلیت کا واقعہ کہا جاتا ہے اور آنحضرت ﷺ کی بعثت سے بعد کا دور علم، روشنی اور حقوق کا دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ مغرب نے جس طرح دنیا کی اقوام و طبقات اور انسانی سوسائٹی کے افراد کے باہمی تعلقات کی حدود کار اور ان کے باہمی حقوق اقوام متحدہ کے چارٹر اور دیگر بین الاقوامی دستاویزات میں بیان کی ہیں اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انقلاب فرانس سے کم و بیش بارہ سو سال قبل ان حقوق و معاملات کی نشاندہی فرما دی تھی جو قرآن کریم کی بیسیوں آیات اور جناب نبی اکرم ﷺ کے سینکڑوں ارشادات میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ اور اس کے لیے بطور خاص "خطبہ حجۃ الوداع" کا حوالہ دیا جاتا ہے جو نبی کریم ﷺ کی وفات سے چند ماہ قبل حج کے موقع پر منیٰ اور عرفات کے میدانوں میں صحابہ کرامؓ کے سب سے بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

یہ خطبہ حجۃ الوداع سینکڑوں احادیث نبویہ ﷺ میں بکھرا ہوا موجود ہے۔ اس اجتماع میں شریک صحابہ کرامؓ میں سے جس کو جو جملہ یاد رہا اس نے اپنے ذوق کے مطابق اسے روایت کر دیا۔ بہت سے اصحاب علم نے اس تاریخی خطبے کو مجتمع کرنے کے لیے مختلف اوقات میں کام کیا اور اس کے متعدد مجموعے کتابچوں اور مقالات کی صورت میں ہمارے علمی ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے بڑے بیٹے حافظ محمد عمار خان ناصر (مدیر ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ) نے اب تک میسر مواد کو سامنے رکھ کر اس کا ایک مجموعہ پیش کیا ہے جو اس موقع پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مختلف متون، ان کے حوالہ جات اور آسان اردو ترجمہ پر مشتمل ہے اور الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ سے کتابچہ کی صورت میں شائع ہونے کے علاوہ hajjatulwada.com کے عنوان سے ویب سائیٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات گرامی کا انتخاب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے:

اے لوگو! حج کے مناسک سیکھ لو کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اس سال کے بعد مجھے حج کرنے کا موقع ملے گا یا نہیں۔

اے لوگو! آج کے دن اللہ تعالیٰ نے تم پر خاص عنایت فرمائی ہے اور تمہارے گناہ بخش دیے ہیں، سوائے ان حق تلفیوں کے جو تم نے آپس میں ایک دوسرے کی کر رکھی ہیں۔

اے لوگو! خاموشی کے ساتھ میری بات سنو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس سال کے بعد تم مجھے نہ دیکھ سکو۔

اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ماؤں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہیں۔

خبردار! چار باتوں سے بچتے رہنا۔ (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا (۲) خدا کی حرام کردہ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرنا (۳) زنا نہ کرنا (۴) اور چوری نہ کرنا۔

اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں۔ پس اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت کی نماز ادا کرو، رمضان کے مہینے کے روزے رکھو، پوری خوش دلی کے ساتھ اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو، بیت اللہ کا حج کرو اور اپنے حکمرانوں کی اطاعت کرو۔ ایسا کروگے تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی سرخ کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے اور تم میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ صاحبِ کردار ہے۔

اے لوگو! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قبائل اور اقوام میں صرف باہمی تعارف اور پہچان کے لیے تقسیم کیا ہے۔ جبکہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے سوائے تقویٰ اور کردار کے۔

خبردار! جاہلیت کی ہر رسم اور روایت آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔

جاہلیت کے دور کا ہر خون (بدلہ)، ہر (حرام) مال اور باہمی فخر و مباہات کی ہر بات قیامت تک کے لیے میرے دونوں قدموں کے نیچے دفن کر دی گئی ہے۔

خبردار! جاہلیت کے دور کا ہر سود ختم کیا جاتا ہے، تم صرف اصل مال کے حقدار ہو، نہ ظلم کروگے اور نہ ظلم کیے جاؤ گے۔ چنانچہ میرے چچا عباس بن عبد المطلب کا لوگوں کے ذمے جو سودی قرضہ ہے اس کا سود سارے کا سارا معاف کیا جاتا ہے۔

اے لوگو! تمہارے مال، تمہاری عزتیں، تمہارے خون اور تمہارے چمڑے ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے آج کے دن کی، آج کے مہینے کی اور اس مقدس شہر کی حرمت ہے۔

مسلمان کی حرمت مسلمان کے لیے اسی طرح محترم ہے جیسے آج کے دن کی حرمت ہے۔ ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کی غیبت کرتے ہوئے اس کا گوشت کھانا حرام

ہے، اس کی عزت پامال کرنا حرام ہے، اس کے چہرے پر تھپڑ مارنا حرام ہے، اس کا خون بہانا حرام ہے، ظلم کے ساتھ اس کا مال لینا حرام ہے، اس کو اذیت دینا حرام ہے اور اس کو دھکا تک دینا حرام ہے۔

خبردار! عورتوں کے بارے میں میری وصیت قبول کرو۔ وہ تمہارے پاس امانت ہیں اور تم اس کے علاوہ ان پر کسی قسم کا حق نہیں رکھتے، سوائے اس کے کہ وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں ان کے بستروں میں الگ کردو اور ان کو اتنا مار سکتے ہو کہ چوٹ کا نشان نہ پڑے۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کی راہ نہ ڈھونڈو۔ آگاہ رہو کہ تمہارے بھی تمہاری عورتوں پر حقوق ہیں اور عورتوں کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ کسی شخص کو تمہارا بستر پامال نہ کرنے دیں۔ جسے کہ تم ناپسند کرتے ہو، اور نہ تمہارے ناپسندیدہ افراد کو تمہارے گھروں میں آنے کی اجازت دیں۔ اور ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تم عرف کے مطابق ان کا رزق اور پوشاک انہیں مہیا کرنے میں بہترین طریقہ اختیار کرو۔

اپنے غلام لونڈیوں کا خیال رکھو۔ جو تم کھاتے ہو انہیں بھی کھلاؤ، جو تم خود پہنتے ہو انہیں بھی پہناؤ، اگر ان سے کوئی ایسی غلطی ہو جائے جسے تم معاف نہیں کرنا چاہتے تو اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو بیچ دو لیکن انہیں عذاب نہ دو۔

میں تمہیں پڑوسی کے بارے میں تاکید کرتا ہوں۔ راوی ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ یہ بات جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی بار دہرائی کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ آپ ﷺ شاید پڑوسی کو وراثت میں بھی حصہ دار بنادیں گے۔

کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے۔ پوچھا گیا کہ کیا کھانا بھی نہیں، فرمایا کہ وہ تو ہمارا بہترین مال ہے۔

کیا میں تمہیں خبر دوں کہ مومن کون ہے؟ مومن وہ شخص ہے جسے لوگ اپنے مالوں اور جانوں پر امین سمجھیں، مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، مجاہد

وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے، اور مہاجر وہ ہے جو گناہوں اور غلطیوں کو ترک کر دے۔

کوئی بھی زیادتی کرنے والا اس کا خمیازہ خود بھگتے گا۔ نہ باپ کی زیادتی کا بدلہ بیٹے سے لیا جائے اور نہ بیٹے کی زیادتی کا بدلہ اس کے باپ سے لیا جائے اور نہ کسی بھائی کو اس کے بھائی کے جرم میں پکڑا جائے۔

میری بات سنو! زندگی پا جاؤ گے۔ خبردار! ظلم نہ کرنا، خبردار! ظلم نہ کرنا، خبردار! ظلم نہ کرنا۔ اور کسی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لینا حلال نہیں ہے۔

بچے کا نسب اس سے ثابت ہو گا جس کے نکاح میں عورت ہو گی جبکہ زنا کرنے والے کے لیے پتھر ہیں۔ جس نے اپنی نسبت اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف کی اور جس غلام نے اپنی نسبت اپنے مالک کے علاوہ کسی طرف کی اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت، اللہ تعالیٰ اس سے کوئی بدلہ یا تاوان قبول نہیں کرے گا۔

اگر کسی کان کٹے ہوئے سیاہ فام غلام کو بھی تم پر امیر مقرر کیا جائے تو اس کی اطاعت کرو جب تک کہ وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق چلاتا رہے۔

کبیرہ گناہ یہ ہیں: شرک کرنا، کسی مومن کو ناحق قتل کرنا، میدان جنگ سے فرار اختیار کرنا، یتیم کا مال کھانا، سود کھانا، پاک دامن عورت پر تہمت لگانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، بیت اللہ کی بے حرمتی کرنا۔

شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ تمہارے علاقوں میں اس کی کبھی عبادت کی جائے گی۔ ہاں ان اعمال میں اس کی ضرور اطاعت کی جائے گی جنہیں تم حقیر سمجھتے ہو اور وہ اسی پر خوش رہے گا۔

اے لوگو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک تم انہیں تھامے رکھو گے کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی کتاب (۲) اس کے پیغمبر ﷺ کی سنت۔

تم پر لازم ہے کہ قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامو۔ اور تم ایسے لوگوں کے پاس پہنچو گے جو میری باتیں سننے کے خواہش مند ہوں گے۔ بس جس نے میری کوئی بات اچھی طرح سمجھ کر یاد کی ہے وہ اس کو بیان کر دے اور جس نے میری طرف ایسی بات کی نسبت کی جو میں نے نہیں کہی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

ذرائع ابلاغ اور سنت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

ربیع الاول کے دوران مختلف مقامات پر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ گیارہ ربیع الاول کو ۱۱ بجے پی سی لاہور میں وفاقی وزارت مذہبی امور کے زیر اہتمام سالانہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس کی پہلی نشست میں شرکت کی۔ بعد نماز ظہر جامعہ فتحیہ اچھرہ میں "نبی اکرم ﷺ کی خاندانی زندگی" کے عنوان پر گفتگو ہوئی۔ بعد نماز مغرب مسجد تقویٰ پنجاب کالونی غازی روڈ لاہور میں "ذرائع ابلاغ کا استعمال سنت نبوی ﷺ کی روشنی میں" کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ جبکہ بارہ ربیع الاول کو اڈیالہ روڈ راولپنڈی کے ایک شادی ہال میں تحریک اشاعت اسلام کے زیر اہتمام پروفیسر حافظ عبد الواحد سجاد کی صدارت میں منعقدہ سیرت کانفرنس میں "معاشرتی انصاف اور اسوہ نبوی ﷺ" کے حوالہ سے معروضات پیش کیں۔ ذرائع ابلاغ کے عنوان پر کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دین حق کے اولین داعی تھے اور آپ ﷺ کی سب سے بڑی ذمہ داری نسل انسانی کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور توحید کی طرف دعوت دینا اور قیامت کے حساب کتاب اور عذاب سے ڈرانا تھا۔ دعوت کے لیے ابلاغ ضروری ہوتا ہے بلکہ ابلاغ پہلے ہوتا ہے پھر اس کے بعد دعوت کا مرحلہ آتا ہے۔ کیونکہ جس چیز کی دعوت دینا مقصود ہو پہلے اس کا تعارف ضروری ہوتا ہے ورنہ دعوت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کے ذریعہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، قدرت اور اختیارات و افعال کی طرف توجہ دلائی اور اللہ رب العزت کی عظمت لوگوں کے دلوں میں

بٹھائی۔ قرآن کریم دعوت دین کا سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ چلا آرہا ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کو جہاں موقع ملتا، کوئی محفل میسر آتی اور کسی بھی حوالہ سے لوگوں کا کوئی اجتماع ہوتا آپ ﷺ ان کو قرآن کریم سناتے اور دین کی دعوت دیتے۔ حتیٰ کہ تجارتی میلوں میں جو تجارت کے ساتھ ساتھ عرب ثقافت کے اظہار کے اجتماعات بھی ہوتے تھے، لوگ شعر و شاعری کرتے، خطابت کے جوہر دکھاتے، ناچ گانا ہوتا، جاہلی عصبیت کی بنیاد پر خاندانی مفاخر کا ذکر کیا جاتا، ایک دوسرے پر برتری جتاتے، نیزہ بازی و تلوار زنی کے مقابلے ہوتے اور طرح طرح کے تماشے ہوتے۔ حضور ﷺ ایسے مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے، وہاں تشریف لے جاکر قرآن کریم سناتے، وعظ و نصیحت کرتے اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے۔ آپ ﷺ ان لوگوں کی سرگرمیوں کا حصہ نہیں بنتے تھے مگر اپنی دعوت ان تک ضرور پہنچاتے تھے۔

اس حوالہ سے ایک بات پر توجہ دینے کی بطور خاص ضرورت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی دعوت و تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم کی قراءت و تلاوت ہوتا تھا اور چونکہ اولین مخاطب عرب لوگ تھے اس لیے ترجمہ و تشریح کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ قرآن کریم کا پیغام فطری جبکہ اسلوب فصاحت و بلاغت کے کمال کا تھا، اس لیے مخالفین کو اس کا اثر کم کرنے کے لیے طعن و تشنیع اور کردار کشی کے سوا کوئی بات نہیں سوجھتی تھی۔ کبھی مجنون کہتے، کبھی شاعر، کبھی ساحر اور کبھی کاہن کے طعنے کا سہارا لیتے۔ ایک مرحلہ میں قریشی سردار نضر بن حارث کو قرآن کریم کے مقابلہ میں محفلیں بپا کرنے کی سوجھی تو اس نے ناچ گانے، موسیقی اور قصے کہانیوں کو ذریعہ بنایا جس کا ذکر قرآن کریم نے لھو الحدیث کے عنوان سے کیا ہے اور لیضل عن سبیل اللہ کے ارشاد کے ساتھ گمراہی پھیلانے کا اہم سبب قرار دیا ہے۔

قرآن کریم کا خطاب انسان کے دل و دماغ سے ہوتا ہے، وہ سوچ، فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے، اسے اس کے نفع و نقصان سے آگاہ کرتا ہے اور اس کی اگلی زندگی کے حالات

کی خبر دیتا ہے۔ جبکہ ناچ گانا، موسیقی، قصے کہانیاں اور نفسانی خواہشات ابھارنے والی چیزیں انسان کو ضروری معاملات سے بے گانہ کر کے خواہشات اور سفلی جذبات کے دائرے میں لے آتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ غور و فکر کی دعوت سے انسان ہدایت کی طرف جانے لگتا ہے جبکہ نفسانی خواہشات کی طرف توجہ دینے اور ان کا اسیر ہو جانے سے انسان کے قدم گمراہی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ہدایت کا ذریعہ اور ناچ گانے اور موسیقی وغیرہ کو گمراہی کا سبب قرار دیا ہے۔ ہر دور میں ہدایت اور گمراہی کے ان اسباب میں محاذ آرائی رہی ہے اور آج بھی اس کی صورتحال یہی ہے۔

جناب رسول اکرم ﷺ کے دور میں ابلاغ کے مؤثر ترین ذرائع فصاحت و بلاغت، شعر و شاعری اور خطابت تھے۔ آنحضرت ﷺ خود شاعر نہیں تھے جس کا ذکر قرآن کریم نے اس طور پر کیا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰسٓ:69) اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو شعر و شاعری نہیں سکھائی اس لیے کہ یہ ان کے شایان شان نہیں تھی۔ البتہ صحابہ کرامؓ میں بہت سے باکمال شعراء اور خطیب تھے جن سے حضور ﷺ نے دعوتِ دین اور دفاعِ اسلام کا کام لیا۔ حضرت ثابت بن قیسؓ نے خطابت کے محاذ پر اسلام کی نمایاں خدمت کی جبکہ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور دیگر شعراء کرام نے شعر و شاعری میں کمالِ فن کا مظاہرہ کر کے اسلام کی دعوت، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، جناب رسول اللہ کی نعت و مدح، اور مسلمانوں کے دفاع کے شاندار کارنامے سرانجام دیے۔

فصاحت و بلاغت اور گفتگو کا اعلیٰ اسلوب دین کی دعوت کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر بلا کر نبوت کا منصب عطا فرمایا تو انہوں نے اپنی زبان کی لکنت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت میں شریک کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا وہ زبان و بیان کی فصاحت میں مجھ سے فائق ہے اس لیے اسے بھی میرا ساتھی بنایا جائے۔

فصاحت و بلاغت سے مراد وقت کا اعلیٰ ترین اسلوبِ گفتگو ہوتا ہے جو وقت اور جگہ کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے اور کبھی ایک معیار پر قائم نہیں رہتا۔ انسانی ذہنوں کی بھی ایک سطح نہیں ہوتی اور نفسیات بھی مختلف دائروں اور سطحوں میں منقسم رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی، دونوں میں یہ کمال رکھا ہے کہ وہ چونکہ سب انسانوں کے لیے ہیں اور قیامت تک کے لیے ہیں اس لیے گفتگو اور خطاب کے تمام ضروری اسلوب ان کو ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان کے کلام سے ہر درجہ اور سطح کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں اور یہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز ہے۔

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے اعلیٰ ترین اسلوبِ خطابت اور شعر و شاعری کو دین کی دعوت و دفاع کا ذریعہ بنایا اور قرآن کریم کے معجزانہ اندازِ بیان سے تمام مخالفتوں اور رکاوٹوں کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت مبارکہ سے استفادہ کرتے ہوئے آج کے دور کے گفتگو، محاورہ، مکالمہ اور ابلاغ کے بہترین اسلوب کو اختیار کیا جائے اور ہر طبقہ و دائرہ کے انسانوں کی ذہنی سطح و نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان تک قرآن کریم کی دعوت کو پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام، عزیمت و استقامت کے پیکر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

سیدنا ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام وہ ذات گرامی ہیں جنہیں اللہ رب العزت نے سرور کائنات خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساری کائنات میں افضل ترین مقام و مرتبہ عطا فرمایا۔ اور ان کی عظیم قربانیوں اور عزیمت و استقامت کے شاندار مظاہروں کے عوض دنیا بھر کی ایسی امامت بخشی کہ آج دنیا کا کم و بیش ہر الہامی مذہب خود کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ یہودی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کا پیروکار کہتے ہیں، عیسائی اس بات کے اپنے لیے دعوے دار ہیں، مشرکین مکہ کفر و شرک کے باوجود ابراہیمی کہلانے کو سعادت کی بات سمجھتے تھے، حتیٰ کہ بعض بزرگوں کی تحقیق سے ہندوؤں میں بھی برہمن یا برہما مہاراج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہی منسوب ہیں۔ جبکہ اہل اسلام تو اپنے اس دعوے میں بلاشبہ حق بجانب ہیں کہ اصل ابراہیمی وہی ہیں کہ وہ ملت ابراہیم پر ہیں اس لیے حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت و استقامت کے صحیح وارث و حقدار وہی ہیں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو دنیا بھر کی امامت کا مقدس منصب ان کی عزیمت و استقامت اور آزمائشوں و امتحانوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرنے کے صلہ میں ملا۔ اور اگر حضرت ابراہیمؑ کی مقدس زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا کہ اس ذات گرامی کی پوری زندگی قدم قدم پر مصائب و آلام سے نمٹتے ہوئے گزری۔

ذرا خیال فرمایئے کہ یہ امتحان کونسا کم تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس عظیم الشان پیغمبر کو، جو پیدائشی مؤحد تھے، ایسے گھرانے اور ماحول میں پیدا فرمایا جہاں کفر و شرک، انسان کی خدائی اور ظلم و جبر کا دور دورہ تھا۔ انسان خدا بنا بیٹھا ہے، اس کے احکام کو خدائی احکام کا درجہ دیا جاتا ہے اور فرشتوں سے خود کو سجدہ کرانے والا انسان پتھر اور لکڑی کے بت تراش کر ان کے سامنے پیشانی رگڑ رہا ہے۔ ایسے ماحول میں حضرت ابراہیمؑ نے آنکھیں کھولیں، دل میں ایمان و توحید کے جذبات سمندر کی لہروں کی طرح کروٹ لے رہے ہیں لیکن باہر کی دنیا میں کفر و شرک اور ظلم و جبر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ جس گھر میں پیدا ہوئے وہ گھر ملک میں بت پرستی کا سب سے بڑا علمبردار ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام نے ماحول کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔ کم عمری کے باوجود کفر و شرک کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو توحید و رسالت کے انوار سے روشن کرنے کے لیے بے تاب دکھائی دیتے ہیں۔ قدم قدم پر باپ کو، رشتہ داروں کو اور اہل وطن کو روکتے اور ٹوکتے ہیں، ان سے شرک کے فوائد اور مضرات پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے عوض انہیں ڈانٹ بھی پڑتی ہے اور طعنے بھی سننے پڑتے ہیں مگر وہ کتنا عظیم نوجوان تھا جس نے پورے معاشرے میں ایک ہمنوا کے نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کا پرچم بلند کیا۔

پھر آپ دیکھیں کہ عزیمت و استقامت کے اس سر بفلک پہاڑ نے کلہاڑی کندھے پر اٹھائے قوم کے بت خانے کا رخ کیا اور قوم کے خداؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کلہاڑی بڑے بت کے کندھے پر رکھ دی اور کسی قسم کا فکر و تردد کیے بغیر اطمینان سے قوم کے سامنے آ گئے۔ قوم پوچھتی ہے، انکوائری کرتی ہے، جرح ہوتی ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام کی ذہانت بلکہ عزیمت و استقامت کے سامنے بس نہیں چلتا اور سوائے ندامت و پشیمانی کے قوم کے ہاتھ میں کچھ نہیں آتا۔ قوم بے بس اور لاچار ہو کر اس مرد قلندر کو آگ میں جلانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ آگ جل رہی ہے اور شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، حضرت ابراہیمؑ کو آگ کے سامنے لایا جاتا ہے، خدا کا خلیل مسکراتا ہے، آگ کی طرف دیکھتا ہے اور پھر آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر اور مطمئن ہو کر خود کو آگ بھڑکانے والوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ ابراہیم

علیہ السلام کو آگ کے حوالے کرتے ہیں مگر آگ میں تو آج جلانے کی سکت نہیں رہی اور قوم چشم حیرت سے خدا کے خلیل کو آگ کے گلزار میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔

لیکن یہ تو ابتدائے عشق ہے، انتہا تک پہنچتے پہنچتے کتنے مرحلے درمیان میں آتے ہیں ذرا ان پر نگاہ ڈالتے چلیے۔ خدائی کے غرور میں نمرود اپنے تخت پر بیٹھا ہے اور ابراہیم علیہ السلام سامنے ہیں۔ جھوٹے اقتدار کے نشے میں بدمست نمرود اپنی خدائی منوانے کا خواہش مند ہے لیکن خدا کا خلیل نمرود کے دربار میں حقیقی خدا کی خدائی کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ بحث ہوتی ہے، دلیلیں بیان کی جاتی ہیں، استدلال ہوتا ہے إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (سورة البقرة) میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ نمرود نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں مارتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو سورج مشرق سے مغرب کو لاتا ہے تو مغرب سے لے آ۔ کفر مبہوت ہو جاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام پوری سلطنت میں تنہا اور بے سروسامان ہوتے ہوئے بھی فاتح ہیں۔ ان کے دامن میں اعتماد ہے اور ان کی گفتگو میں خود کو منوانے کی صلاحیت ہے مگر نمرود کی آواز طاقت و قوت، فوج ظفر موج اور خزانوں کے ہوتے ہوئے بھی لرز رہی ہے۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پاتا اور پھر حق اپنی کامیابی کا پرچم نمرود کے دربار میں لہرا کر کامران واپس آتا ہے۔

آگے چلیے اور دیکھیے کہ قوم بھی لاجواب ہوگئی ہے۔ بادشاہ وقت خدائی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود لاچار ہے، اب آخری حربہ باقی رہ گیا ہے اور باپ سامنے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اسے سمجھاتے ہیں اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں مگر پتھروں کی زبان میں جواب ملتا ہے۔ خدا کے خلیل کو کس بات کی پرواہ ہے، آخری سلام کرتے ہیں، بچوں کو ساتھ لیتے ہیں اور وطن سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اور ادھر دور صحرا میں کھڑا شیطان کف افسوس مل رہا ہے کہ یہ آخری حربہ بھی کسی کام نہ آیا۔

ابھی تو بہت سے امتحان باقی ہیں، ابھی تو راستہ میں ایک ظالم بادشاہ کی شیطنت کا غرور توڑنا ہے۔ بادشاہ اپنے اقتدار کے زعم میں خلیلِ خدا کے حرم پاک پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے مگر ادھر تقدیر کھڑی مسکرا رہی ہے اور انجام کار اس بادشاہ کو اس مردِ قلندر کے حرم مقدس میں اپنی لڑکی کا ہدیہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ اب حرم پاک میں ایک نہیں دو ہستیاں ہیں اور بعد میں آنے والی ہستی کی گود میں ایک ننھا سا پھول بھی کھل اٹھا ہے۔

پھر آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، حکم خداوندی ہے کہ جوان بیوی اور معصوم بچے کو کھلے صحرا میں کسی سہارے کے بغیر چھوڑ آؤ۔ کیا فرمانبردار خاندان ہے کہ ماں باپ اور بچہ چل پڑے ہیں اور صحرا میں، جہاں درخت ہے نہ پانی، ماں کے حوصلے کی داد دیجئے کہ جسے پتہ چلتا ہے کہ اسے اور اس کے شیر خوار بچے کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر صحرا میں چھوڑا جا رہا ہے تو وہ مطمئن ہو جاتی ہے۔ اور پھر ماں ہے، بچہ ہے، صحرا ہے اور کھلے آسمان کی نیلی چھت۔

پھر بچہ بڑا ہوتا ہے، نوجوانی کی حد کو پہنچتا ہے اور خیال فرمایئے اور وہ منظر آنکھوں کے سامنے لایئے کہ اکلوتے نوجوان بیٹے کا بوڑھا باپ بڑے راز و نیاز کے ساتھ بیٹے سے سرگوشی کر رہا ہے کہ بیٹے! مجھے حکم ملا ہے کہ تجھے ذبح کر دوں، تمہارا کیا خیال ہے؟ بیٹا کچھ بھی تردد نہیں کرتا، کوئی عذر پیش نہیں کرتا اور کہتا ہے:

"ابا جان! جو حکم ملا ہے کر گزریے، مجھے آپ صبر کرنے والا پائیں گے۔"

اور یہ صرف بات چیت کا قصہ نہیں، باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا ہے، آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے، ہاتھ میں چھری ہے اور اکلوتے بیٹے کا بوڑھا باپ بیٹے کی گردن پر چھری رکھ کر اسے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ذبح کر رہا ہے۔ مگر چھری بھی تو اسی ذات کے اختیار میں ہے جس کے اختیار میں آگ تھی۔ چھری سے ذبح کرنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے اور آسمان سے آواز آتی ہے:

"ابراہیم! بس اب امتحان پورا ہو چکا ہے۔ آپ کی قربانی کی یاد قیامت تک ہر سال زندہ کی جاتی رہے گی۔ آپ کے حقیقی پیروکار ہر سال آپ کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے موٹے تازے جانوروں کا خون اللہ کی رضا کے لیے بہاتے رہیں گے۔"

یہ ہے ایک ہلکا سا منظر اس عظیم و جلیل پیغمبر کی عزیمت و استقامت کا جسے اللہ تعالیٰ نے اولوالعزم رسولوں میں شمار کیا ہے اور "خلیل اللہ" جیسا پیارا خطاب دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی تو نہیں فرمایا کہ

"اور جب ابراہیمؑ کو اس نے بہت سی باتوں میں آزمایا تو وہ بھی پورا اترا۔ پھر رب نے کہا میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔"

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

سیرت نبوی ﷺ اور ڈکٹیٹر شپ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْد

وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے یہ انکشاف کر کے ملک میں ایک نئی بحث کا آغاز کر دیا ہے کہ وہ جب قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کے ترمیمی بل کی حمایت کے لیے پارلیمنٹ کے ارکان سے رابطے کر رہے تھے تو ایک سینیٹر نے ان سے یہاں تک کہہ دیا کہ "حضور ﷺ تو خود ڈکٹیٹر تھے" (نعوذ باللہ)۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پنجاب اسمبلی کے اپوزیشن لیڈر جناب سعید احمد منہاس نے وزیر اعظم سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس سینیٹر کا نام بتائیں عوام خود اسے سنگسار کر دیں گے۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل چودھری احمد مختار نے وزیر اعظم کے اس انکشاف کو ایک نئے انتشار کا پیش خیمہ قرار دیا ہے، اور پاکستان عوامی اتحاد کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے چیف الیکشن کمشنر سے کہا ہے کہ وزیر اعظم کے خلاف ایک گستاخ رسول ﷺ کا جرم چھپانے اور اس کا نام ظاہر نہ کرنے کے جرم میں کاروائی کریں۔

یہ مسئلہ فی الواقع سنگین ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سب سے اعلیٰ قانون ساز ادارے کے ایک رکن کی زبان پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بارے میں یہ گمراہ کن اور گستاخانہ الفاظ آخر کس طرح آ گئے؟ اس معاملہ کے ضروری پہلوؤں کا جائزہ لینا اور انصاف و دینی حمیت کے تقاضے کو پورا کرنا متعلقہ شخصیات اور اداروں کی ذمہ داری ہے۔ مگر ہم اس مسئلے کے بارے میں ایک اور پہلو سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مذکورہ سینیٹر کا یہ جملہ اس کا اپنا نہیں بلکہ ایک درآمدی فقرہ ہے جو مغرب کے نظریہ ساز کارخانوں میں ڈھلا ہے۔ اور یہ نو آبادیاتی نظام

تعلیم و تربیت میں نشوونما پانے والے ہر ایسے شخص کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں چھپا ہوا ہے جسے اسلامی تعلیمات، خلافت راشدہ اور اسلامی تاریخ کے بارے میں ضروری معلومات میسر نہیں ہیں۔ اس سینیٹر نے یہ جسارت کی ہے کہ وہ اس جملے کو ذہن کے فریزر سے نکال کر نوک زبان پر لے آیا ہے ورنہ بہت سے ذہنوں کے "اسٹور روم" اسلام اور جناب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اس قسم کے متعدد ریمارکس اپنے دامن کی تاریکیوں میں سمیٹے ہوئے ہیں اور معاشرتی دباؤ کے باعث ان کے اظہار کی ہمت نہیں پا رہے۔ ہمارے نزدیک اس کا بنیادی سبب دو امر ہیں۔

ایک ہمارے قومی نظام تعلیم کی بے مقصدیت ہے کہ اس نے قیام پاکستان کے بعد نصف صدی کے طویل عرصہ میں ابھی تک یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ مغرب کے سیاسی فلسفے اور نظام کے مقابلہ میں اسلام کو ایک سیاسی نظام اور فلسفے کے طور پر نئی نسل کے سامنے پیش کرے۔ اور ان شکوک و شبہات کا علمی طور پر ازالہ کرے جو مغرب کے تعلیمی نظام اور میڈیا سسٹم نے اسلام اور جناب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ہر طرف پھیلا رکھے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کا یکطرفہ پراپیگنڈا اور نظریاتی یلغار بہت سے ذہنوں میں اپنی کمین گاہیں قائم کرتی جا رہی ہے، جبکہ ہم ان ذہنوں سے یہ کانٹے نکال باہر پھینکنے کی بجائے انہیں وہیں دبا دینے اور دبائے رکھنے میں عافیت محسوس کر رہے ہیں۔

دوسرا یہ کہ ہمارے علماء کرام، خطباء اور واعظین میں ایسے افراد کا تناسب بہت ہی کم ہے جو اپنے مواعظ و خطبات میں اسلام کے اجتماعی پہلوؤں اور جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت مبارکہ کے اجتماعی دائروں کو گفتگو کا موضوع بناتے ہیں، جس کی وجہ سے قوم کے مختلف طبقات کا ایک بہت بڑا حصہ اسلام کے اجتماعی نظام اور سنت نبوی ﷺ کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، اور قانونی پہلوؤں سے ناواقف ہے۔ لیکن یہی ناواقفیت اور جہالت کبھی کبھی اپنی آخری حدود بھی تجاوز کر کے گستاخی اور جسارت کی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہے تو ہم جذبات اور اشتعال کی ایک اور لہر کا وزن ڈال کر اسے دبائے رکھنے کا عمل دہرا دیتے ہیں۔

اب مغرب کے اسی الزام کو دیکھ لیجئے جو آنحضرت ﷺ کے بارے میں صدیوں سے دہرایا جا رہا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ مطلق العنان اور ڈکٹیٹر تھے۔ حالانکہ یہ سراسر جہالت اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے بے خبری ہے اور باخبر ہونے کی صورت میں محض عناد اور ہٹ دھرمی ہے۔ کیونکہ سیرت نبوی ﷺ شاہد ہے اور تاریخ کے ریکارڈ پر یہ گواہی موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو دونوں طرف کا لحاظ رکھنے کے پابند تھے۔ انہیں ایک طرف یہ حکم تھا کہ وہ مسلمانوں کو اجتماعی معاملات میں شریک مشورہ کریں وشاورھم فی الامر (سورۃالشوریٰ) اور دوسری طرف وہ اس امر کے پابند تھے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام میں اپنی مرضی سے کوئی ردوبدل نہیں کر سکتے اور وحی الٰہی کو ہر صورت میں پورا کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں ذمہ داریوں کو اس شان سے نبھایا کہ تاریخ انسانی میں اس کی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ سیرت طیبہ اس قسم کے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے، صرف دو تین واقعات اس موقع پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

غزوۂ احد کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ اس مسئلہ پر مشورہ کر رہے تھے کہ جنگ مدینہ منورہ میں رہ کر اور محصور ہو کر لڑنی چاہیے یا باہر نکل کر کھلے میدان میں کفار کا سامنا کیا جائے۔ خود آپ ﷺ کی رائے محصور ہو کر لڑنے کی تھی مگر مشورہ کی مجلس میں عمومی رجحان باہر جا کر لڑنے کا تھا اس لیے نبی اکرم ﷺ نے خود اپنی رائے کے خلاف باہر جا کر لڑنے کا فیصلہ کیا اور یہ لڑائی احد پہاڑ کے دامن میں کھلے میدان میں ہوئی۔

ایک مرتبہ جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک گھریلو معاملہ کے باعث قسم کھالی کہ وہ شہد استعمال نہیں کریں گے۔ یہ ایک ذاتی نوعیت کا معاملہ تھا لیکن وحی الٰہی نے حضور ﷺ کو اپنا حلف توڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے قسم توڑی اور اس کا کفارہ ادا کیا اور پھر حسب سابق شہد استعمال کرتے رہے۔

اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی جو آپ ﷺ نے مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک صحابیؓ کی ننگی کمر پر مار دی، کمر ننگی تھی اور کھجور کی ٹہنی گھڑی ہوئی نہیں تھی اس لیے ذرا سخت لگی اور کمر پر خراش بھی آگئی۔ اس صحابیؓ نے بھری مجلس میں بدلے کا مطالبہ کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر ٹہنی اس صحابیؓ کے ہاتھ میں دے دی اور اپنی کمر آگے کر کے فرمایا کہ "اپنا بدلہ لے لو"۔

اس قسم کے واقعات سیرت نبوی ﷺ میں قدم قدم پر ملتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے نہ صرف قانون کی پابندی اور قانون کے سامنے برابری کی اعلیٰ ترین عملی مثال پیش کی بلکہ لوگوں کے معاملات میں ان سے مشورہ کرنے اور ان کے مشورہ کو اہمیت اور ترجیح دینے کی روایت قائم کی اور یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب خود مغرب قانون، رائے، مشورہ اور حق نامی کسی چیز سے متعارف نہیں تھا۔ اس لیے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر مغرب کے اس "بھونڈے الزام" کو جہالت یا ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم محض مغرب کو کوسنے اور کوستے رہنے کی بجائے اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس کریں اور نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ اور دینی راہ نمائی کے شعبوں کے ارباب حل و عقد ہماری نئی نسل کو اسلام کے اجتماعی نظام اور سیرت طیبہ ﷺ سے متعارف کرانے کا اہتمام کریں۔ ورنہ مغربی فلسفہ اور کلچر کے لیے "بوسٹر" کا کام کرنے والے حضرات اس قسم کے بے ہودہ ریمارکس نشر کرتے رہیں گے اور ہم "ذہنی ارتداد" کی اس رو کے سامنے جذبات اور اشتعال کے عارضی بند ہر دفعہ نہیں باندھ سکیں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

سیرت نبوی ﷺ کے حوالہ سے ضروری گزارش

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

ربیع الاول کے مہینہ میں عام طور پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے حوالہ سے ان کے حالات اور تعلیمات کے تذکرہ کے لیے باقی سال کی بہ نسبت زیادہ اہتمام کے ساتھ مجالس و محافل کا انعقاد ہوتا ہے۔ جس کا کسی شرعی ضابطہ اور اصول سے کوئی تعلق تو نہیں ہے لیکن چونکہ دوسری اقوام میں اپنے پیشواؤں کے دن منانے اور مخصوص ایام میں انہیں اہتمام کے ساتھ یاد کرنے کا سلسلہ موجود ہے، اس لیے ان کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی یہ رسم عام ہوتی جا رہی ہے اور کچھ حلقوں کی بے جا ضد کے باعث رسم و روایت سے بڑھ کر اس حوالہ سے بہت سے امور ثواب و اجر کے نام پر بدعات کی شکل بھی اختیار کر گئے ہیں جن سے علماء حق نے نہ صرف ہمیشہ خود گریز کیا ہے بلکہ عام مسلمانوں کو بھی وہ اس کے نقصانات و مضمرات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ ان مجالس و محافل کا سلسلہ ربیع الاول کے بعد ربیع الثانی میں بھی جاری رہتا ہے اور عنوانات کے فرق کے ساتھ کم و بیش سبھی مکاتب فکر کسی نہ کسی عنوان کے ساتھ اس عمل میں شریک ہیں۔

جہاں تک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مبارکہ، سیرت طیبہ، سنن مقدسہ اور شمائل و خصائل کا تعلق ہے اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا تذکرہ نہ صرف ثواب و اجر اور برکت و رحمت کا باعث ہے بلکہ یہ ہماری دینی ضروریات میں سے ہے، کیونکہ ہم "اسوہ حسنہ" کے طور پر زندگی کے ہر لمحہ اور ہر کام میں جناب نبی اکرم ﷺ کو یاد کرنے اور ان کا طریقہ و سنت معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہیں، لیکن اگر سرور کائنات ﷺ کی یاد اور ان کے حالات و فضائل کا تذکرہ مروجہ خود ساختہ طریقوں کی

بجائے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے سادہ اور بے تکلفانہ طریقوں کے مطابق ہو تو یقیناً کہیں زیادہ برکات و فیوض اور اجر و ثواب کا باعث ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی اگر آج کے حالات کے تناظر میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات و تعلیمات اور احوال مبارکہ کو زیادہ اہمیت کے ساتھ اجاگر کیا جائے جن کا ہمارے موجودہ احوال و ظروف اور مشکلات و مسائل کے ساتھ تعلق ہے تو اس سے برکات و فیوض اور اجر و ثواب کے ساتھ ساتھ راہنمائی کے نئے افق بھی سامنے آئیں گے۔

مغرب کی فکری اور تہذیبی یلغار کے اس دور میں سب سے زیادہ ضرورت اسی بات کی ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حضرات صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفاء راشدینؓ کے حالات مبارکہ کا موجودہ عالمی صورت حال کے تناظر میں از سر نو مطالعہ کر کے آج کے ملی، قومی اور عالمی مسائل کا ان کی روشنی میں حل پیش کیا جائے اور سیرت طیبہ اور تعامل صحابہؓ کے دائرہ میں امت کی نئی نسل کی فکری راہنمائی کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔ مثال کے طور پر آج کی عالمی تہذیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جدید تہذیب ہے، اپ ٹو ڈیٹ کلچر ہے اور ترقی یافتہ ثقافت ہے، لیکن جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اس میں نئی بات کون سی ہے تو اس کا کہیں سے کوئی جواب سامنے نہیں آتا۔ کیونکہ اس تہذیب کی بنیاد سوسائٹی کی مادر پدر آزاد خواہشات پر ہے اور اس کے ثمرات و نتائج کے طور پر (۱) رقص و سرور (۲) عریانی و فحاشی (۳) زنا و لواطت (۴) اباحیت مطلقہ (۵) کہانت و نجوم (۶) سود (۷) جوا (۸) نسلی برتری (۹) مذہب بیزاری (۱۰) خدا فراموشی (۱۱) جبر و استحصال (۱۲) اور معاشی بالادستی کے جو عملی مظاہر و مناظر انسانی سوسائٹی میں عام ہو رہے ہیں، ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو جناب رسول اللہ کی تشریف آوری سے قبل موجود نہیں تھی اور جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں "كُلُّ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ تَحْتَ قَدَمِيَّ" کے باطل شکن اعلان کے ساتھ ختم کرنے کا اعلان نہیں کر دیا تھا۔ مگر یہ آج کی مغربی تہذیب و ثقافت کے دجل و فریب کی انتہا ہے کہ اسی پرانی جاہلی ثقافت اور آؤٹ آف ڈیٹ کلچر کو ایک بار پھر جھاڑ پھونک کر اور از سر نو میک اپ کر کے اسے جدید تہذیب اور اپ ٹو

ڈیٹ کلچر کے عنوان کے ساتھ نئے سرے سے نمائش میں لگا دیا گیا ہے۔ اس قسم کے بیسیوں موضوعات ہیں جن کے حوالہ سے مغربی فکر و فلسفہ کی فریب کاریوں کو جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور سنت مبارکہ کی روشنی میں بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے اور ہمارے نزدیک آج کے دور میں سیرت نبویؐ کے ضمن میں یہ ہمارے علمی و دینی حلقوں اور مراکز کی سب سے اہم ذمہ داری ہے۔

ہم سیرت نبوی ﷺ کے تذکرہ و بیان سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس طرف خصوصی توجہ دیں اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کی روشنی میں آج کی نئی نسل کی فکری اور تہذیبی راہنمائی کے تقاضوں کو باقی تمام معاملات پر ترجیح دیں۔

وما علینا الا البلاغ۔

صلح حدیبیہ کے چند اہم پہلو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

دینی مدارس میں ششماہی امتحانات کے بعد عام طور پر دورۂ حدیث کے اسباق کے دوران "وبہ قال حدثنا" کا ورد جاری رہتا ہے لیکن جب تاریخی، سیاسی یا سماجی حوالہ سے کوئی اہم روایت سامنے آجائے تو کچھ کہے بغیر آگے گزر جانا میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔ گزشتہ روز بخاری شریف کی کتاب الشروط میں صلح حدیبیہ کے بارے میں عبارت پڑھنے والے طالب علم نے ایک طویل روایت پڑھی تو میں نے وہاں بریک لگا دی اور دو دن کا سبق اسی روایت کی وضاحت میں گزر گیا۔ حدیبیہ کے مذاکرات اور معاہدہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی فراست، سفارت کاری اور ڈپلومیسی کا شاہکار ہے جس کا صحیح معنوں میں حظ اس کا ذوق رکھنے والے حضرات ہی اٹھا سکتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے تین چار پہلوؤں کا قارئین کے سامنے بھی تذکرہ ہو جائے۔

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ رفقاء کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا اور یہ بات سامنے آگئی کہ قریش مکہ جناب رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو عمرہ ادا کرنے کی اجازت نہیں دیں گے تو آنحضرت ﷺ نے وہاں رک کر اس صورتحال کا جائزہ لیا اور اپنی آئندہ حکمت عملی طے فرمائی۔ قبیلہ بنو خزاعہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے اچھے تعلقات تھے وہ مسلمانوں کے بارے میں دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، ان کے سردار بدیل بن ورقاء خزاعی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حضور ﷺ سے ملاقات کے لیے آئے تو آپ ﷺ نے ان کے ذریعے قریش مکہ کو ایک پیغام بھجوایا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مسلسل جنگوں نے قریش کو کمزور کر دیا ہے اور اب وہ لڑنے کی پوزیشن میں نہیں

ہیں، البتہ میں ان کے لیے یہ پیشکش کر رہا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ ایک معینہ مدت کے لیے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیں اور دیگر عرب قبائل اور عوام کے ساتھ میرے روابط میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اگر میں قریش کے علاوہ باقی قبائل اور لوگوں کو ساتھ ملانے اور غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو قریش کے لیے دونوں راستے کھلے ہوں گے کہ یا باقی لوگوں کے ساتھ وہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں یا اگر چاہیں تو اپنی موجودہ پوزیشن پر قائم رہیں۔ لیکن اگر وہ اس پیشکش کو قبول نہیں کرتے تو میری ان کے ساتھ آخری دم تک جنگ جاری رہے گی اور اللہ تعالیٰ دین حق کے غلبہ کے بارے میں اپنا فیصلہ نافذ کر کے رہیں گے۔

صلح حدیبیہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کو پورے جزیرۃ العرب میں اپنی دعوت کا دائرہ وسیع کرنے کا جو موقع ملا اور جس میں عرب قبائل عمومی طور پر اسلام کی طرف مائل ہونا شروع ہو گئے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے فوائد میں ایک اہم فائدہ تھا جو مسلمانوں کو حاصل ہوا۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ دراصل جناب رسول اللہ ﷺ کے مقاصد میں سے تھا کیونکہ قریش کو جنگ نہ کرنے کے معاہدہ کی پیشکش آنحضرت ﷺ نے خود کی تھی اور آپ ﷺ چاہتے تھے کہ قریش کے ساتھ حالت جنگ کچھ دیر کے لیے ختم ہو جائے تاکہ باقی دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچانے کی جدوجہد کو کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھایا جا سکے۔ یہیں سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس صلح میں بظاہر کمزور شرائط کو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے اضطراب اور بے چینی کے باوجود اس لیے قبول کیا گیا تھا کہ آپ ﷺ کے سامنے اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے پر امن ماحول اور فضا قائم کرنا ضروری تھا جس کے لیے یہ صورتحال برداشت کی گئی۔

قریش کے ساتھ اس بات چیت کے لیے نبی کریم ﷺ کے پاس گفت و شنید کے لیے پانچ الگ الگ نمائندے بدیل بن ورقاء، عروۃ بن مسعود ثقفی، رجل من کنانہ، مکرز بن حفص اور سہیل بن عمروؓ باری باری آئے تھے۔ بخاری شریف کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا طرز عمل مختلف تھا۔ مثلاً ایک نمائندے کا تذکرہ "رجل من کنانہ" کے طور پر کیا گیا ہے جن کا نام مذکور نہیں ہے مگر بتایا گیا ہے کہ یہ

صاحب قریش کی طرف سے باقاعدہ نمائندہ بن کر اور ان سے اجازت لے کر مذاکرات کے لیے آئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور ساتھیوں سے کہا کہ یہ فلاں شخص ہے اور ان کے ہاں ہدی کے جانوروں کا بڑا احترام پایا جاتا ہے اس لیے اس کے آنے سے پہلے ہدی کے جانوروں کو صف میں کھڑا کر دو۔ ان صاحب نے آکر جب ہدی کے جانوروں کی قطاریں دیکھیں اور صحابہ کرامؓ کو تلبیہ پڑھتے ہوئے سنا تو وہیں رک گئے اور کہا کہ یہ حضرات تو عمرہ کے لیے آئے ہیں اور قربانی کے جانور بھی ساتھ لائے ہیں اس لیے میں انہیں بیت اللہ تک پہنچنے سے روکنے کے حق میں نہیں ہوں، یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے اور اپنے لوگوں کو جا کر بتایا کہ میں ان لوگوں کو عمرہ کی ادائیگی سے روکنے کی کاروائی میں شریک نہیں ہوں۔ اس کے بعد مذاکرات کے لیے مکرز بن حفص نامی صاحب آئے تو آپ ﷺ نے بتایا کہ یہ فاجر آدمی ہے، مطلب یہ کہ اس کے ساتھ گفتگو بڑی احتیاط سے کرنا ہوگی۔ لیکن وہ ابھی گفتگو کا آغاز نہیں کر پائے تھے کہ ادھر سے قریش کے آخری نمائندے سہیل بن عمروؓ آگئے جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب معاملہ آسان ہو جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان کے ذریعے معاہدہ طے پا گیا۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل سے ایک بات تو یہ سمجھ آتی ہے کہ ہر شخص اور ہر قوم سے ایک ہی انداز و لہجے میں بات کرنا مناسب نہیں ہوتا بلکہ مختلف قوموں اور طبقات کے مزاج، نفسیات اور اخلاق وعادات کا لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دشمن افراد کو ہمیشہ مغلوب کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ ان کے رجحانات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنے حق میں رائے دینے پر آمادہ کرنا زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

اس معاہدہ میں یہ طے پایا تھا کہ قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ منورہ جائے گا تو اسے واپس قریش کے حوالہ کرنا ہوگا لیکن کوئی مسلمان اگر مکہ مکرمہ واپس آگیا تو قریش اسے واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ اس شرط پر صحابہ کرامؓ کی صفوں میں بے چینی اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کا اضطراب سب کو دکھائی دے رہا تھا مگر آنحضرت ﷺ نے نہ معاہدہ میں صرف یہ شرط قبول کی بلکہ اس کی پوری پاسداری کی۔ چنانچہ بعد میں جب

حضرت ابو بصیرؓ مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آئے تو قریش نے ان کی واپسی کے لیے دو نمائندے مدینہ منورہ بھیجے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو بصیرؓ کو معاہدہ کے مطابق ان کے ساتھ واپس مکہ مکرمہ بھجوا دیا مگر حضرت ابو بصیرؓ ان میں سے ایک کو راستہ میں قتل کر کے مدینہ منورہ واپس جا پہنچے اور حضور ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے تو اپنی ذمہ داری پوری کر دی تھی مگر میں واپس آ گیا ہوں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے ان کے بارے میں یہ جملہ فرمایا کہ "ویل امہ مسعر حرب" کہ اس کی ماں کی ہلاکت ہو یہ لڑائی کی آگ بھڑکائے گا، یعنی قریش کے ساتھ جنگ کا وہ ماحول جو ہم نے بڑی مشکل سے ختم کرایا ہے وہ اسے واپس لے آئے گا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اس کو کوئی سنبھالنے والا ہے؟ یہ سن کر حضرت ابو بصیرؓ چپکے سے واپس چلے گئے اور مکہ مکرمہ لوٹنے کی بجائے سمندر کے کنارے ڈیرہ لگا لیا جو اس طرح کے نئے مسلمانوں کے لیے ایک حفاظتی کیمپ بن گیا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب دشمن کے ساتھ کوئی معاہدہ طے پا جائے تو وہ معاہدہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اپنے کسی ساتھی کو اس میں رخنہ اندازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی ایسی کسی کاروائی کی ذمہ داری قبول کی جا سکتی ہے۔

جب اس معاہدہ کی رو سے جناب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مسلمان ہو کر آنے والوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے واپس مکہ مکرمہ جانے کی بجائے حضرت ابو بصیرؓ کے کیمپ میں جمع ہونا شروع کر دیا اور ان کا اچھا خاصا گروپ بن گیا۔ وہ سیف البحر کے مقام پر آرام سے نہیں بیٹھے بلکہ قریش کے تجارتی قافلوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس سے قریش تنگ آ گئے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کو باقاعدہ پیغام بھجوا کر اس شرط سے دستبرداری اختیار کر لی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت ابو بصیرؓ کے کیمپ کے لوگوں کو مدینہ منورہ بلا لیا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ نبی کریم ﷺ نے معاہدہ کی مکمل پاسداری کی، اس کی خلاف ورزی کرنے والوں میں سے کسی کی ذمہ داری قبول نہیں کی اور نہ ہی انہیں مدینہ منورہ میں رہنے دیا۔ لیکن قریش کی طرف سے مذکورہ شرط سے دستبرداری کے بعد آپ ﷺ نے نہ صرف ابو بصیرؓ

کے کیمپ کے لوگوں کو کیمپ ختم کر کے مدینہ منورہ آجانے کی ہدایت کی بلکہ ان میں سے کسی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی اور انہیں آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں رہنے کی اجازت دے دی جسے آج کی اصطلاح میں "عام معافی کا اعلان" کہا جاتا ہے۔

صلح حدیبیہ کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے یہ چند پہلو اس لیے عرض کیے ہیں کہ ہمارے آج کے حالات اور مسائل میں ان سے راہنمائی حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت ہے اور موجودہ قومی صورتحال میں تمام فریقوں کو اس کا ضرور جائزہ لینا چاہیے۔

وما علینا الا البلاغ

صلح وجنگ اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

جناب رسول اکرم ﷺ نے جنگیں بھی کی ہیں اور صلحات بھی۔ حضور ﷺ نے جو جنگیں کیں ان کا مقصد کیا تھا اور وہ کن اصولوں کے تحت لڑی گئیں؟ اور آپ ﷺ نے جو صلحیں کیں وہ کن مصلحتوں کے تحت کی گئیں اور حضور ﷺ نے ان صلحوں کو کیسے نبھایا؟ اس حوالے سے مختصراً چند باتیں عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ جناب نبی کریم ﷺ نے جو دین پیش کیا وہ صرف اخلاقیات اور عبادات پر ہی مشتمل نہیں بلکہ یہ دین پوری زندگی کا انسانی ضابطہ حیات ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ یہ دین زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب محمد رسول اللہ ﷺ تک جتنے پیغمبر بھی آئے سب کی تعلیمات زندگی کے تمام شعبوں پر محیط رہی ہیں۔

یہ انسانوں کی بدقسمتی ہے کہ آج انسانی سوسائٹی کے ایک بڑے حصے نے آسمانی تعلیمات سے قطع تعلقی اختیار کرلی ہے، اس کے اسباب کچھ بھی ہوں ان پر بحث ہوسکتی ہے لیکن یہ بدبختی کی بات ہے کہ انسانی سوسائٹی کا ایک بڑا حصہ اپنی عملی زندگی میں آسمانی تعلیمات سے لاتعلق ہوکر رہ گیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوعِ بحث اور پریشان کن مسئلہ ہے کہ آج انسانوں کا ایک بڑا طبقہ عقیدتاً یہ بات کہتا ہے کہ آسمانی تعلیمات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور دنیا بھر میں مسلمان جن اعتراضات اور تنقیدات کا نشانہ ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ مسلمان آسمانی تعلیمات سے لاتعلقی کے موقف کو قبول نہیں کررہا۔ یہ بات کہ عملی زندگیوں میں آسمانی تعلیمات سے لاتعلقی اختیار کرلی جائے مسلمان کسی طور قبول نہیں کرپارہے جبکہ دنیا کی باقی قومیں مجموعی طور پر یہ بات ہضم کرچکی ہیں۔ یہ مسئلہ الگ

ہے کہ ان قوموں کے پاس آسمانی تعلیمات اصلی ہیں یا تحریف شدہ ہیں، ان کے پاس آسمانی تعلیمات جس شکل میں بھی ہیں وہ انہیں تاریخی یادگار، تبرک اور آثار قدیمہ سے زیادہ کوئی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آج کی موجودہ بائبل دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہے لیکن اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر کوئی بھی عمل کے لیے تیار نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ قرآن کریم سے پہلے کی آسمانی کتابوں کے صرف تراجم ہی موجود ہیں اور وہ بھی تحریف شدہ ہیں لیکن بنیادی تعلیمات ان میں آج بھی موجود ہیں۔ میں بائبل بھی پڑھتا ہوں اور تالمود بھی جو کہ اردو میں آگئی ہے۔ تحریفات کے باوجود آج بھی بائبل اور تالمود کی بنیادی تعلیمات قرآن کی بنیادی تعلیمات سے ملتی جلتی ہیں۔ چنانچہ دنیا کی باقی قوموں اور مسلمانوں کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دنیا کی قومیں اپنی آسمانی تعلیمات سے دستبردار ہو گئی ہیں کہ گویا آسمانی تعلیمات ان کے نزدیک اب میوزیم کی چیزیں ہیں۔ جبکہ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم آسمانی تعلیمات سے راہنمائی لیتے ہیں اور اپنی عملی زندگیوں میں قرآن و سنت کے پابند ہیں۔ یہ ایک مستقل تنازعہ اور جھگڑا ہے۔

ایک انسان کی بحیثیت انسان کسی کے ساتھ دوستی ہو گی اور کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی، یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ کسی کو اچھا سمجھتا ہے اور کسی کو برا سمجھتا ہے۔ چونکہ سوسائٹی انسانوں سے بنتی ہے اس لیے یہی نیچر سوسائٹی کی بھی ہے۔ جب مختلف قوموں کے فلسفہ و فکر سامنے آتے ہیں تو ان میں ٹکراؤ بھی پیدا ہوتا ہے، اس طرح اجتماعیات میں جنگوں کے مواقع بھی پیدا ہوتے ہیں اور صلح کے مواقع بھی۔ قوموں کی آپس میں جنگیں بھی ہوتی ہیں اور مصالحتیں بھی، دشمنیاں بھی ہوتی ہیں اور دوستیاں بھی۔ یہ فرد کی فطرت بھی ہے اور سوسائٹی کی فطرت بھی ہے۔ اسلام نے صلح اور جنگ کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے بڑی تفصیل سے اصول و ضوابط دیے ہیں، قرآن کریم میں اور سنت رسول میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں اور اس کا ایک پورا نظام سامنے آتا ہے کہ کس سے جنگ کرنی ہے کب کرنی ہے کیوں کرنی ہے اور کیسے کرنی ہے۔ یہی معاملہ صلح کے حوالے سے بھی ہے۔

اسلام میں جنگ کا تصور

آج کے دور میں عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے دنیا میں پھیلا ہے، طاقت کے زور پر لوگوں سے تسلیم کرایا گیا ہے اور یہ کہ اسلام میں تبلیغ کا ذریعہ جنگ ہے۔ یہ آج کی دنیا کا مسلمانوں پر اعتراض ہے کہ اسلام میں ہتھیار اٹھانا اس لیے ہے تاکہ اس سے لوگوں کو مسلمان کیا جائے۔ یہ اعتراض بالکل خلافِ واقعہ ہے اس لیے کہ امت مسلمہ کے مجاز حکام نے کبھی کسی قوم کو مسلمان کرنے کے لیے طاقت استعمال نہیں کی۔ خلافت راشدہ کا دور ہو یا خلافت بنو امیہ کا، خلافت بنو عباس کا زمانہ ہو یا خلافت بنو عثمان کا، کبھی کسی اسلامی حکومت نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ انفرادی طور پر شاید ایسے کچھ واقعات مل جائیں لیکن بحیثیت امت اور بحیثیت خلافت ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ مجاز اتھارٹیز جو تیرہ سو سال سے چلی آ رہی تھیں جن میں سخت حکومتیں بھی تھیں اور ڈھیلی بھی، خلافت کا نظام مسلمانوں میں جیسا کیسا بھی رہا لیکن ہر دور میں یہ گارنٹی دی گئی کہ کسی قوم پر اسلام قبول کرنے کے لیے جبر نہیں کیا جائے گا۔ اور اس پر مثالیں موجود ہیں کہ کچھ لوگوں نے اپنے طور پر جبر کرنا چاہا لیکن خلفاء نے اور مجاز حکام نے انہیں روک دیا کہ کبھی ایسا نہیں ہو گا۔

بنو تغلب عیسائیوں کا عرب قبیلہ تھا اور اسلامی حکومت کے زیر اثر تھا، حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا۔ بنو امیہ کے دور میں وہاں کے مقامی مسلمان حاکم نے قبیلے والوں سے کہا کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ میں تمہارے خلاف جنگ کروں گا۔ اس پر قبیلے والوں نے خلیفہ وقت سے شکایت کی تو ان کی شکایت پر اس مقامی حاکم کو معزول کر دیا گیا کہ تمہارا اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں ہے، یہ ان کی مرضی پر ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ یہ بات تو قطعی طور پر خلاف واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور پر کسی کو مسلمان کیا ہو۔ البتہ یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ مسلمانوں کو تلوار کے زور پر عیسائی بنایا گیا ہے۔ جب اسپین پر عیسائیوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو انہوں نے اجتماعی طور پر مسلمانوں کو جبراً

عیسائی بنایا لیکن مسلمانوں نے کسی قوم کو جبراً مسلمان کیا ہو اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، میں محاز حکام کی بات کر رہا ہوں انفرادی اور شخصی واقعات کا ذکر نہیں کر رہا۔

جہاد کس لیے؟

جہاد کیا ہے اور اسلام میں جنگ کس لیے ہے؟ جہاد آج کی دنیا کے اہم ترین موضوعات میں سے ہے۔ میں مختصراً عرض کرتا ہوں کہ جہاد کا اصولی مفہوم وہی ہے جو آج کی برتر قوتیں اپنے فکر و ثقافت کی بالادستی کے لیے کر رہی ہیں۔ یہ ایک پیچیدہ سی بات ہے لیکن ذرا غور کریں کہ آج کی برتر قوتیں کیا کر رہی ہیں؟ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہمارا ایک فلسفہ و تہذیب ہے جسے ہم ہر طرح کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے دنیا تک پہنچائیں گے اور جو بھی ہمارے فلسفہ و تہذیب کی اشاعت میں رکاوٹ بنے گا ہم اس کے ساتھ جنگ کریں گے۔ یہ وہی بات ہے جو ایک دور میں مسلمانوں نے کہی تھی۔ جب پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی تو اس کے بعد یہ کہا گیا کہ اسلام وہ فلسفۂ حیات ہے جو تمام انسانیت کے لیے یکساں مفید ہے اور یہ کہ مسلمان اس تہذیب کو لے کر دنیا کے کونے کونے میں جائیں گے۔ البتہ ہر کسی کی مرضی ہوگی کہ وہ اسلام قبول کرے یا نہ کرے لیکن جو بھی تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنے گا اس کے ساتھ جنگ کی جائے گی۔ چنانچہ جہاد کے فلسفے کو آج کی قوتیں تسلیم کیے ہوئے ہیں اور اس پر عمل کر رہی ہیں۔

یہ بات الگ ہے کہ کونسا فلسفہ اور تہذیب ٹھیک ہے اور کونسی غلط۔ لیکن جو قوت اپنے فلسفے کو، اپنی ثقافت کو، اپنی تہذیب کو صحیح سمجھتی ہے وہ طاقت کے ساتھ پوری دنیا میں اسے پھیلانے کی کوشش کرتی ہے۔ آج جس فلسفے کو دنیا کے لیے بہتر سمجھا جا رہا ہے یہ ہیومن رائٹس کا فلسفہ ہے لبرٹی کا فلسفہ ہے عورتوں کے حقوق کا فلسفہ ہے اور مرد و عورت کے مابین مساوات کا فلسفہ ہے۔ آج مغربی تہذیب کو بڑے خوش نما عنوانات کے ساتھ پوری دنیا میں پھیلانے کے لیے طاقت کا استعمال ہو رہا ہے اور جہاں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فلسفے کی راہ میں لوگ رکاوٹ بن رہے ہیں تو وہاں انہیں طاقت کے ساتھ دبایا اور ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ فلسفہ کہ نسل

انسانی کے لیے جو تہذیب بہتر ہے اس سے نسل انسانی کو روشناس کرانے کے لیے کسی رکاوٹ کو برداشت نہ کیا جائے، اسی کا نام جہاد ہے۔ یعنی اس بات میں زبردستی نہیں ہے کہ کوئی اس تہذیب کو قبول کرتا ہے یا نہیں لیکن یہ تہذیب دوسروں تک پہنچانے میں کوئی رکاوٹ نہ بنے۔ یہ الگ بحث ہے کہ فلسفہ ان کا ٹھیک ہے یا ہمارا، نسل انسانی کے لیے ان کی تہذیب بہتر ہے یا ہماری۔

اشاعتِ اسلام کے لیے جبر

اشاعت اسلام کے پہلے مرحلے کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کی دعوت دو اگر مان جائیں تو ٹھیک ورنہ ان سے کہو کہ ہمارے راستے میں رکاوٹ مت بنو۔ یعنی مسلمان نہیں بنتے نہ بنو لیکن ہمیں دوسروں تک اسلام کی دعوت پہنچانے دو۔ اگر تم بطور کافر ہماری رعیت میں رہنا چاہتے ہو تو ہم تمہاری ذمہ داری اٹھائیں گے اور تمہاری حفاظت کریں گے لیکن اگر تم اسلام کی دعوت دینے میں رکاوٹ بنو گے تو ہم تم سے لڑیں گے۔ جناب نبی کریم ﷺ کو جہاں کہیں بھی شبہ ہوا کہ کسی نے دوسروں کو مسلمان بنانے کے لیے زبردستی کی وہاں نبی کریم ﷺ نے سختی سے منع فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں اس کے متعلق واضح طور پر فرمایا لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (سورۃ البقرۃ ۲۵۶) کہ دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے بے شک ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کافر کو زبردستی مسلمان کرے، لوگوں کو اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (سورۃ الکھف ۲۹) اور کہہ دو سچی بات تمہارے رب کی طرف سے ہے پھر جو چاہے مان لے اور جو چاہے انکار کر دے۔ اسلام کی بات پہنچانا اور اسلام کی دعوت دینا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، اس دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی کہا کہ جو قومیں تمہاری دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں ان کے ساتھ دوستی، معاملات اور تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ

لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (سورۃ الممتحنہ ۸) کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں لیکن جو برتر قوت کی مخالفت میں آئے، جھگڑا کرے اور رکاوٹ بنے تو اس کے متعلق دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ لڑائی کی جاتی ہے اور انہیں راستے سے ہٹایا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا منشور جو آج کی دنیا کا مروجہ فلسفہ ہے اس میں بھی یہی بات مذکور ہے کہ اگر کوئی ملک یا قوم اس فلسفے اور اس نظام کی راہ میں رکاوٹ بنے گا تو اس کے خلاف اقوام متحدہ کی اجازت کے ساتھ طاقت استعمال کی جاسکے گی۔ اسلام میں طاقت کے استعمال کا تصور موجود ہے لیکن اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں کیونکہ اسلام میں مسلمان بنانے کے لیے طاقت کے استعمال کا حق کسی کو نہیں ہے۔ البتہ جہاں لوگ دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنیں اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ جنگ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کے متعلق حضور ﷺ نے واضح احکامات جاری کیے کہ دورانِ جنگ کسی بوڑھے کو قتل نہیں کرو گے، کسی بچے کو نہیں مارو گے، مخالف لشکر کے ایسے لوگ جو تمہارے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے ہوئے اور ویسے ہی لشکر کی خدمت کر رہے ہیں انہیں بھی نہیں مارو گے اور جو ہتھیار پھینک کر بھاگ جائے گا اسے نہیں مارو گے۔ سچی بات یہ ہے کہ آج کے مہذب دور میں ان باتوں پر عمل نہیں ہوتا۔ آج کے اس دور میں کوئی یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جنگ میں غیر متعلقہ آدمی نہیں مارا جائے گا بلکہ آج تو غیر متعلقہ لوگ ہی زیادہ مارے جاتے ہیں۔ لیکن جناب نبی کریم ﷺ نے اس دور میں اس کی ہدایات دیں اور پھر ان ہدایات کی پابندی بھی کروائی۔ ایک جنگ میں حضور ﷺ نے ایک عورت کی لاش دیکھی تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ اس عورت کو کس نے مارا ہے؟ حضور ﷺ نے اس کی باقاعدہ بازپرس کی کہ جنگ میں ایک عورت کیسے قتل ہو گئی۔

اشاعتِ اسلام کا سبب

آج یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے طاقت کے ذریعے لوگوں کو مسلمان کیا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی جو حضور ﷺ نے صبر آزما حالات میں گزاری اس دور میں جو لوگ مسلمان ہوئے انہیں کس طاقت نے مسلمان کیا؟ بڑے بڑے مسلمان تو اسی دور میں ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو کس طاقت نے مسلمان کیا تلوار تو ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ حضور ﷺ کے قتل کے ارادے سے حضور ﷺ کے پاس آئے تھے جبکہ حضور ﷺ نہتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابوذر غفاریؓ بنو غفار سے جب مکہ آئے تو یہ جناب رسول اللہ ﷺ کا شعب ابی طالب میں محصور ہونے کا دور تھا۔ ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس زمانے میں ہی بت پرستی سے نفرت تھی میں خدا کو مانتا تھا اور اپنے ذوق سے اس کی عبادت کیا کرتا تھا۔ مجھے اپنے قبیلے میں پتہ چلا کہ مکہ میں کوئی صاحب ہیں جو میرے جیسی باتیں کرتے ہیں، میں نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ جا کر پتہ کر کے آؤ۔ بھائی گیا اور جا کر سرسری معلومات لے کر آیا لیکن مجھے اس سے تسلی نہ ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود جا کر پتہ کرتا ہوں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میں مکہ میں جب پہنچا تو وہاں سہما سہما سا ماحول تھا مجھے کسی سے یہ بات پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ محمد ﷺ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں تاکہ میں ان سے مل سکوں۔ میں حرم میں آکر بیٹھ گیا۔ شام کو ایک صاحب آئے اور پوچھا کہ مسافر ہو؟ میں نے بتایا کہ ہاں مسافر ہوں۔ کہنے لگے کہ آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ میں ان کے ساتھ گیا اور کھانا کھا کر واپس آکر پھر حرم میں بیٹھ گیا۔ دوسرے دن وہی صاحب آئے تو میں پھر حرم میں تھا اور زم زم پی رہا تھا۔ ان صاحب نے پوچھا اے مسافر! تمہیں ابھی تک تمہاری منزل نہیں ملی۔ میں نے کہا نہیں۔ انہوں نے پھر مجھے ساتھ لے جا کر کھانا کھلایا۔ تیسرے دن پھر یہی ہوا۔

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ تین دن یہی ہوتا رہا کہ وہ صاحب مجھے کھانا کھلانے کے لیے لے جاتے اور میں کھانا کھا کر واپس آجاتا۔ نہ مجھ میں ان صاحب سے پوچھنے کا حوصلہ ہوا اور نہ ہی وہ صاحب مجھ سے میرا مقصد پوچھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تیسرے دن میں نے دل

سخت کر کے پوچھ ہی لیا کہ بھئی میں یہاں اس مقصد سے آیا ہوں کہ ان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جو توحید کی بات کرتے ہیں اور بتوں کی مخالفت کرتے ہیں، اگر تم میرے ساتھ جھگڑا نہ کرو تو میں تم سے یہ بات پوچھ لوں؟ یہ میزبان حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ حضرت علیؓ ہنس پڑے اور فرمایا کہ تم صحیح آدمی سے ملے ہو کسی اور سے یہ بات کہتے تو نہ جانے کیا معاملہ ہوتا۔ رات آرام کرو میں تمہیں صبح ملاقات کے لیے لے جاؤں گا۔ حضور ﷺ زید بن ارقمؓ کے مکان میں تھے جو انہوں نے ایک خفیہ ٹھکانہ بنایا ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئے اور آپ ﷺ کی دعوت کے متعلق دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے انہیں اپنی دعوت کے متعلق بتایا کہ میں توحید کی بات کرتا ہوں اور بت پرستی کی مخالفت کرتا ہوں اور یوں حضرت ابوذر غفاریؓ مسلمان ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں ہدایت دی کہ سیدھے اپنے قبیلے میں چلے جاؤ اور یہاں کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا، اپنے قبیلے میں جا کر کام کرو۔ جب تمہیں یہ خبر ملے کہ میں نے مکہ چھوڑ کر کہیں اور اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہے تو تم میرے پاس آجانا۔ جبکہ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو یہاں اعلان کر کے جاؤں گا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ چنانچہ وہ بیت اللہ کے قریب گئے جہاں سب قریشی اکٹھے تھے وہاں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں ابوذر ہوں بنو غفار سے آیا ہوں اور میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ اس ماحول میں یہ بم پھٹنے والی بات تھی۔ فرماتے ہیں کہ لوگ آگئے کسی کے ہاتھ میں جوتا ہے کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے کوئی مکہ مار رہا ہے کوئی تھپڑ مار رہا ہے حتیٰ کہ میں زمین پر گر گیا اور لوگ مجھ پر پل پڑے۔ حضرت عباسؓ جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے یہ منظر دیکھ رہے تھے انہوں نے آکر مجھے درمیان سے نکالا اور لوگوں کو مار پیٹ سے روکا اور کہا کہ لوگو کیا کر رہے ہو یہ بنو غفار کا آدمی ہے، شام کی طرف تمہارے تجارت کے قافلے جاتے ہیں تو ان کا قبیلہ راستے میں ہے، تم لوگوں نے اسے مار دیا تو تمہاری تجارت کا راستہ بند ہو جائے گا۔ حضرت عباسؓ نے یہ کہہ کر ان کی جان چھڑوائی۔ ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں رات وہیں رہا اگلے دن جب چاشت کا وقت آیا اور بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تو میں نے پھر کھڑے ہو کر اعلان کر

دیا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ فرماتے ہیں کہ میری ایک بار پھر پٹائی ہوئی۔

میں جو بات عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ابوذر غفاریؓ کو کس طاقت نے مسلمان کیا کہ طاقت والے لوگ تو دوسری طرف تھے۔ یہ دین کی ایمان کی اخلاق کی اور کردار کی قوت تھی جس نے اس جماعت کی بنیاد بنائی۔ اسلام کی پہلی جماعت تو ماریں کھا کر بھوک برداشت کر کے طعن و تشنیع کا سامنا کر کے اور ظلم و ستم سہہ کر تیار ہوئی تھی۔ حضرت خباب بن ارتؓ کہتے ہیں کہ میں جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یارسول اللہ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مہربانی کا معاملہ فرمائیں ہماری حالت تو بہت خراب ہے۔ وہ غلام تھے انہوں نے بتایا کہ میرا مالک کوئلے جلاتا ہے اور مجھے کوئلوں پر سیدھا لٹا کر اوپر میرے سینے پر بیٹھ جاتا ہے۔ چربی پگھلتی ہے خون نکلتا ہے جس سے کوئلے بجھتے ہیں۔ یارسول اللہ کب تک یہ معاملہ رہے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا صبر کرو۔ خبابؓ نے کمر سے چادر اٹھائی اور کہا کہ یارسول اللہ میری کمر کی حالت دیکھیں۔ پیپ رستی ہے گڑھے پڑے ہوئے ہیں بوٹیاں سامنے نظر آرہی ہیں۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا حوصلہ کرو صبر کرو۔ فرمایا کہ تم سے پہلے ایمان قبول کرنے پر لوگوں پر یہ وقت بھی آیا کہ ایک انسان کو سر پر آری رکھ کر پاؤں تک دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ لوہے کی کنگھیاں بنا کر جسم سے گوشت کی آخری بوٹی تک نوچ لی گئی۔

میں نے یہ عرض کیا کہ جنگ اور جہاد لوگوں کو مسلمان کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ اسلام کی راہ سے رکاوٹ دور کرنے کے لیے تھا چنانچہ اسی بنا پر اسلامی تاریخ میں جہاد ہوا ہے۔ اسلام کی دعوت تو جناب رسول اللہ ﷺ نے مظلومیت کی حالت میں دی اور ظلم کے اس دور میں جانثاروں کی ایک جماعت تیار کی۔ اور یہ اسلام کی تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں پر جتنے زیادہ ظلم ڈھائے گئے ہیں اسلام کی دعوت اتنی زیادہ دنیا میں پھیلی ہے۔ آج بھی دیکھ لیں کہ جتنا مسلمانوں کی مظلومیت میں اضافہ ہوا ہے اتنا زیادہ اسلام کی تعلیمات سے

لوگ روشناس ہوئے ہیں۔ اسلام کی ابتدائی جنگیں تو سراسر دفاعی جنگیں تھیں، اور بعد کی جنگیں بھی بظاہر اقدامی نظر آتی ہیں لیکن وہ دفاعی ہی تھیں کہ جن قوتوں سے مسلمانوں نے خطرہ محسوس کیا اور جن طاقتوں نے مسلمانوں کے خلاف عزائم کا اظہار کیا ان کے خلاف مسلمانوں نے بروقت اقدامات کیے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا انا نبی الملاحم میں جنگوں کا نبی ہوں۔ حضور ﷺ کے وصال کے وقت بھی آپ ﷺ کے ترکے میں ہتھیار ہی تھے، تلواریں اور زرہیں تھیں۔ لیکن حضور ﷺ کی اور بعد میں آنے والوں کی جنگیں لوگوں کو مسلمان کرنے کے لیے نہیں تھیں بلکہ مسلمانوں اور دعوتِ اسلام کو تحفظ دینے کے لیے تھیں۔

اسلام میں صلح کا تصور

نبی کریم ﷺ نے بوقت ضرورت صلح بھی کی اور صلح کے معاہدوں کی پاسداری بھی کی۔ جب قریش مکہ کے ساتھ صلح ہوئی کہ دس سال جنگ نہیں کریں گے، یہ صلح بظاہر بہت کمزور شرطوں پر تھی، اس معاہدے کے وقت آپ ﷺ اپنی جماعت کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکہ کے باہر موجود تھے لیکن کفارِ مکہ نے یہ شرط بھی رکھ دی کہ مسلمان اس سال عمرہ نہیں ادا کر سکیں گے اس کے لیے انہیں اگلے سال کا انتظار کرنا ہو گا۔ ایک شرط انہوں نے یہ بھی رکھی کہ معاہدے کے دس سالوں کے دوران مسلمانوں کا کوئی ساتھی انہیں چھوڑ کر مکہ مکرمہ گیا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا لیکن اگر کفار مکہ کا کوئی ساتھی انہیں چھوڑ کر مسلمانوں کے پاس گیا تو وہ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یارسول اللہ کن شرطوں پر صلح کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں نبی ہوں اور اللہ کے حکم سے ایسا کر رہا ہوں اور ایک وقت آئے گا کہ یہی صلح فتح میں تبدیل ہو گی۔ صلح نامہ کا معاہدہ کرنے کے لیے قریش کا نمائندہ سہیل بن عمرو تھا جبکہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے یہ معاہدہ لکھوایا۔ قریش کی رعونت کا عالم دیکھیں کہ حضور ﷺ نے جب یہ لکھوایا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تو سہیل بن عمرو نے کہا کہ ماالرحمٰن یہ رحمان کیا ہے

اسے مٹاؤ۔ ہم جس طرح باسمک اللھم لکھا کرتے ہیں ویسے ہی لکھو۔ اور جب حضرت علیؓ نے معاہدہ لکھا کہ ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ و سہیل بن عمرو تو اس پر سہیل بن عمرو نے اعتراض کر دیا کہ اگر معاہدے میں ہم انہیں رسول اللہ ﷺ مان لیں تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے اس لیے محمد رسول اللہ کی جگہ محمد بن عبد اللہ لکھو۔ اس پر وہاں بڑی جذباتی فضا بن گئی، کون مسلمان ہے جو اپنے ہاتھ سے محمد رسول اللہ کا جملہ لکھ کر اسے کاٹے؟ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے کہا امح کاٹو۔ حضرت علیؓ نے کہا یا رسول اللہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا امح یا علی علی اسے کاٹو۔ حضرت علیؓ نے کہا واللہ لا أمحوہ اللہ کی قسم نہیں کاٹوں گا۔ حتیٰ کہ حضور نے خود وہ جملہ کاٹا۔

اسی طرح جب یہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا تو سہیل بن عمرو کا اپنا بیٹا ابو جندلؓ جو مسلمان ہو گیا تھا اسے گھر میں زنجیروں میں باندھ کر رکھا گیا تھا وہ کسی طرح زنجیر توڑ کر آ گیا کہ جناب میں آپ ﷺ کا ساتھی ہوں اور آپ ﷺ کے ساتھ جاؤں گا۔ سہیل نے کہا کہ جناب آپ نے معاہدے میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ ہمارا کوئی آدمی آپ کے پاس آئے گا تو آپ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابھی معاہدہ مکمل نہیں ہوا۔ سہیل نے کہا کہ پھر ہمیں یہ معاہدہ منظور نہیں ہے، میرا بیٹا واپس مکہ واپس جائے گا تو یہ معاہدہ ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔ چنانچہ آپ نے معاہدہ تسلیم کر لیا۔ ابو جندل نے کہا کہ یا رسول اللہ مجھے کن لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں کیا آپ میرا حال نہیں دیکھ رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم معاہدے کی رو سے پابند ہیں اس لیے تمہیں واپس جانا ہو گا۔ یہ ایسی صورتحال تھی کہ صحابہؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں منظر کو دیکھ نہیں پا رہا تھا اور میں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن حضور ﷺ نے حالات کی ضرورت کے پیش نظر صلح کا یہ معاہدہ کیا اور اسے نبھایا۔ اس معاہدے کے بعد انہی مکہ کے مجبور و بے بس مسلمانوں میں سے ابو بصیرؓ مدینہ منورہ گئے تو قریش کا نمائندہ بھی وہاں پہنچ گیا کہ جناب ہمارا ساتھی آپ کے پاس آیا ہے اسے واپس کریں۔ حضور ﷺ نے معاہدے کی پاسداری کرتے ہوئے ابو بصیرؓ کو واپس کر دیا۔

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے جنگ بھی کی ہے اور صلح بھی اور دونوں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی پاسداری بھی کی۔ تاریخ آج بھی جنگ اور صلح دونوں حوالوں سے اگر کوئی آئیڈیل شخصیت پیش کر سکتی ہے تو وہ جناب رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ جبکہ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم جناب رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسری طرف چل پڑے ہیں۔ آج بھی اگر ہم جناب نبی کریم ﷺ کی صلح و جنگ کے اصولوں کو اپنائیں تو اسلام ہی آئیڈیل قانون اور ضابطہ ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

صلہ رحمی اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

رشتوں کا لحاظ رکھنا، رشتوں کو ملانا، رشتوں کو جوڑ کر رکھنا اور ان کا احترام کرنا، قرآن کریم نے اس کا حکم دیا ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے قول و عمل سے اس کی تعلیم دی ہے۔ قرآن کریم نے اپنے رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کو صلہ رحمی سے تعبیر کیا ہے۔ گھر کی چار دیواری سے باہر کا دائرہ خاندان کا دائرہ ہوتا ہے جس میں باپ کی طرف کے رشتہ دار چچا، پھوپھیاں، چچازاد، پھوپھی زاد، اور اسی طرح ماں کی طرف کے رشتہ دار خالہ، ماموں، خالہ زاد اور ماموں زاد وغیرہ آتے ہیں۔ اسلام نے زندگی کے بہت سے معاملات میں اس دائرے کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا ہے، قرآن کریم میں ہے وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّہُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (سورۃ الرعد ۲۱) اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جس کے ملانے کو اللہ نے فرمایا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔

اسلام میں صلہ رحمی کو مستقل نیکی قرار دیا گیا ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات بحال رکھنے کے حوالے سے، ان کے ساتھ امداد و تعاون کے حوالے سے، آپس میں ایک دوسرے کی عزت و احترام کو ملحوظ رکھنے کے حوالے سے اور دیگر معاشرتی حوالوں سے جناب رسول اللہ ﷺ نے بہت سے ارشادات فرمائے ہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کے حوالے سے فرمایا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے لوگوں پر خرچ کرتا ہے تو یہ اجر و ثواب کی بات ہے لیکن وہی خرچ اگر اپنے رشتے داروں پر کرے گا تو دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ اسے صدقے کا اجر بھی ملے گا اور صلہ رحمی کا ثواب بھی حاصل

ہو گا۔ جناب نبی کریم ﷺ نے صدقہ و خیرات میں رشتہ داروں اور قرابت داروں کو ترجیح دینے کا حکم دیا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو صدقہ و خیرات کے معاملے میں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو ترجیح دینے کا حکم دیا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ دو نیکیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں، ایک صدقہ و خیرات کی اور دوسری صلہ رحمی کی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی جب صدقہ و خیرات کرتا ہے تو کوشش ہوتی ہے کہ مستحق کو ملے۔ جبکہ رشتہ داروں کے عمومی حالات کے متعلق ہر آدمی جانتا ہے کہ کون شخص یا خاندان امداد کا زیادہ مستحق ہے۔

قریبی پڑوسیوں کی حالت کے متعلق بھی معلوم ہوتا ہے اور رشتہ داروں کے متعلق بھی، یا یوں کہہ لیں کہ ان کے حالات آدمی زیادہ آسانی سے معلوم کر سکتا ہے۔ رشتہ داروں کے علاوہ خرچ کرنے کا بھی ثواب ہے لیکن وہاں اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کہ امداد کسی مستحق کو ملی ہے یا غیر مستحق کو۔ لیکن اپنے رشتہ داروں میں آدمی کو اندازہ ہوتا ہے کہ کس کی معاشی حالت کیا ہے اس لیے خرچ کرتے وقت آدمی زیادہ اطمینان و اعتماد کے ساتھ خرچ کرتا ہے۔ یہی معاملہ پڑوسیوں کے ساتھ بھی ہے۔ چنانچہ صلہ رحمی کا نہ صرف حکم دیا گیا ہے بلکہ اسے مسلمان معاشرے کے بنیادی تقاضوں میں سے قرار دیا گیا ہے۔ آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں رشتے، برادری اور تعلقات کے وہ سلسلے ختم ہو کر رہ گئے ہیں جو اچھے زمانوں میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن اسلام نے بطور خاص رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور میل جول رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ میل جول حقارت کی وجہ سے ترک کیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہے گا۔

جناب نبی کریم ﷺ اپنے رشتہ داروں اور میل جول والوں کے ساتھ حسن سلوک فرمایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے خاندان کے ساتھ میل جول کا سلسلہ قائم رکھتے تھے اور معاشرتی

حوالے سے عزت واحترام کا معاملہ فرمایا کرتے تھے۔اسلام کے اعلان کے بعد جن رشتہ داروں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ تھا ان میں ایک حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ تھے جو حضور ﷺ کے چچا بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی تھے۔ حضور ﷺ نے بھی ثویبہؓ کا دودھ پیا تھا اور حضرت حمزہؓ نے بھی۔ حضرت حمزہؓ احد میں شہید ہوگئے تھے۔ فتح مکہ کے بعد حضرت حمزہؓ کا خاندان جب مدینہ منورہ آیا تو حضرت حمزہؓ کی بیٹی جوان تھیں۔ کسی نے نبی کریم ﷺ سے ذکر کیا کہ یارسول اللہ! یہ آپ کی چچازاد ہے آپ اسے اپنے نکاح میں لے لیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خدا کے بندو! حمزہ میرے چچا بھی تھے اور میرے رضاعی بھائی بھی، اس حساب سے یہ میری بھتیجی لگتی ہے۔ یعنی نسب کے حوالے سے چچازاد جبکہ رضاعت کے حوالے سے بھتیجی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے لیے اس کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ حضور ﷺ کے چچازاد بھی تھے اور داماد بھی تھے۔

جناب رسول اللہ ﷺ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ خود بھی حسن سلوک کرتے تھے اور دوسروں کے حسن سلوک کی تعریف بھی فرمایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے بڑے داماد حضرت ابوالعاصؓ بن ربیع تھے جو کہ حضرت زینبؓ کے خاوند تھے۔ حضور ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں۔ حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ۔ حضرت زینبؓ کے خاوند ابوالعاصؓ بن ربیع خاصا عرصہ مسلمان نہیں ہوئے اور کافروں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑتے رہے۔ جنگ بدر میں بھی وہ کفارِ مکہ کی طرف سے لڑے اور مسلمان لشکر کے ہاتھوں قید ہوئے، بہت بہادر اور دلیر آدمی تھے۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ابوالعاصؓ سے فرمایا کہ میری بیٹی کو واپس بھیج دو، حضرت ابوالعاصؓ نے حضرت زینبؓ کو حضور ﷺ کے پاس بھیج دیا۔ اب حضرت زینبؓ مدینہ میں تھیں اور ابوالعاصؓ مکہ میں تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں اور کافروں کے نکاح ابھی قائم تھے۔ ایک موقع پر ابوالعاصؓ گرفتار ہو کر بطور مجرم مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کی قید میں آگئے، اس دور میں قید خانے تو ہوتے نہیں تھے اس لیے قیدی کو لاکر مسجد نبوی میں ستون کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا۔ حضور ﷺ مناسب موقع پر اس کے متعلق فیصلہ فرمادیتے کہ

اسے فدیہ لے کر چھوڑنا ہے، قتل کرنا ہے یا پھر غلام بنانا ہے۔ مجرم ایک آدھ دن وہیں بندھا رہتا تھا۔ ابوالعاصؓ کو بھی اسی طرح ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا کہ وہ دشمن تھے اور جنگی قیدی تھے۔ نبی کریم ﷺ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد مجرم کا فیصلہ کرتے تھے، چنانچہ آپؐ نے فجر کی نماز پڑھائی۔ حضرت زینبؓ کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ میرا خاوند قید ہو کر مسجد نبوی میں ستون کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ابوداؤد شریف کی روایت ہے کہ فجر کی نماز ہو چکی تھی حضرت زینبؓ اپنے حجرے سے نکلیں اور مسجد نبوی کے دروازے کے ساتھ آکر کھڑی ہو گئیں۔ حضور ﷺ جونہی نماز پڑھا کر نمازیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور ابھی مقدمہ شروع ہونے والا تھا کہ حضرت زینبؓ نے دروازے کے اندر جھانک کر کہا یارسول اللہ قد أجرت ھذا الاسیر۔ میں نے اس قیدی کو پناہ دے دی ہے۔

اسلام کا ضابطہ یہ ہے کہ قیدی مجرم ہو تو جس طرح فوج کا سپہ سالار کسی دشمن کو پناہ دے سکتا ہے اسی طرح ایک عام شہری بھی پناہ دے سکتا ہے۔ اگر عام شہری بھی کسی کافر کو پناہ دے دے تو اس کی جان بخشی ہو جاتی ہے اور اسے قتل کرنا جائز نہیں رہتا۔ حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا قد أجرنا من أجرت تم نے پناہ دے دی ہے تو ہم نے بھی پناہ دے دی ہے۔ ابوالعاصؓ بن ربیع آزاد ہو کر سیدھا مکہ گئے اور جا کر کہا کہ لوگو! میں وہیں مدینہ میں مسلمان ہو گیا تھا لیکن میں نے وہاں پر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان اس لیے نہیں کیا کہ تم یہ نہ کہو کہ ابوالعاص قید یا قتل سے بچنے کے لیے مسلمان ہو گیا ہے۔ اس لیے یہاں مکہ میں تمہارے سامنے اعلان کر رہا ہوں اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ یہ اعلان کرنے کے بعد ابوالعاصؓ نے کہا کہ جس کا میرے ساتھ کوئی حساب کتاب ہے وہ میرے ساتھ معاملہ کر لے۔ اور میں مدینہ جا رہا ہوں جس کو مجھے روکنا ہے وہ مجھے روک کر دیکھ لے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبے کے دوران ابوالعاصؓ کی تعریف کی، فرمایا وہ بہت اچھا داماد ہے اس نے میرے ساتھ جو بات بھی کی پکی کی جو وعدہ بھی کیا پورا کیا۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ اپنے رشتہ داروں کا لحاظ بھی کرتے تھے اور جہاں تعریف کرنی ہوتی وہاں تعریف بھی کرتے تھے۔

حضرت عثمانؓ بدر کی لڑائی میں شریک نہیں ہو سکے اس وجہ سے کہ حضرت عثمانؓ کے نکاح میں جناب نبی کریم ﷺ کی دوسری بیٹی حضرت رقیہؓ تھیں۔ حضرت رقیہؓ سخت بیماری کی حالت میں گھر پر تھیں اور حضرت عثمانؓ کے علاوہ کوئی ان کی تیمار داری کرنے والا نہیں تھا۔ بدر کے معرکے میں جانے لگے تو حضرت عثمانؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں بھی جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہوں، حضور ﷺ نے انہیں منع کرتے ہوئے فرمایا کہ تم گھر میں رہو اس لیے کہ رقیہؓ بیمار ہے اور کوئی اسے پانی دینے والا بھی نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اصرار کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو ثواب وہاں جنگ میں شریک ہونے والوں کو ملے گا تمہیں یہاں گھر میں رہ کر ملے گا۔ جناب نبی کریم ﷺ نے سخت ترین جنگی حالات میں بھی اپنی بیٹی کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو جنگ میں جانے سے روک دیا۔ چنانچہ اسی بیماری کے دوران حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنی تیسری بیٹی ام کلثوم حضرت عثمانؓ کے نکاح دے دی، حضرت ام کلثومؓ کا بھی بعد میں انتقال ہو گیا۔ اس پر حضور ﷺ نے اس پر ایک ایسا جملہ فرمایا جو کوئی خسر کم ہی اپنے داماد کے متعلق کہتا ہے۔ فرمایا، عثمانؓ میری اور کوئی بیٹی تمہارے لیے دستیاب نہیں ہے، اگر میری سو بیٹیاں بھی ہوتیں تو ایک ایک کر کے تمہارے نکاح میں دے دیتا۔ یہ ایک خسر کا اپنے داماد پر بے انتہا اعتماد کا اظہار تھا۔ تو جناب نبی کریم ﷺ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا اور عزت و احترام کا معاملہ فرماتے تھے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ نے اپنی رزمیہ شاعری کے ذریعے کفارِ مکہ کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا تو اس پر حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ اگر تم قریش کو اپنے اشعار میں برا بھلا کہو گے تو اس کی زد میں میرے آباؤ اجداد بھی آئیں گے۔ یعنی حضور ﷺ نے یہ بات پسند نہ کی کہ کوئی ان کے آباؤ اجداد کو اور ان کے نسب میں سے کسی کی مذمت کرے۔ واقعہ یوں ہوا کہ غزوۂ خندق کے بعد جب مشرکین مکہ نے دیکھا کہ ہم لڑائی کے میدان میں شکست نہیں دے پا رہے تو انہوں نے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اسلام اور مسلمانوں کی مذمت میں شاعروں نے اشعار کہنے شروع کر دیے، خطیبوں نے خطبے دینے

شروع کر دیے اور مسلمانوں کی کردار کشی کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب آدمی میدان میں مقابلہ نہ کر سکے تو پھر زبان سے سارا غصہ نکالتا ہے، قریش نے بدر میں شکست کھائی تھی، احد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور پھر خندق میں اپنا پورا زور لگانے کے باوجود ناکام ہو گئے تھے۔ خندق قریش کے ساتھ مسلمانوں کا آخری معرکہ تھا جس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آج کے بعد انہیں ہم پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوگی، اب جب بھی جائیں گے ہم جائیں گے۔ فرمایا اب یہ لوگ ہمارے خلاف تلوار کی جنگ نہیں لڑیں گے بلکہ یہ ہمارے خلاف زبان کی جنگ لڑیں گے۔ یہ لوگ ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کریں گے، شعر کہیں گے، خطبے دیں گے، عرب قبائل کو ہمارے خلاف بھڑکائیں گے اور ہمارے خلاف نفرت وغصے کی فضا گرم کریں گے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ حضور ﷺ نے دراصل فرمایا کہ یہ لوگ ہمارے خلاف میڈیا کی جنگ لڑیں گے، یہ ہمارے خلاف لوگوں کو اشتعال دلائیں گے اور ہماری کردار کشی کریں گے۔ مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کا مجمع تھا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تلوار کی جنگ میں تم لوگ میرے ساتھ تھے لیکن اس زبان کی جنگ میں کون میرے ساتھ ہو گا؟ حافظ ابن عبد البر نقل کرتے ہیں کہ تین آدمی کھڑے ہوئے، تینوں انصاری تھے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ۔ یہ تینوں شاعر کھڑے ہو گئے کہ یا رسول اللہ! یہ جنگ ہم لڑیں گے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے تو اپنی زبان پکڑ کر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنی اس زبان کے ساتھ ان کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ تینوں میں کام کی تقسیم کار اس طرح تھی کہ حسان بن ثابتؓ جناب رسول اللہ ﷺ کی مدح بیان فرماتے تھے اور مشرکین جو ہجو کرتے تھے اس کا جواب دیتے تھے۔ حضرت کعب بن مالکؓ کفار کی مذمت کیا کرتے تھے کہ مشرک ایسے ہوتے ہیں کافر ایسے ہوتے ہیں اور ان میں یہ یہ اخلاقی خرابیاں ہوتی ہیں۔ جبکہ عبد اللہ بن رواحہؓ کی شاعری رزمیہ تھی کہ مار دیں گے، تباہ کر دیں گے، جڑ سے اکھاڑ دیں گے وغیرہ۔ بلکہ ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں آتا ہے کہ عمرۃ القضا کے موقع پر جب حضور ﷺ مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو عبد اللہ بن رواحہؓ کے ہاتھ میں حضور ﷺ کی اونٹنی کی لگام تھی اور وہ اپنے اشعار پڑھتے جا

رہے تھے۔ یہ واقعہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کا ہے۔ وادی سے نیچے اتر رہے تھے حضور ﷺ کی اونٹنی کی لگام عبد اللہ بن راوحہؓ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اپنے جذبے سے اشعار پڑھتے جا رہے تھے کہ ہم کافروں کو تباہ کر دیں گے، اڑا دیں گے، چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو قریب آ کر منہ کے اشارے سے کہا کہ خاموش ہو جاؤ سامنے دیکھو کعبہ نظر آ رہا ہے اور تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کا عبد اللہؓ کو اس طرح روکنا دیکھ لیا۔ فرمایا دعہ یا عمر! چھوڑو اسے اور پڑھنے دو۔ خدا کی قسم اس کے اشعار کافروں کے سینوں میں تیروں سے زیادہ نشانے پر لگ رہے ہیں۔

اسی طرح بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، حضرت حسان بن ثابتؓ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی مدح میں بڑے مزے سے اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ پاس سے گزرے تو گھور کے دیکھا کہ خدا کے بندے مسجد میں بیٹھے ہو، دیکھ بھال کر یا آہستہ پڑھو۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے فوراً کہا کہ امیر المؤمنین! کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں، میں اسی مسجد میں یہ اشعار پڑھا کرتا تھا اور رسول اللہ ﷺ مجھے داد دیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی حضرت ابو ہریرۃؓ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت حسان بن ثابتؓ نے کہا کہ ابو ہریرہ! تم میرے گواہ ہو کہ اسی مسجد میں حضور ﷺ بھی ہوتے تھے باقی صحابہ بھی ہوتے تھے اور میں کفار کی ھجو کا جواب دیا کرتا تھا اور حضور ﷺ کی مدح کیا کرتا تھا حضور ﷺ اس پر خوش ہوتے تھے مجھے داد دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ حسان! اور اشعار کہہ تمہاری پشت پر روح القدس کھڑا ہے۔ پھر حضرت حسانؓ نے حضرت ابو ہریرۃؓ سے پوچھا، کیوں ابو ہریرہ! یہ بات اسی طرح ہے جیسے میں کہہ رہا ہوں؟ حضرت ابو ہریرۃؓ نے کہا کہ ہاں یہ بات اسی طرح ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ خاموش ہو کر وہاں سے چل دیے۔

میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ حضرت حسان بن ثابتؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں یہ جنگ ایسی لڑوں گا اور ان قریشیوں کی ایسی مذمت کروں گا کہ دنیا یاد کرے گی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ایک جملہ فرمایا فیھم نسبی یا حسان! اگر تم ان کی مذمت کرو گے تو

اس میں میرے خاندان اور میرے نسب کے لوگ بھی آئیں گے جو قابل احترام ہیں، ان کے ساتھ تم کیا معاملہ کرو گے؟ حضرت حسانؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں مذمت کرتے ہوئے آپ کے نسب کو ایسے درمیان سے نکال دوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ یعنی میں آپ کے نسب کا لحاظ رکھوں گا اور اس پر کوئی زد نہیں آنے دوں گا۔ پھر حضور ﷺ نے حضرت حسانؓ سے کہا کہ ہمارے جو نسب نامے ہیں ان کا ابو بکرؓ کو سب معلوم ہے ان سے جا کر یہ معلوم کر لو کہ کس کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے۔ چنانچہ حضرت حسان بن ثابتؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس گئے اور ساری تفصیل معلوم کی پھر آکر رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ میں نے آپ کا نسب سیکھ لیا ہے، اب آپ تسلی رکھیں میں ہجو بھی کروں گا اور آپ کے نسب کو بھی بچاؤں گا۔ چنانچہ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اپنے خاندان والوں کی عزت کا لحاظ رکھنا بھی سنت ہے۔ خاندان کے حوالے سے جناب نبی کریم ﷺ کا اپنا طرز عمل بھی یہی تھا اور دوسروں کو تلقین بھی یہی تھی۔

خاندان میں سب سے بڑا حق ماں باپ کا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ مسلمان ہوئے تو ان کی والدہ ناراض ہو گئیں کہ میرا بیٹا مسلمان کیوں ہوا ہے، اپنے بیٹے سے کہا کہ تم کلمہ چھوڑو ورنہ میں تمہارے ساتھ بولنا چھوڑ دوں گی۔ حضرت سعدؓ پریشان ہو گئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میری ماں تو میرے کلمہ پڑھنے پر ناراض ہو گئی ہے۔ آپ ﷺ نے انہیں اپنی ماں کے احترام کی تلقین کی۔ جب ماں نے کچھ دن دیکھا کہ بیٹا کلمہ نہیں چھوڑ رہا تو ایک دن گھر سے نکل کر کھلے میدان میں جا کر بیٹھ گئی اور اپنے بال بکھیر لیے، اعلان کر دیا کہ میں اس وقت تک نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور نہ سائے میں بیٹھوں گی جب تک تم کلمہ نہیں چھوڑو گے۔ اب سعدؓ مزید پریشان ہو گئے کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہوا۔ ماں دھوپ میں بیٹھی ہوئی ہے نہ سائے میں بیٹھتی ہے نہ کھانا کھاتی ہے نہ پانی پیتی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ والدین کی اطاعت ضروری ہے لیکن وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (سورۃ لقمان: ۱۵) اور اگر تجھ پر (والدین) اس بات کا زور دیں کہ تو میرے

ساتھ اس کو شریک بنائے جس کو تو جانتا بھی نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی سے پیش آنا۔ یعنی اگر ماں باپ کفر اور شرک کا حکم دیں پھر ان کی اطاعت لازم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود دنیا کے معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک میں کمی نہ آئے۔ باپ اگر کفر اور گناہ کی بات کرتا ہے تو اس کی وہ بات مت مانو لیکن دنیا کے معاملات یعنی خدمت و احترام، حسن سلوک اور تعاون میں کمی نہ آئے خواہ وہ باپ کافر اور مشرک ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اسلام نے مستقل نیکی شمار کیا ہے۔

خاندانی زندگی کے حوالے سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ رشتوں کو جوڑ کر رکھو، آپس میں میل جول پیدا کرو، تعاون کی فضا قائم کرو اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کا سلسلہ رکھو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صِلْ مَنْ قَطَعَكَ کہ کوئی تم سے تعلق توڑے تب بھی اس سے تعلق جوڑ کر رکھو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرو، اس سے خاندان میں جوڑ پیدا ہوتا ہے آپس میں محبت بڑھتی ہے اور ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد اور تعاون میسر ہوتا ہے۔ یہ اسلام کی تعلیمات ہیں اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

عدلِ اجتماعی کا تصور تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

آج مجھے عدلِ اجتماعی کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور ارشادات گرامی کے حوالہ سے کچھ عرض کرنا ہے، اور اس کے بیسیوں پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو پر چند معروضات پیش کروں گا۔ وہ یہ کہ عام طور پر ایک حکومت اور ریاست کی ذمہ داری میں شہریوں کی جان و مال کی حفاظت، امن کی فراہمی، انصاف کے قیام اور ان کے حقوق کی پاسداری کو شامل کیا جاتا ہے لیکن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت و ریاست کی ذمہ داریوں میں ایک اور بات کا اضافہ کیا کہ وہ شہریوں کو ضروریات زندگی کی فراہمی اور سوسائٹی کے نادار، بے سہارا اور معذور لوگوں کی کفالت کی بھی ذمہ دار ہے۔ اسی کو آج کی دنیا میں رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ مال اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا ومن ترک کلاً وضیاعاً فالیّ وعلیّ اور جو شخص قرض کا بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کریں گے اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوسائٹی کے نادار، مستحق اور بے سہارا اپنی ضروریات کے لیے میرے پاس آئیں گے، اور آپ ﷺ نے بات صرف فالیّ پر نہیں چھوڑی بلکہ وعلیّ فرما کر خود کو اس کا ذمہ دار بھی قرار دیا۔ چنانچہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بیت المال کا تصور سامنے آیا جس کا دائرہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ تھا کہ کسی شخص کو جو ضرورت بھی پیش آتی تھی وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت

المال کے فنڈ سے اس کی ضرورت پوری فرما دیتے تھے۔ بیسیوں واقعات احادیث میں مذکور ہیں جن میں سے صرف دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کو ایک سفر کے لیے کچھ اونٹ درکار تھے، میں خاندان کا نمائندہ بن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور سواریوں کا تقاضہ کیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اونٹ موجود نہیں تھے اس لیے آپ ﷺ نے نہیں دیے لیکن تھوڑی دیر کے بعد کہیں سے اونٹوں کا بندوبست ہو گیا تو مجھے واپس بلا کر دو جوڑے میرے حوالے کیے۔ اسی طرح ایک واقعہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش طبعی اور دل لگی کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ مجھے سفر کے لیے اونٹ کی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ٹھہرو میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں، وہ شخص فکر مند ہو گیا کہ میں اونٹنی کے بچے کے ساتھ کیا کروں گا، تھوڑی دیر اس کی فکر مندی سے محظوظ ہونے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کے بندے جو اونٹ میں تجھے دوں گا وہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہو گا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی ضروریات کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے تھے اور بیت المال سے ان کی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔ جبکہ اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمرانوں کی مہربانی اور احسان قرار دینے کی بجائے حکومت کی ذمہ داریوں کے طور پر بیان کیا ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مالی نظام یہ تھا کہ غنیمت میں سے بیت المال کو خمس یعنی پانچواں حصہ ملتا تھا اور اس خمس کا خمس جو کل غنیمت کا چار فی صد بنتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ذاتی اور گھریلو اخراجات کے لیے دیا جاتا تھا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس خمس الخمس میں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج اور خاندان کے دیگر افراد کو خرچہ دیتے تھے اور یہ خرچے پورے ہونے کے بعد جو بچ جاتا تھا وہ پھر بیت المال [illegible] عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے واپس کر دیتے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کو لوگوں کی ضروریات حسبِ موقع فراہم کرنے کا ذمہ دار قرار دینے کی بات سب سے پہلے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے اور وہیں سے رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کا آغاز ہوتا ہے، اور آج بہت سی حکومتوں نے رفاہی ریاست کا یہ نظام اختیار کر رکھا ہے۔ یہ نظام خلفاء راشدینؓ کے دور میں باقاعدہ منظم ادارے کی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی ایک عملی صورت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت کے ایک واقعہ کا ذکر کر کے واضح کرنا چاہتا ہوں جبکہ اس وقت مدینہ منورہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیت المال کے آغاز کو کم و بیش ایک صدی گزر چکی تھی۔

کتاب الاموال میں امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت میں ان کے عراق کے گورنر عبد الحمید مرحوم نے ایک سال انہیں خط لکھا کہ صوبہ میں زکوٰۃ و عشر اور دیگر محصولات کی وصولی کے بعد پورے سال کا خرچہ اور بجٹ پورا کر کے کچھ رقم بچ گئی ہے، اس کے بارے میں بتایا جائے کہ ہم کیا کریں؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب لکھا کہ یہ سروے کرواؤ کہ تمہارے صوبے میں جو لوگ مقروض ہیں اور اپنا قرضہ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے قرضے اس رقم میں سے ادا کر دو، گورنر نے جواب دیا کہ حضرت یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ امیر المؤمنین نے دوسرا خط لکھا کہ جن بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہیں ان کی شادیاں اس رقم میں سے کرا دو۔ گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں، امیر المؤمنین نے تیسرا خط لکھا کہ جن خاوندوں نے ابھی تک بیویوں کے مہر ادا نہیں کیے اور وہ مہر ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے مہر اس رقم میں سے دلوا دو، گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں۔ امیر المؤمنین نے چوتھا خط لکھا کہ زمینوں کا سروے کرواؤ اور بے آباد زمینوں کی کاشت کے لیے کسانوں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔

دل چسپی کی بات یہ ہے کہ میں نے یہ واقعہ ایک مجلس میں بیان کیا تو ایک نوجوان نے مجھ سے سوال کیا کہ مولوی صاحب! یہ صوبے کا بجٹ تھا یا بحر الکاہل تھا، ایک صوبے کے بجٹ میں اتنے پیسے کدھر سے آ گئے تھے؟ میں نے جواب دیا کہ انہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا

ایک اور واقعہ سن لو یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی۔ کتاب الاموال ہی کی روایت کے مطابق ایک دن حضرت عمر بن عبد العزیزؒ شام کے وقت گھر واپس آئے تو اہلیہ سے پوچھا کہ تمہارے پاس ایک درہم ہو تو مجھے دے دو ضرورت ہے۔ اس نے پوچھا کیا ضرورت ہے؟ فرمایا کہ گھر آتے ہوئے راستے میں ایک ریڑھی پر انگور دیکھے ہیں، انگور کھانے کو جی چاہتا ہے مگر جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اہلیہ نے کہا کہ آپ کے پاس نہیں ہیں تو میرے پاس کہاں سے آئیں گے؟ پھر اس نے بیویوں والے انداز میں کہا کہ آپ کیسے امیر المؤمنین ہیں کہ اپنے لیے ایک درہم کے انگور بازار سے نہیں منگوا سکتے۔ میں اس کا ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ کیا آپ کے پاس اتنا صوابدیدی فنڈ بھی نہیں ہے کہ ایک درہم کے انگور اپنے لیے خرید سکیں؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس پر فرمایا کہ خدا کی بندی جس درہم کی تم بات کر رہی ہو وہ درہم نہیں آگ کا انگارہ ہے۔

میں نے اس نوجوان سے کہا کہ برخوردار! جس ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے درہم کو آگ کا انگارہ سمجھے گا اس کے بجٹ میں پیسے ہی پیسے ہوں گے، پھر مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہوں گے، کنواروں کی شادیاں بھی ہوں گی، خاوندوں کے مہر بھی ادا ہوں گے، اور کسانوں کو قرضے بھی ملیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے روپے کو آگ کا انگارہ تصور کرے۔

حضرات محترم! میں نے عدلِ اجتماعی اور سوشل جسٹس کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کی صرف ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کی ہے، آج کی دنیا کو اسی نظام کی تلاش ہے اور یہی نسل انسانی کی بہت بڑی ضرورت ہے، یہ ہماری ضرورت بھی ہے اور ذمہ داری بھی کہ دنیا کو سوشل جسٹس کے اس تصور سے متعارف کرائیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ کی تعلیمات کی روشنی میں صحیح سمت نسل انسانی کی راہ نمائی کا فریضہ سر انجام دیں۔

عدل و انصاف اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

محترم حضرات! آج میری گفتگو کا عنوان عدل و انصاف ہے۔ عدل قرآن کریم کی اصطلاح ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَان (سورۃ النحل: ۹۰) کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی میں بھی ایک اسم "عادل" ہے یعنی اللہ تعالیٰ عدل کرنے والے ہیں۔ اور جناب نبی کریم ﷺ کے اسماء میں بھی ایک اسم "عادل" ہے یعنی رسول اللہ ﷺ بھی عدل کے پیکر تھے، عدل کرنے والے تھے۔ ہر چیز کا حق ادا کرنے کو عدل کہتے ہیں۔ عدل کے مقابلے میں ظلم کا لفظ آتا ہے۔ ظلم کہتے ہیں کسی کے ساتھ ناحق سلوک کرنے کو، کسی کے حق کو ضبط کرنا یا کسی کا حق دوسرے کو دے دینا۔ لغوی اصطلاح میں وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ ظلم کا معنیٰ ہے کسی چیز کو اس کے اصل مقام کے بجائے کسی دوسری جگہ پر رکھنا۔ اسی طرح ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنے کو عدل کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عادل ہیں، جناب نبی کریم ﷺ عادل ہیں اور ہمیں بھی عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمیں یہ تلقین کی گئی ہے کہ ہم عدل کریں اور ظلم نہ کریں۔ جس طرح عدل کا دائرہ بہت وسیع ہے اسی طرح ظلم کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، حقوق کا دائرہ جتنا وسیع ہے عدل و انصاف کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ صفاتِ حمیدہ میں جتنی بھی عمدہ صفات ہیں جناب رسول اللہ ﷺ پوری دنیا میں ان صفات کے سب سے بڑے مظہر ہیں، اسی طرح عدل میں بھی جناب نبی کریم ﷺ مخلوقات میں سب سے بڑے عادل ہیں۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ غزوۂ حنین کے موقع پر غنیمت کا بہت زیادہ مالِ مسلمانوں کے ہاتھ آیا، یہ مال بہت قسموں میں

تھا جس میں بکریاں، اونٹ، سونا، چاندی اور دیگر بہت سا سامان تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ مال مجاہدین میں تقسیم کیا لیکن جو نئے نئے مسلمان ہونے والے عرب قبیلوں کے سردار تھے ان کو زیادہ دیا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ مانوس کیا جائے کہ یہ اپنے قبیلوں کے سردار تھے اور اسلام کی ظاہری شان و شوکت دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ اس پر ایک آدمی ذوالخویصرہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ منافقین میں سے تھا اس نے اعتراض کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس تقسیم میں تو عدل کا لحاظ نہیں رکھا گیا، حالانکہ حضور ﷺ نے امت کی ضرورت کے پیش نظر ایک مصلحت کے تحت یہ تقسیم فرمائی تھی۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ کسی نے ذوالخویصرہ کی یہ بات رسول اللہ ﷺ کو بتا دی کہ یا رسول اللہ ﷺ فلاں شخص نے یہ بات کہی ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے ایک جملہ فرمایا من یعدل اذ لم اعدل کہ اگر میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون عدل کرے گا؟ چنانچہ یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ مخلوقات میں سب سے زیادہ عدل کرنے والے ہیں۔ حضور ﷺ نے عدل اور ظلم کا تقابل بہت وسیع مفہوم میں بیان فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عدل

ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ظلم نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عدل کرو اور ظلم نہ کرو۔ اب اللہ تعالیٰ کے ساتھ کون ظلم کر سکتا ہے؟ ہمارے ہاں ظلم کا معنیٰ محدود ہے کیونکہ ہم ظلم کا معنیٰ یہ لیتے ہیں کہ کسی کے ساتھ زیادتی یا ناانصافی کا معاملہ کیا جائے لیکن جناب نبی کریم ﷺ نے اسے وسیع مفہوم میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عدل کیا ہے اس کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (سورۃ الانعام: ۸۲) کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس نہ ہونے دیا ان کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت پر ہوں گے۔ یعنی ایمان کے ساتھ اگر ظلم خلط ملط ہو گیا تو پھر امن اور ہدایت نہیں ہے اور اگر ایمان کے ساتھ ظلم کا اختلاط نہیں ہے تو پھر نجات بھی ہے اور ہدایت بھی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایمان کی قبولیت کی شرط یہ قرار پائی کہ ایمان کے ساتھ ظلم شامل نہ ہونے پائے۔ اس آیت

کریمہ کے متعلق صحابہ کرامؓ پریشان ہوگئے کہ یہ تو بہت سخت شرط ہے، ان کے ذہنوں میں ظلم کا عام مفہوم تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ اس آیت سے گھر کے افراد سے، رشتہ داروں سے، دوست احباب سے اور زندگی کے عام معاملات میں زیادتی اور کمی بیشی مراد ہے۔ چھوٹی موٹی زیادتی تو انسان سے ہوتی ہی رہتی ہے۔ صحابہ کرامؓ کو خطرہ لاحق ہوگیا کہ اگر آپس کے حقوق میں کمی بیشی نجات کی شرط قرار پائی ہے تو پھر کسی کا بھی ایمان قبول نہیں ہوگا۔

چنانچہ بعض صحابہ کرامؓ آپس میں اکٹھے ہوئے اور چہ میگوئیاں ہوئیں، پھر چند صحابہؓ مل کر جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ ﷺ ھلکنا ہم تو مارے گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا ہوا؟ صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی مذکورہ آیت کے متعلق بتایا کہ ایمان کی قبولیت کی بہت سخت شرط لگ گئی ہے۔ پھر کہا کہ اینا لم یظلم یا رسول اللہ کہ یارسول اللہ ہم میں سے کون ہے جس سے تھوڑی بہت زیادتی نہیں ہو جاتی۔ انبیاء کرام تو معصوم ہوتے ہیں لیکن عام انسانوں سے معاملات میں کہیں نہ کہیں کمی بیشی ہو ہی جاتی ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی پریشانی بجا ہے لیکن تم اس آیت کا معنٰی غلط سمجھے ہو، اس آیت میں ظلم سے مراد وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ اس آیت میں ظلم سے مراد وہ ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا یَا بُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْم (سورۃ لقمان: ۱۳) کہ اے بیٹے! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

ایک ظلم وہ ہے جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے لیکن ایک ظلم وہ ہے جو انسان اپنے خالق سے کرے۔ کسی انسان کا حق مارنا تو ظلم ہے ہی، اللہ تعالیٰ کا حق مارنا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔ اب اگر اس آیت کا ترجمہ کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ شرک کو شامل نہ ہونے دیا تو ان کا ایمان قبول ہوگا اور وہ ہدایت پر ہوں گے۔ متقدمین کی پرانی اصطلاح میں توحید کو عدل کہا جاتا ہے۔ معتزلہ خود کو اہل العدل والتوحید کہتے تھے۔ توحید کا معنٰی ہے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو

شریک نہ ٹھہرانا، حتیٰ کہ بعض فرقے شرک کے وہم سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو بھی اس کی ذات کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔

اپنی ذات کے ساتھ عدل

ہمیں اپنے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا گیا، جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے نفس کے ساتھ بھی عدل کرو۔ بہت سی روایات ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اپنے ساتھ سختی کا ارادہ کیا تو حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک مرتبہ حضرت ابوالدرداءؓ کے ہاں مہمان ٹھہرے تو دیکھا کہ ان کے میزبان رات کو حسب ضرورت آرام کرنے اور اپنے گھر والوں کو وقت دینے کے بجائے ساری رات نماز میں کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہتے ہیں۔ اس پر حضرت سلمان فارسیؓ نے ان سے کہا ان لربك عليك حقًا، ولنفسك عليك حقًا، ولأهلك عليك حقًا، (وفي رواية: ولزورك عليك حقًا)، فأعط كل ذي حق حقه (بخاری، رقم۱۹۶۸) کہ تیرے رب کے بھی تجھ پر حق ہیں، تمہارے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، آنے جانے والے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔ حضور ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ صدق سلمان کہ سلمانؓ نے سچ بات کہی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے ارادہ کر لیا کہ ساری زندگی رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کروں گا اور ساری زندگی روزانہ ایک قرآن کریم پڑھوں گا۔ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ یہ اپنے اوپر ظلم ہے۔ تمہارے بدن کا تجھ پر حق ہے کہ اسے خوراک اور آرام دو، اور تمہاری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے کہ اسے نیند دو۔ چنانچہ اپنے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا گیا۔

اہل خانہ کے ساتھ عدل

گھر کے ماحول میں عدل کا حکم دیا گیا ہے، خود جناب نبی کریم ﷺ بھی اپنے گھر میں عدل برقرار رکھتے تھے۔ حضور ﷺ کی بیک وقت ۹ بیویاں تھیں جن کے حقوق میں

حضور ﷺ نے برابری کی۔ طبعی اُنس انسان کے اختیار میں نہیں ہے، جہاں حضور ﷺ نے دیکھا کہ یہ معاملہ میرے اختیار میں نہیں ہے تو وہاں فرما دیا اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَسْمِی فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تُوَاخِذْنِیْ فِیْمَا لَا اَمْلِکُ کہ اے اللہ! اپنی استطاعت کی حد تک میں برابر تقسیم کرتا ہوں، اس لیے جو بات میرے بس میں نہیں ہے اس میں میرا مواخذہ نہ کرنا۔ حضور ﷺ کا طبعی تعلق حضرت عائشہؓ سے زیادہ تھا لیکن ظاہری معاملات کی تقسیم تمام ازواج کے ساتھ برابر کی تھی، حتیٰ کہ جہاں ضرورت محسوس ہوتی وہاں اجازت لیتے تھے۔ عام ایام میں تو آپ ﷺ نے ازواج کے گھروں میں رات گزارنے کی باریاں مقرر کی ہوئی تھیں لیکن زندگی کے آخری ایام میں جب جناب نبی کریم ﷺ بیمار ہوئے تو یہ معمول قابل عمل نہ رہا۔ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات نے محسوس کیا کہ آپ ﷺ ایک ہی جگہ اپنی بیماری کا وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ انتظامی طور پر تو مشکل تھا ہی لیکن آپ ﷺ کی طبیعت کا بھی تقاضا تھا کہ ایک ہی جگہ بیماری کے ایام گزاروں جو کہ حضرت عائشہؓ کا حجرا تھا۔ چنانچہ تمام ازواج اکٹھی ہوئیں آپس میں مشورہ کیا اور پھر حضور ﷺ کو اس بات کی اجازت دی کہ یارسول اللہ! ہم اپنی باریوں کے دنوں سے دستبردار ہوتی ہیں تاکہ آپ ﷺ ایک ہی گھر میں اطمینان سے یہ وقت گزار سکیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری ایام بیماری کی حالت میں حضرت عائشہؓ کے حجرے میں گزارے۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے کہ یااللہ! جو میرے اختیار میں ہے ان میں تو میں برابر تقسیم کرتا ہوں لیکن جو چیز میرے اختیار میں نہیں ہے، جیسے طبعی میلان، یااللہ! مجھ سے اس کے بارے میں مواخذہ نہ کرنا۔

قرآن کریم نے جہاں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے وہاں ایک شرط بھی لگائی ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (سورۃ النساء: ۳) کہ جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں خطرہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی نکاح کرو۔ یعنی اگر دو شادیاں کر سکتے ہو تو کرو، تین شادیاں کر سکتے ہو تو کرو، حد یہ ہے کہ چار تک شادیاں کر سکتے ہو لیکن عدل اس کی شرط ہے۔ عدل کا معنیٰ ہے تمام معاملات میں برابری کرنا، ہر بیوی

کو اس کا پورا حق ادا کرنا اور کسی کو ترجیح نہ دینا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو معلق کر دیا یعنی اس کے حقوق ادا کرنے بند کر دیے تو قیامت کے دن اس کے جسم کا ایک حصہ مفلوج ہو گا۔ حقوق کا معاملہ صرف ازدواجی تعلقات نہیں ہیں بلکہ اس میں روزمرہ زندگی کے باقی حقوق بھی شامل ہیں، مثلاً خرچے میں اور کھانے پینے میں کمی بیشی کر دی کہ ایک بیوی کو بہتر دیا اور دوسری کو اس کے برابر نہیں دیا، یا پھر رہائش میں کمی بیشی کر دی کہ ایک کو تو اچھی رہائش دی لیکن دوسری کو اس معیار کی رہائش نہیں دی، یا عزت و توہین کے معاملات میں ایک کی عزت و وقار کا لحاظ ہے اور دوسری سے بے پرواہی ہے۔ غرض یہ کہ حقوق میں روزمرہ زندگی کی تمام ضروریات شامل ہیں، قرآن کریم نے بھی یہی شرط لگائی کہ اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہے کہ تم اپنی بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک بیوی تک ہی محدود رہو۔ دوسرے لفظوں میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت اس صورت میں ہے جب ایک آدمی سب بیویوں کے حقوق برابر ادا کر سکے۔ اگر آدمی یہ محسوس کرے کہ اس سے انصاف کا معاملہ نہیں ہو گا تو پھر ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت نہیں ہے۔ یہ میاں بیوی کے معاملے میں قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہے کہ اتنا ہی معاملہ اپنے ذمے لو جتنا بخوبی نبھا سکتے ہو۔

اولاد کے معاملے میں بھی عدل کا حکم دیا گیا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک صاحب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری اولاد میں سے ایک لڑکا ایک بیوی سے ہے جبکہ باقی دوسری بیویوں سے ہیں۔ میری بیوی تقاضا کر رہی ہے کہ میں اپنی جائیداد میں سے اپنے اس بیٹے کو حصہ دوں، میں اسے حصہ دینے پر تیار ہوں لیکن اس پر میں آپ ﷺ کو گواہ بنانا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ نے پوچھا، کیا تم نے باقی بیٹوں کو بھی جائیداد میں سے حصہ دیا ہے؟ اس نے کہا، یارسول اللہ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ظلم پر مجھے گواہ مت بناؤ۔ چنانچہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اپنی جان کے ساتھ، اپنے گھر کے ساتھ، سوسائٹی کے ساتھ، جس کا جو حق ہے وہ اسے ادا کرو، عدل اسی کا نام ہے۔ اگر کہیں حق تلفی ہو گی تو یہ ظلم شمار ہو گا۔

قانون کی نظر میں برابری

آج کے حالات میں ایک بات کا چرچا عام ہے کہ قانون کی نظر میں سب کے حقوق میں برابری ہونی چاہیے، یہ بات بھی عدل کے تقاضوں میں سے ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے یہی فرمایا ہے، بخاری شریف کی روایت کے مطابق قانون کی نظر میں سب کے برابر نہ ہونے کو سوسائٹی کی تباہی اور بربادی کا سبب بتایا گیا ہے۔ ایک مرتبہ یہودیوں کا ایک جوڑا بدکاری میں پکڑا گیا، یہودی مقدمہ لے کر حضور ﷺ کی عدالت میں آئے، جوڑا گرفتار تھا اور ان پر بدکاری کا جرم ثابت ہو گیا۔ آپ ﷺ نے یہودیوں سے پوچھا، یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاں اِس جرم کی سزا کیا ہے؟ تم یہودی ہو اور ایک شریعت کو مانتے ہو تمہارے ہاں بھی ایک قانون اور ضابطہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں اس جرم کی سزا یہ ہے کہ دونوں کے منہ کالے کیے جائیں اور گدھے پر بٹھا کر پورے شہر کا چکر لگایا جائے اور ساتھ مار پٹائی بھی کی جائے۔ حضرت عبد اللہ بن سلامؓ جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور اب مسلمان ہو چکے تھے، حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تورات میں اس جرم کی سزا یہی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یارسول اللہ! یہ لوگ غلط بیانی کر رہے ہیں کیونکہ تورات میں یہ سزا نہیں ہے بلکہ یہ سزا انہوں نے خود گھڑ لی ہے، تورات میں رجم یعنی سنگسار کی سزا ہے۔ لیکن جب ان لوگوں نے اصرار کیا کہ تورات میں یہی لکھا ہوا ہے جو ہم نے بتایا ہے تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تورات لے کر آؤ۔ چنانچہ مجلس میں تورات لائی گئی اور یہودی عالم سے کہا گیا کہ اس جرم کی سزا پڑھ کر سناؤ، اس نے اس سزا کے متعلق آیتیں اس طرح پڑھیں کہ درمیان کی آیت چھوڑ دی۔ حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے اس کی خیانت پکڑ لی اور کہا یا عدو اللہ! اقرأ هذا کہ اللہ کے دشمن یہ بھی تو پڑھ یہ کیا لکھا ہوا ہے۔ یہاں حضرت عبد اللہؓ بن سلام نے بتایا کہ یارسول اللہ! تورات میں اس جرم کی اصل سزا تو رجم ہی تھی لیکن جوں جوں زمانہ بدلا یہودی علماء نے اس سزا کے اطلاق میں خیانت کرنا شروع کر دی کہ جب کوئی غریب آدمی اس جرم میں پکڑا جاتا تو اسے سنگسار کر دیتے لیکن کوئی امیر اور صاحب ثروت آدمی پکڑا جاتا تو اس کو نرم سی سزا دے کر خانہ پری کر دیتے۔

پنجابی کی ایک کہاوت کے مطابق اسے "ہل لمبا ڈال لینا" کہتے ہیں۔ کہاوت یہ ہے کہ کسی گاؤں کے ایک مولوی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ فلاں جرم کی سزا کیا ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ ہل (زمین کھودنے والا زراعتی آلہ) زمین پر کھڑا کر کے اس کے برابر روٹیوں کا ڈھیر لگایا جائے اور پھر وہ ڈھیر صدقہ کر دیا جائے۔ اس شخص نے بتایا کہ مولوی صاحب! یہ جرم آپ کے بیٹے نے کیا ہے۔ مولوی صاحب فوراً بولے کہ اگر ہل زمین پر لٹا کر اس کے برابر روٹیوں کا ڈھیر اکٹھا کیا جائے تو بھی ٹھیک ہے۔ تو حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے بتایا کہ یہودیوں کا یہ طرز عمل تھا کہ عام آدمی کو تو اصل سزا دیتے لیکن اثر و رسوخ والے کی سزا میں ترمیم کر دیتے۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے ایک بات فرمائی جو کہ کسی بھی معاشرے میں انصاف کی بنیاد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں یہ بات آجائے کہ عام آدمی جرم کرے تو سزا مختلف ہو اور کوئی بڑا آدمی جرم کرے تو سزا مختلف ہو، پھر اس قوم کو تباہی سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایسی قوم کی تباہی کا آغاز ہی یہیں سے ہوتا ہے کہ قانون کی نظر میں اونچ نیچ آجائے۔

رسول اللہ ﷺ اور عدل

اس معاملہ میں خود جناب نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ کیا تھی؟ مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے صحابہ کرامؓ کی مجلس لگی ہوئی تھی، ایک صحابیؓ آکر بیٹھے جنہوں نے جسم پر صرف ایک ہی چادر باندھی ہوئی تھی اور ان کی کمر ننگی تھی۔ اس زمانے میں دو چادریں کم ہی لوگوں کو میسر ہوتی تھیں، زیادہ تر لوگوں کے پاس جسم ڈھانپنے کے لیے صرف ایک ہی چادر ہوا کرتی تھی۔ حضور ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی آپ ﷺ نے بیٹھے بیٹھے بے تکلفی سے ان صحابیؓ کی ننگی کمر پر چھڑی مار دی۔ حضور ﷺ کا ہاتھ ذرا سخت لگ گیا اور صحابیؓ کی کمر پر خراشیں آگئیں۔ صحابیؓ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! آپ نے مجھے چھڑی ماری ہے میں تو اس کا بدلہ لوں گا۔ آج کے زمانے میں تو سربراہ مملکت کو عدالت میں ویسے بھی نہیں طلب کیا جا سکتا اور جہاں طلب کیا جا سکتا ہے وہاں بھی حکومتی اثر و رسوخ عدالتی کاروائی میں آڑے آجاتا ہے۔ دنیا بھر میں یہ بات عام ہے

کہ بادشاہ ہو یا سربراہِ مملکت جب تک وہ اپنے منصب پر فائز رہتا ہے عدالت میں طلبی سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی بات حضور ﷺ کی مجلس میں بھی کہی جا سکتی تھی کہ بھئی حضور ﷺ سے بدلے کا حق مانگنے کی یہ جسارت تم نے کیسے کی! حضور ﷺ سے بڑا وی آئی پی اس دنیا میں کون ہو گا؟ لیکن جناب نبی کریم ﷺ نے صحابی کے مطالبے پر کیا ردعمل ظاہر کیا؟ آپ ﷺ نے چھڑی ان صحابی کے ہاتھ میں دے کر اپنی کمر سامنے کر دی، آپ ﷺ نے اس بارے میں کوئی عذر پیش نہیں کیا اور کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور میں حاکمِ وقت ہوں اس لیے کوئی مجھ سے بدلہ لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ حالانکہ کوئی بات بھی امتیاز کی ایسی نہیں ہے جو حضور ﷺ میں نہیں تھی۔ ان صاحب نے چھڑی پکڑی اور کہا کہ یارسول اللہ! بدلہ برابر نہیں ہے اس لیے کہ آپ نے میری ننگی کمر پر چھڑی ماری ہے جبکہ آپ نے کرتا پہن رکھا ہے، آپ ﷺ پہلے اپنا کرتا اتاریے۔ ہم تو آج کے ماحول میں اپنے پیر و مرشد کے لیے، اپنے استاد کے لیے ایسی بات برداشت نہیں کرتے۔ حضور ﷺ مسکرائے کرتا اتارا اور کمر سامنے کر دی، ان صحابیؓ نے چھڑی پھینکی اور حضور ﷺ سے لپٹ گئے اور کہا کہ یارسول اللہ! وہ ہاتھ ٹوٹ نہ جائیں جو آپ پر اٹھیں، میں تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے جسم سے جسم ملانے کا بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن جناب نبی کریم ﷺ نے عدل کا تقاضا پورا کیا اور یہ تصور دیا کہ قانون کی نظر میں انصاف سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے چوری کے ایک مقدمہ میں فاطمہ مخزومیہ کے حوالے سے فرمایا کہ کیا تم ایک عورت کی اس لیے سفارش کرتے ہو کہ وہ بڑے خاندان کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔ اب حضور ﷺ سے بڑا خاندان کس کا ہو سکتا ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ جرم کی سزا یکساں ہے چاہے کسی بڑے خاندان کا فرد جرم کرے یا کسی چھوٹے خاندان کا۔ معاشرے میں عدل قائم ہو گا تو مساوات کا ماحول پیدا ہو گا۔

انبیاء کرامؑ کے ساتھ عدل

یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے درجات میں ترجیحات رکھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۳) کہ یہ رسول ہیں، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرامؑ میں سب سے افضل جناب نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے، پھر دیگر بڑے انبیاء جیسے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت نوحؑ اور ان کے بعد دوسرے انبیاء ورسول ہیں۔ لیکن یہ درجہ بندی ترازو پر تولنے کے لیے نہیں ہے کہ یہ دیکھنا شروع کر دیا جائے کہ کون انیس ہے اور کون بیس ہے۔ بسا اوقات ہم ایسا کر دیتے ہیں لیکن ایسے موازنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق دو واقعات بخاری شریف میں آتے ہیں۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ دو ساتھیوں میں انبیاء کرامؑ کے متعلق کچھ اس طرح گفتگو ہو رہی تھی کہ فلاں موقع پر حضرت یونسؑ تھے اس لیے ایسا ہوا اگر ہمارے پیغمبر ہوتے تو معاملہ یوں نہ ہوتا بلکہ مختلف ہوتا۔ حضور ﷺ کو یہ بات پتہ چلی تو آپ ﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا لا تفضلونی علی یونس ابن متی کہ مجھے یونس علیہ السلام پر فضیلت مت دو۔ یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے انبیاء پر اس طرح تقابل کر کے فضیلت مت دو کہ یہ بات فلاں نبی میں نہیں تھی لیکن رسول اللہ ﷺ میں ہے۔ ایک ہے ترجیح کہ حضور ﷺ کا درجہ سب انبیاء سے افضل ہے لیکن ایک ہے تقابل کہ آمنے سامنے رکھ کر موازنہ کیا جائے کہ یہ بات فلاں نبی میں نہیں تھی جبکہ فلاں نبی میں تھی۔ کیونکہ جس نبی کے بارے میں یہ بات کہیں گے کہ اس میں فلاں صفت نہیں تھی، اس سے اہانت کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی نبیؑ کے بارے میں اہانت کا کوئی پہلو بھی ہو اس سے ایمان ضائع ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے حوالے سے ایک واقعہ مسلم شریف میں ہے۔ ایک زمانے میں مدینہ منورہ میں یہودی بھی رہتے تھے اور مسلمان بھی۔ ایک یہودی اور مسلمان بازار میں

آپس میں جھگڑ پڑے، دونوں آپس میں کوئی سودا کر رہے تھے کہ یہودی نے یہ کہہ کر قسم اٹھائی والذی فضل موسی علی الانبیاء کہ اس پروردگار کی قسم جس نے حضرت موسیٰؑ کو سارے انبیاء پر فضیلت دی۔ مسلمان کو اس بات پر غصہ آیا کہ اس یہودی نے حضرت موسیٰؑ کو ہمارے پیغمبر رسول اللہ ﷺ سے افضل کہا ہے، اس نے یہودی کو تھپڑ مار دیا۔ مسلمان نے کہا کہ انبیاء پر فضیلت تو جناب نبی کریم ﷺ کو ہے۔ اس پر یہودی استغاثہ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا یا محمد! آپ کے ساتھی نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیوں تھپڑ مارا ہے؟ اس نے معاملہ بتایا تو اس پر حضور ﷺ اپنے ساتھی سے ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تقابل کی فضا قائم کر کے ہم انبیاء کا موازنہ مت کرو۔ حضور ﷺ نے اسے بھی عدل کا تقاضا قرار دیا۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ حق کے تعین میں کسی کے ساتھ زیادتی مت کرو۔ قرآن و حدیث میں عدل کے سینکڑوں پہلو بیان ہوئے ہیں جن میں سے جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے چند ایک پہلو میں نے آپ کی خدمت میں ذکر کر دیے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

عوامی نمائندگی اور سیرتِ طیبہ ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

انتخابات کے موقع پر عام طور پر یہ سوال زیر بحث آجاتا ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے اس پر اظہار خیال کا سلسلہ بھی چلتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں عوام کی رائے اور ان کے نمائندوں کے چناؤ کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس سلسلہ میں کوئی راہنمائی ملتی ہے؟ آج اس حوالہ سے کچھ گزارش کرنے کا ارادہ ہے۔

یہ بات تو معروف و مسلم ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جن معاملات میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی ان میں لوگوں سے مشورہ کر کے فیصلے کرتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں سیرت النبی ﷺ کے واقعات میں موجود ہیں جن میں سے دو کا ذکر کروں گا۔ ایک یہ کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فیصلہ اپنے ساتھیوں کے مشورہ کے ساتھ کیا اور دوسرا یہ کہ غزوہ احد میں مدینہ منورہ کے اندر رہ کر دفاعی جنگ لڑنے کی بجائے باہر جا کر کھلے میدان میں لڑنے کا فیصلہ بھی عوامی مشاورت سے کیا گیا اور اس موقع پر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مجلس کی عمومی رائے خود حضور ﷺ کی ذاتی رائے سے ہم آہنگ نہیں تھی مگر آپ ﷺ نے اپنی رائے ترک کر کے ساتھیوں کی رائے پر فیصلہ کیا۔

غیر منصوص مسائل میں عمومی مشاورت کا یہ حکم قرآن کریم میں موجود ہے۔ ایک جگہ مسلم سوسائٹی کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" ان کے معاملات باہمی مشاورت کے ساتھ طے ہوتے ہیں۔ اور دوسرے مقام پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ "وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ" آپ اپنے ساتھیوں کو مشورہ میں شریک کیا کریں۔ جبکہ اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے

دور میں ایسی کسی مشاورت میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ ایسے موقع پر کچھ مخصوص لوگوں کو مشورہ کے لیے الگ کیا گیا ہو بلکہ جو لوگ بھی اس موقع پر موجود تھے وہ اس میں شریک ہوئے ہیں۔ مگر دو مواقع ایسے ہیں کہ جن لوگوں سے مشاورت مقصود ہے یا انہیں اعتماد میں لینا ضروری سمجھا گیا ان کی کثرت کی وجہ سے سب کو شریک کرنا مشکل دکھائی دیا تو اس عمومی مشاورت میں نمائندوں کو ذریعہ بنایا گیا۔

ایک موقع تو ہجرت کا ہے کہ جناب رسول اکرم ﷺ نے انصار مدینہ کے دونوں قبیلوں بنو اوس اور بنو خزرج سے ہجرت اور اس کے بعد کے معاملات کے تعین کے لیے کم و بیش دو سال تک ان سے مذاکرات کیے جو بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے عنوان سے تاریخ میں مذکور ہیں۔ جبکہ ان قبائل سے عمومی بات چیت کے لیے آنحضرت ﷺ نے بارہ نقیب مقرر کیے جنہوں نے اپنے قبائل اور حضور ﷺ کے درمیان نمائندوں کی حیثیت سے کام کیا اور ہجرت سے قبل یثرب کے عمومی ماحول کو آپ ﷺ کی تشریف آوری کے لیے ہموار کیا۔ بلکہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس اور خزرج کے سرداروں سے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے بارہ نقیب مقرر کیے تھے جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اسی طرح میں بھی تم پر بارہ نقیب مقرر کر رہا ہوں۔ چنانچہ ان بارہ نقیبوں نے مسلسل دو سال تک علاقہ میں وہ محنت کی جس کے نتیجے میں جناب نبی اکرم ﷺ کے آتے ہی "ریاست مدینہ" قائم ہوئی اور آپ ﷺ کو اس کا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا گیا۔

دوسرا واقعہ غزوہ حنین کے بعد کا ہے کہ حنین کی جنگ میں بنو ہوازن کو شکست ہوئی اور ان کے بہت سے افراد اور اموال مسلمان فاتحین کے قبضہ میں آئے جنہیں بطور غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے آنحضرت ﷺ نے کافی دن انتظار کیا کہ شاید بنو ہوازن آکر اسلام قبول کر لیں تو ان کے اموال اور قیدی انہیں واپس کر دیے جائیں۔ مگر بہت دنوں تک انتظار کے بعد بھی جب وہ نہیں آئے تو نبی کریم ﷺ نے اموال اور قیدی دونوں مجاہدین میں تقسیم کر دیے۔ لیکن جب یہ ہو چکا تو بنو ہوازن کا وفد حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرمائش کی کہ ہمارے اموال اور قیدی ہمیں واپس کر دیے جائیں جس پر

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بہت دنوں تک تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں اور اب وہ سب کچھ تقسیم کر چکا ہوں جس کے بعد واپسی کا اختیار میرے پاس نہیں رہا۔ البتہ اگر تم اموال یا قیدیوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو تو میں اس کے لیے لشکر کے لوگوں سے بات کر سکتا ہوں۔ بنو ہوازن کے وفد نے کہا کہ اگر یہ صورتحال ہے تو ہم اموال چھوڑ دیتے ہیں مگر ہمارے افراد جو قیدی ہیں وہ واپس کر دیے جائیں۔ اس پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لشکر کو جمع کیا جس کی تعداد اس وقت بارہ ہزار کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے مسئلہ رکھا کہ میں نے قیدی واپس کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اس لیے قیدی تو واپس کر دو مگر تمہاری مرضی ہے ویسے ہی چھوڑ دو یا اس کے عوض قیدی لے کر چھوڑو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی کسی جنگ میں جو قیدی بھی آئے ان میں سے پہلے تمہیں ان قیدیوں کے عوض قیدی واپس کروں گا۔ اس پر مجمع میں سے اجتماعی آواز آئی کہ یا رسول اللہ! ہم سب بخوشی یہ قیدی واپس کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس اجتماعی آواز سے ہمیں یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ تم میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں اس لیے اپنے اپنے خیموں میں واپس جاؤ "حتی یرفع الینا عرفاءکم امرکم" یہاں تک کہ تمہارے نمائندے ہمیں تمہاری رائے سے آگاہ کر دیں۔ چنانچہ اس اجتماعی آواز پر فیصلہ کرنے کی بجائے جناب نبی اکرم ﷺ نے لشکر کی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعے حاصل کی اور پھر قیدیوں کی واپسی کا فیصلہ فرمایا۔

اس حوالہ سے ایک جگہ گفتگو ہوئی تو ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہجرت کے موقع پر "نقباء" کا تقرر تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا مگر ان "عرفاء" کا تقرر کون کرے گا؟ میں نے عرض کیا کہ روایت میں تو اس کا ذکر نہیں ہے مگر سادہ سی بات ہے کہ جب کسی نے میری رائے کی نمائندگی کرنی ہے تو اس کا تقرر بھی مجھے ہی کرنا ہو گا۔ اس لیے اجتماعی معاملات میں عوام سے براہ راست رائے لینے یا نمائندوں کے ذریعے انہیں مشاورت میں شریک کرنے کی دونوں صورتیں سیرت طیبہ سے ہمیں ملتی ہیں اور اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عورتوں کے حقوق اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

عورتوں کے حقوق، آج کی دنیا کے موضوعات میں سے ایک بہت اہم موضوع ہے۔ اسلام میں عورت کو رائے دینے کا حق ہے یا نہیں، تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے یا نہیں، اسے مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں یا نہیں اور یہ کہ عورت کو معاشرے کے اندر عام زندگی کے معاملات میں شرکت کا مساوی موقع ملنا چاہیے یا نہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے کئی پہلوؤں پر گفتگو ہو سکتی ہے لیکن میں چند ایک ضروری نکات پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین سنت کے چند واقعات کے حوالے سے کچھ ضروری گزارشات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

زندگی کا حق

ہمارے ہاں ”دیوان حماسہ“ کے نام سے عربی ادب کی ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے، دینی اداروں کے نصاب میں بھی یہ کتاب ہے اور ایم اے عربی کے نصاب میں بھی یہ کتاب شامل ہے۔ یہ عربی ادب کی کلاسیکل کتابوں میں سے ہے جس میں مختلف شعراء کا کلام ہے، اس میں ایک شاعر کا قصیدہ مذکور ہے جس کا ایک مصرعہ عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک عرب سردار سے کسی نے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو اسے یہ رشتہ مانگنا پسند نہ آیا، اس نے رشتہ مانگنے والے کو اشعار میں جواب دیا جن کا ایک مصرعہ یہ ہے:

غدا الناس مذ قام النبی الجوار با۔

کہ جب سے یہ نبی آیا ہے، دنیا میں ہر طرف۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں ہو گئی ہیں۔

اس لیے مجھ سے رشتہ مانگنے کیوں آئے ہو، جاؤ کسی اور سے مانگو، اب تو رشتوں کی بہتات ہوگئی ہے۔ یعنی اس عرب سردار کا دورِ جاہلیت کی اس رسم بد کی طرف اشارہ تھا جو رسول اللہ ﷺ نے آکر عرب معاشرے میں سے ختم کر دی تھی۔ اکثر عرب قبائل میں یہ رواج تھا کہ لوگ بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (سورۃ النحل: ۵۸) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری دی جائے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غمگین ہو جاتا ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے یہ رسم بد ختم کی اور عورت کے لیے زندگی کا حق بحال کیا، اسلام نے عورت کو زندہ رہنے کا حق دلوایا۔

عرب کے بڑے شعراء میں سے ایک شاعر ہیں فرزدق، ان کے دادا صعصعہ اپنا واقعہ ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میرا اونٹ گم ہوگیا تو میں اس کی تلاش میں جنگل کی طرف نکل گیا، اتنے میں رات ہوگئی۔ میں ایک خیمے کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ سردی سے بچنے کے لیے ایک آدمی آگ سینک رہا تھا، میں بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اسے بتایا کہ میرا اونٹ گم ہوگیا ہے جس کی تلاش میں رات ہوگئی ہے اس لیے میں آج رات تمہارے پاس ہی رہوں گا اور پھر کل نکل کر پھر اپنے اونٹ کو تلاش کروں گا۔ لیکن تم یہاں باہر کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا کہ میری بیوی اندر خیمے میں ہے جس کے ہاں ولادت متوقع ہے اور میں یہاں باہر اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ صعصعہ کہتے ہیں کہ میرے بیٹھے بیٹھے اس نے اندر آواز دی کہ اگر بیٹا پیدا ہوا تو مجھے بتانا لیکن اگر بیٹی ہوئی تو خیمے کے پچھلے دروازے سے نکل کر اسے گڑھے میں دبا دینا۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے آواز آئی کہ بچی پیدا ہوئی ہے۔ صعصعہ کہتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ یہ لوگ تو اس بچی کو زندہ دفن کر دیں گے، میں نے اس آدمی کو پیشکش کی کہ اگر تم یہ بچی مجھے دے دو تو میں اس کے عوض تمہیں ایک اونٹ دوں گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اونٹ کے عوض بچی بیچ دی۔ صعصعہ کہتے ہیں کہ میں اس بچی کو لے کر آگیا اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایسی بات ڈالی کہ جہاں کہیں مجھے پتہ چلتا کہ کسی

خاندان میں بچی ہوئی تو وہ اسے دفن کر دیں گے میں جا کر اونٹ کے عوض بچی لے آتا۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے اسلام قبول کیا تو میری حویلی میں تین سو بچیوں کی پرورش ہو رہی تھی۔

ہمارے معاشرے میں یہ بات اب بھی ہے کہ بچے کی ولادت پر جیسی خوشی ہوتی ہے بچی کی ولادت پر ویسی خوشی نہیں ہوتی۔ میں نے کچھ عرصہ قبل یہ خبر پڑھی کہ انڈین گورنمنٹ نے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ ماں کے پیٹ میں بچے کی جنس معلوم کرنے پر پابندی لگا دی، اس لیے کہ جب شادی شدہ جوڑے کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ بچی پیدا ہو گی تو وہ حمل گرا دیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں کوئی بیٹا جوان نہیں ہوا جبکہ بیٹیاں ساری جوان ہوئیں اور سب کی شادیاں ہوئیں۔ حضور ﷺ نے ان کی پرورش کر کے دنیا کو دکھایا کہ بچیوں کے ساتھ معاملہ کیسے کیا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے ہاں بیٹے پیدا ہوئے لیکن بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ بچیاں سب جوان ہوئیں حضور ﷺ نے ان کے ناز اٹھائے اور یہ بتایا کہ بچیوں کے سر پر دستِ شفقت کیسے رکھا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت تھی کہ اس معاشرے میں جہاں بچیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں وہاں اللہ کے پیغمبر کے گھر میں چار بچیوں کی پرورش کر کے اور ان کی شادیاں کر کے ایک نمونہ قائم کیا کہ لڑکیاں اس سلوک کی مستحق ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ جب آپ ﷺ سے ملنے آتی تھیں تو آپ ﷺ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کو بٹھانے کے لیے اپنی چادر بچھا دیا کرتے تھے۔ حضرت رقیہ جب سختؓ بیمار تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو جنگ بدر میں شریک ہونے سے روک دیا اور حکم دیا کہ گھر میں اپنی اہلیہ کی تیمارداری کرو۔ حضور ﷺ نے دنیا کو یہ نمونہ دکھایا کہ بچی اور باپ کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔

تعلیم کا حق

جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم و مسلمة کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازمی ہے۔ حصولِ علم کی اہمیت مرد و عورت کے لیے یکساں ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ سے مرد و عورت دونوں نے تعلیم

حاصل کی اور پھر دونوں نے آگے امت تک یہ علم منتقل کیا۔ محدثین کرام جب روایات بیان کرتے ہیں تو مرد اور عورتوں کی روایات کو یکساں حیثیت دیتے ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یعنی جو درجہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی روایت کا ہے وہی درجہ ان کی بیٹی حضرت عائشہؓ کی روایت کا بھی ہے، اور جو درجہ حضرت عمرؓ کی روایت کا ہے وہی درجہ ان کی بیٹی حضرت حفصہؓ کی روایت کا بھی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں خواتین نے جس طرح تعلیم حاصل کر کے آگے دوسروں کو تعلیم دی حضرت عائشہؓ اس کی بہترین مثال ہیں۔ حضرت عائشہؓ براہ راست جناب رسول اللہ ﷺ کی شاگرد تھیں، حضور ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ کے جو بڑے بڑے علمی مراکز قائم ہوئے ان میں ایک بڑا علمی مرکز حضرت عائشہؓ کا گھر بھی تھا۔ حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ کی رحلت کے بعد تقریباً چالیس سال تک تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ جاری رکھا، ان کا علمی مقام یہ تھا کہ وہ خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی فتویٰ دیا کرتی تھیں اور بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ پر نقد کیا کرتی تھیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو خود فقیہ ہیں اور حدیث کے بڑے راویوں میں سے ہیں، فرماتے ہیں ما اشکل علینا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم حدیث قط فسالنا عائشۃ الا وجدنا عندھا علما کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم صحابہ کسی مشکل میں پھنسے ہوں اور حضرت عائشہؓ کے پاس راہنمائی اور علم نہ ملا ہو۔ ابن سعد میں ہے کہ یسئلھا الاکابر من اصحاب رسول اللہ ﷺ ان سے بڑے بڑے صحابہ آکر مسئل دریافت کیا کرتے تھے۔

اسلامی تاریخ میں تعلیم و تعلم کے حوالے سے، معاملات میں راہنمائی کے حوالے سے اور لوگوں تک علم پہنچانے کے حوالے سے خواتین کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ حضرت امام مالک بن انسؒ کی بیٹی اس مقام کی محدثہ تھیں کہ وہ اپنے والد کی درسگاہ کے ایک طرف پردے کے پیچھے بیٹھی ہوتی تھیں اور جب امام صاحبؒ کے شاگرد پڑھنے میں کوئی غلطی کر جاتے، جو امام مالکؒ کی توجہ میں نہ آتی، تو ان کی بیٹی پردے کے پیچھے سے تپائی پر ہاتھ مار کر ان کو توجہ دلاتی کہ پڑھنے والے سے غلطی ہو گئی ہے لہٰذا دوبارہ پڑھوایا جائے۔ اسی طرح حضرت امام شافعیؒ کی والدہ ایک مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہوئیں، ان کے ساتھ ایک دوسری عورت گواہ بھی

تھی۔ مقدمے کے دوران قاضی نے کہا کہ میں تم دونوں سے الگ الگ گواہی لوں گا تا کہ میں جان سکوں کہ تمہارے بیانات آپس میں ملتے ہیں۔ امام شافعیؒ کی والدہ نے قاضی سے کہا کہ قرآن کی رو سے آپ ایسا نہیں کر سکتے اس لیے کہ قرآن نے دو عورتوں کی گواہی کی وجہ ہی یہ بتائی ہے کہ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰهُمَا الۡاُخۡرٰى (سورۃ البقرہ: ۲۸۲) تا کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا دے۔ چنانچہ ہمارے اچھے زمانوں میں عورتوں کے علم کا یہ معیار ہوتا تھا کہ ایک خاتون عدالت کے اندر قاضی کے سامنے قرآن کریم سے دلیل پیش کر کے اسے اپنا طریقہ کار تبدیل کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، انہوں نے اسلامی تاریخ میں سے تقریباً آٹھ ہزار محدثات کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ یہ الوفاء فی اخبار النساء کے نام سے چالیس جلدوں پر مشتمل کتاب ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور مسلم تاریخ میں تعلیم و تعلم کے حوالے سے عورتوں کا کیا کردار رہا ہے۔

رائے کا حق

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں ہماری گھریلو عورتوں کو رائے دینے کا اور کسی معاملے میں آواز اٹھانے کا حق نہیں ہوتا تھا۔ ہم مرد جو فیصلہ کر دیتے تھے بس وہی آخری ہوتا تھا، عورت سے اس کے متعلق کوئی مشورہ نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن جب ہم ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں کا ماحول ذرا مختلف تھا، یہاں عورتیں گھر کے معاملات میں رائے دیا کرتی تھیں کہ یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہونی چاہیے۔ خاوند کوئی غلط بات کرتا تھا تو بیوی خاوند کو ٹوک دیتی تھی کہ یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری بیوی نے گھر کی کسی بات پر مجھے ٹوک دیا کہ یہ بات ایسے نہیں بلکہ ویسے ہونی چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ میں تو ہکا بکا رہ گیا کہ یہ کیا ہو گیا، میں نے کہا کہ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے کہ تم مجھے مشورہ دے رہی ہو اور مجھے ٹوک رہی ہو۔ وہ کہنے لگی کہ میرا بھی یہ حق ہے کہ میں معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات ناگوار گزری کہ عورتوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ رائے اور مشورہ دیں۔ فرماتے ہیں

کہ اس پر میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ حضرت میرے ساتھ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ایسا تو رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی ازواج مطہرات حضور ﷺ کو مشورہ بھی دیتی ہیں اور آپ ﷺ کو معاملات میں جواب بھی دیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حیرانی سے پوچھا کہ کیا ازواجِ مطہرات حضور ﷺ کو جواب بھی دیتی ہیں! ان کی اہلیہ نے کہا کہ ہاں بالکل۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے اٹھا اور بھاگا بھاگا اپنی بیٹی اور حضور ﷺ کی زوجہ حضرت حفصہؓ کے پاس پہنچ گیا۔ پوچھا کہ حفصہ! میں نے سنا ہے کہ تم گھر میں رسول اللہ ﷺ کو مشورہ بھی دیتی ہو اور کسی معاملے میں جواب بھی دیتی ہو۔ انہوں نے بتایا کہ ہاں ساری ازواج ایسا کرتی ہیں۔ اب حضرت عمرؓ کے ذہن میں ایک بات تو یہ تھی مکہ مکرمہ میں عورتیں ایسا نہیں کرتی تھیں، دوسری بات یہ ذہن میں تھی کہ ان کے خاوند تو رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے کہا کہ بیٹی! ایسا نہ کیا کرو تم شاید عائشہؓ کو دیکھ کر ایسا کرتی ہو، عائشہؓ کی بات اور ہے ایسا نہ ہو کہ حضور ﷺ تم سے ناراض ہو جائیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے اور پوچھا کہ کیا ازواج ایسا کرتی ہیں، انہوں نے بتایا کہ ہاں ایسا ہوتا ہے کبھی حضور ﷺ ہم سے ناراض ہو جاتے ہیں کبھی ہم میں سے کوئی حضور ﷺ سے ناراض ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں حضور ﷺ کی اہلیہ ام سلمہؓ کے پاس گیا، حضرت ام سلمہؓ حضرت عمرؓ کی کزن بھی تھیں اور نسبتاً بڑی عمر کی سمجھدار خاتون تھیں۔ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ ان سے ذرا سنجیدگی سے بات کرتا ہوں، حضرت عمرؓ نے ام سلمہؓ سے پوچھا کہ مجھے یہ شکایت ملی ہے اور میرے لیے یہ ایک نئی بات ہے کیا ایسا ہوتا ہے؟ انہوں نے تصدیق کی کہ ہاں ایسا ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی بندیو! ایسا مت کیا کرو۔ ام سلمہؓ الٹا حضرت عمرؓ سے جھگڑ پڑیں اور کہنے لگیں عمر! تم ہر معاملے میں مداخلت کرتے ہو، اب میاں بیوی کے معاملے میں بھی دخل اندازی کرنے آگئے ہو۔ ہم جانیں اور حضور ﷺ جانیں، تمہارا اِس میں کیا کام ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے اٹھا اور جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! آج تو میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب سارا قصہ سنایا تو حضور ﷺ

خاموشی سے سنتے رہے اور جب حضرت عمرؓ نے یہ بتایا کہ ام سلمہؓ نے تو مجھے ڈانٹ دیا ہے تو حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ آخر ام سلمہؓ ہے۔

اسلام نے دورِ جاہلیت کے عرب معاشرے کی حالت کیسے بدلی اور نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحابؓ کی تعلیم و تربیت کس انداز سے کی۔ یہی حضرت عمر فاروقؓ جو فرماتے تھے کہ عورت کے لیے رائے کا حق ماننا میرے لیے حیرانگی اور تعجب کی بات تھی، انہی کے متعلق تفسیر ابن کثیر میں ایک واقعہ نقل ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں مسجد نبوی میں جمعے کے خطبے کے دوران ایک اعلان فرمایا کہ آج کل لوگ شادی میں مہر کے لیے بڑی بڑی رقمیں مقرر کرنے لگ گئے ہیں، بعد میں لوگ یہ رقمیں ادا نہیں کر سکتے جس کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور آپس میں جھگڑوں کی نوبت آجاتی ہے، اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ کسی شادی میں چار سو درہم سے زیادہ مہر کی رقم مقرر نہ کی جائے۔

یہ مسئلہ آج کے دور میں بھی ایک پریشان کن مسئلہ ہے کہ لوگ شادی کے وقت تو جوش و خروش میں مہر کی بڑی بڑی رقمیں مقرر کر لیتے ہیں لیکن بعد میں جب ادائیگی کی باری آتی ہے تو مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمیں پاکستان کے ماحول میں ایسی صورتحال سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے ایک جگہ نکاح پڑھاتے وقت پوچھا کہ بھئی مہر کی رقم کیا مقرر کی ہے؟ کہنے لگے کہ وہی شرعی مہر بتیس روپے چھ آنے۔ میں نے کہا خدا کے بندو! یہ شرعی مہر تم لوگوں نے کہاں سے نکال لیا۔ فیصل آباد سے بارات آئی تھی، میں نے دولہے سے پوچھا کہ بارات کے ساتھ کتنی گاڑیاں لائے ہو؟ کہنے لگا کہ پانچ فلائنگ کوچز لے کر آیا ہوں۔ میں نے پوچھا انہیں کتنے پیسوں میں بک کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ گیارہ ہزار روپے میں۔ میں نے کہا اللہ کے بندے اس غریب دلہن کو کم از کم دس ہزار روپے مہر تو دو۔ ہمارے ہاں شادی کی غیر ضروری رسموں پر لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں لیکن دلہن بیچاری کو دینے کے لیے نہ جانے کس شریعت کی رو سے بتیس روپے چھ آنے کا مہر مقرر کرتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ کوئی شرعی مہر نہیں ہے، شرعی مہر تو لڑکے کی حیثیت کے مطابق ہوتا

ہے۔ مہر کا اصول یہ ہے کہ اس کی رقم لڑکے پر بوجھ نہ ہو اور لڑکی کے لیے باعثِ عار نہ ہو، یعنی لڑکے کو قرض لے کر نہ دینا پڑے اور لڑکی کے لیے اس کی سہیلیوں اور رشتہ داروں کے سامنے شرمندگی کا باعث نہ ہو۔

ایک اور شادی میں ایسا ہوا کہ نکاح پڑھاتے وقت میں نے پوچھا کہ کتنا مہر مقرر کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دو لاکھ روپے۔ میں اس خاندان کو جانتا تھا کہ لڑکے کی حیثیت اتنی نہیں ہے کہ وہ دو لاکھ روپیہ دے سکے۔ میں نے اس کے والد سے بات کی کہ اتنا زیادہ مہر مقرر کر رہے ہو لڑکا کیسے دے گا؟ باپ کہنے لگا "اللہ کولوں خیر منگو، اساں کیڑا دینا اے" (اللہ سے خیر مانگیں، ہم نے کونسا اتنا مہر دینا ہے)۔ میں نے کہا انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ مہر تب ادا کرنا پڑتا ہے جب بیوی کو طلاق دینی ہو۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی عام پائی جاتی ہے کہ مہر تب دینا ہوتا ہے جب جھگڑا ہو جائے اور طلاق کی نوبت آجائے۔ میں نے کہا کہ بھئی مہر کا تعلق طلاق سے نہیں بلکہ نکاح سے ہے، نکاح ہو جائے اور میاں بیوی گھر میں آباد ہو جائیں تو مہر واجب ہو جاتا ہے۔ مہر کی حیثیت قرضے کی ہے، جس طرح کسی سے لیا ہوا قرضہ واپس کرنا ضروری ہے اسی طرح بیوی کا مہر ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر خاوند فوت ہو جائے اور اس نے بیوی کا مہر ادا نہیں کیا ہو تو ترکہ میں سے جو قرضہ ادا ہو گا اس میں سے مہر بھی ادا ہو گا اور بیوی کو وراثت سے جو حصہ ملے گا وہ مہر کی رقم کے علاوہ ہو گا۔

خیر بات دور نکل گئی، حضرت عمر فاروقؓ نے حکم نامہ جاری کر دیا کہ آج کے بعد چار سو درہم سے زیادہ کوئی مہر کی رقم مقرر نہ کرے۔ درہم ساڑھے تین ماشے چاندی کا سکہ ہوتا تھا، پاکستان میں آج کل کے ریٹ کے حساب سے چار سو درہم کی رقم کا اندازہ کر لیا جائے۔ جمعہ پڑھ کر باہر نکلے تو قریش کی ایک عورت نے حضرت عمرؓ کو روک لیا اور پوچھا، امیر المؤمنین آپ نے مہر کی رقم پر پابندی لگا دی ہے۔ فرمایا ہاں لگا دی ہے۔ اس نے پوچھا کہ آپؓ نے یہ فرمایا ہے کہ چار سو درہم سے زیادہ کسی عورت کو مہر نہ دیا جائے۔ فرمایا ہاں میں نے یہ کہا ہے۔

اس عورت نے کہا آپ کو اس کا اختیار کس نے دیا ہے کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ اندازہ فرمائیں کہ ایک عورت مسجد نبوی کے دروازے پر امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو ٹوک رہی ہے اور اپنی بات پر قرآن کریم کا حوالہ دے رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، خدا کی بندی! قرآن کریم میں یہ مسئلہ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے اور میں آپ کو بتاتی ہوں۔ قرآن کریم میں ہے فَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا (النساء: ۲۰) کہ اگر تم (خاوندوں) نے اپنی عورتوں کو انبار برابر رقم بھی دے دی ہے تو واپس نہ مانگنا شروع کر دو۔ اس آیت میں خاوند سے بیوی کو ملنے والی رقم کا ذکر کیا گیا ہے، خاوندوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اگر تم خاوندوں نے اپنی بیویوں کو ڈھیروں رقم بھی دے دی ہے تو اب واپس نہ مانگنا شروع کر دو، جو دے دیا بس دے دیا۔ عورت کہنے لگی، امیر المؤمنین! قرآن کریم تو ہمیں خاوندوں سے ڈھیروں دلواتا ہے جبکہ آپ کہتے ہیں کہ چار سو درہم سے زیادہ مت دو۔

حضرت عمرؓ کی جو صفات بیان ہوتی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ بھی آتی ہے کہ كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ كِتَابِ اللهِ کہ قرآن کریم کا حکم سامنے آنے پر وہ فوراً رک جایا کرتے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ انہی قدموں پر واپس مسجد نبوی میں گئے اور لوگوں کو بلایا کہ بھئی بات سنو۔ فرمایا کہ میں نے ابھی تمہارے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، مجھے مسجد کے دروازے پر ایک خاتون نے روکا ہے اور قرآن کریم کی آیت کا حوالہ دیا ہے۔ خدا کی قسم اس آیت کی طرف میرا پہلے دھیان نہیں تھا اس عورت نے میری توجہ اس طرف دلائی ہے، وہ ٹھیک کہتی ہے جبکہ میرا اعلان غلط تھا۔ امرأة أصابت وأخطأ رجل لہٰذا میں اپنا اعلان واپس لیتا ہوں۔ پھر حضرت عمرؓ نے ایک جملہ ہنستے ہنستے دل لگی کے انداز سے فرمایا کہ اب تو مدینہ کی عورتیں عمر سے بھی زیادہ قرآن جاننے لگی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ اس زمانے میں عورت کی رائے کا اور عورت کے علم کا معیار کیا تھا کہ ایک عورت حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ راشد کو اپنا فیصلہ واپس لینے

پر مجبور کر سکتی تھی۔ آج کی عورت بھی یہ کر سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے پاس علم اور دلیل ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بریرہؓ نامی ایک لونڈی آئی اور عرض کیا کہ میں نے اپنے مالک خاندان سے یہ سودا کیا ہے کہ اتنے پیسے مجھ سے لے لو اور مجھے آزاد کر دو۔ غلامی کے دور میں ایک طریقہ یہ بھی ہوتا تھا کہ غلام پیسے دے کر آزاد ہو جائے۔ بریرہؓ نے کہا کہ میرے مالک خاندان والے طے شدہ رقم قسطوں میں لے کر مجھے آزاد کرنے پر راضی ہیں۔ میں آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ میں خود بہت غریب ہوں اگر آپ میرے ساتھ کچھ تعاون فرماتی رہیں تو میں کچھ سالوں میں وہ قسطیں ادا کر کے آزاد ہو جاؤں گی۔ حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ لڑکی سمجھدار ہے اور اچھی ہے، عقلمند آدمی چہرے مہرے سے اور گفتگو سے اندازہ کر لیتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے بریرہؓ سے کہا کہ جاؤ اپنے خاندان والوں سے معلوم کرو کہ اگر میں سارے پیسے اکٹھے ادا کر دوں تو کیا وہ تمہیں مجھ پر بیچ دیں گے؟ میں تمہیں ابھی خرید کر آزاد کر دیتی ہوں۔ بریرہؓ پوچھ کر واپس آئی اور بتایا کہ وہ مجھے بیچنے پر راضی ہیں لیکن ان کی شرط یہ ہے کہ وَلا ان کی ہوگی۔ وَلا وراثت کے درجات میں ایک آخری درجہ ہے۔ کوئی ایسا شخص فوت ہو جائے جس کا کوئی والی اور کوئی وارث نہ ہو، رشتہ داروں اور متعلقین میں ایسا کوئی بھی نہ ہو جو وراثت کا حق دار بن سکے تو ایسے شخص کا ترکہ وراثت کے آخری درجہ وَلا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر وہ شخص آزاد کردہ غلام ہو تو پھر یہ وَلا اس کا حق ہوتی ہے جس نے اس غلام کو آزاد کیا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں وَلا کا معاملہ انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا جو کہیں سے غلام بنا کر لائے گئے ہوتے تھے اور ان کا کوئی رشتہ دار وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ بریرہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ وہ مجھے سارے پیسے اکٹھے لے کر بیچنے پر راضی ہیں لیکن وہ حق الولاء مانگ رہے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب سارے پیسے میں دے رہی ہوں تو وَلا کا حق ان کا کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے جناب نبی کریم ﷺ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ اس طرح میں لونڈی کو آزاد کرنے کے لیے پورے پیسے دے رہی ہوں لیکن وہ وَلا کا حق مانگ رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے پیسے دے کر لونڈی کو خریدا ہے وَلا کا حق اسی کا ہے۔

یہ لونڈی بریرہؓ ایک شخص مغیثؓ کے نکاح میں تھی۔ لونڈی کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر لونڈی کے مالکان نے اس کا نکاح اپنی مرضی سے کہیں کر دیا ہو تو آزاد ہونے کے بعد اس کے پاس یہ اختیار آجاتا ہے کہ وہ یہ نکاح توڑ سکتی تھی۔ اسے فقہ کی اصطلاح میں خیارِ عتق کہتے ہیں۔ بریرہؓ لونڈی تھی، اس لیے مالکوں نے اپنی مرضی سے مغیثؓ کے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی۔ اب شادی میں عورت کی اپنی مرضی ہونی چاہیے جبکہ لونڈی ہونے کی وجہ سے بریرہؓ کا یہ حق استعمال نہیں ہوا تھا۔ جب حضرت عائشہؓ نے بریرہؓ کو آزاد کروایا تو بریرہؓ نے کہا کہ میں رہوں گی تو آپ کی خدمت میں ہی لیکن مغیثؓ کے ساتھ میں اپنا نکاح ختم کرتی ہوں۔ مغیثؓ کو پتہ چلا تو وہ بہت رنجیدہ ہوا، پہلے تو اس نے خود بریرہؓ سے بات کی پھر کسی سے سفارش کروائی لیکن وہ نہ مانی۔ کہا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، ایسا کرنا میرا حق تھا جو میں نے استعمال کیا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ مغیثؓ مدینہ کی گلیوں میں روتا پھرتا تھا اور کہتا پھرتا تھا کہ کوئی ہے جو بریرہؓ سے میری سفارش کرے۔ عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ بازار میں جا رہے تھے دیکھا کہ ایک طرف سے مغیث آرہا تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آواز لگائے جا رہا تھا کہ کوئی ہے جو بریرہؓ سے میری سفارش کر دے۔ حضور ﷺ نے عبد اللہ بن عباسؓ سے فرمایا اِس کی محبت دیکھو اور اُس کی نفرت دیکھو۔ اِس کا حال یہ ہے کہ اس کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے اور وہ اِس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔ یہ منظر دیکھ کر جناب نبی کریم ﷺ نے خود سفارش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب ذرا تصور کیجیے کہ بریرہؓ کون تھی؟ ایک آزاد کردہ لونڈی تھی، حضرت عائشہؓ کی خادمہ تھی اور انہی کے گھر میں رہتی تھی۔ اور اس سے سفارش کر رہے ہیں جناب رسول اللہ ﷺ۔ کیا اس سے بڑی سفارش کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے بریرہؓ کو بلایا اور مغیثؓ کی بابت پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ بریرہؓ نے معاملہ بتایا اور پھر پوچھا کہ یارسول اللہ! کیا ایسا کرنا میرا حق تھا یا نہیں؟ فرمایا حق تو بہرحال تھا۔ بریرہؓ نے کہا کہ بس میں نے اپنا حق استعمال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہے،

کیا تم اس فیصلے سے رجوع کر سکتی ہو؟ بریرہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! جو آپ فرما رہے ہیں یہ حکم ہے یا مشورہ؟ بریرہؓ بھی ایک صحابیہ تھی اور جانتی تھی کہ اگر آپ ﷺ کا حکم ہے تو پھر کسی مسلمان کی یہ مجال نہیں کہ اس سے اعراض کر سکے، مرضی ہو یا نہ ہو، جی چاہے یا نہ چاہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حکم نہیں ہے بلکہ مشورہ ہے۔ بریرہؓ نے کہا لَا حَاجَةَ لِیْ فِیْهِ پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ذرا سوچیے کہ اسلام عورت کو رائے کا حق دیتا ہے یا نہیں۔ ایک عورت اپنی رائے کا حق کس ہستی کے سامنے استعمال کر رہی ہے اور کس شخصیت کا مشورہ رد کر رہی ہے۔ اس کے بعد بھی بریرہؓ بطور خادمہ حضور ﷺ کے گھر میں اور حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہی لیکن حضور ﷺ نے کبھی یہ نہیں جتایا کہ بریرہؓ تم نے میری بات نہیں مانی۔ اسلام عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ کسی دباؤ کے بغیر آزادانہ طور پر اپنی رائے کا استعمال کرے، اس بات کا اس واقعہ سے بڑا مظاہرہ کیا ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنی گفتگو میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے قرآن و سنت کی رو سے نہ صرف عورتوں کے حقوق کا تعین کیا ہے بلکہ آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے اصحاب نے ان حقوق کی ادائیگی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے اور جناب نبی کریم ﷺ کا عورتوں کے ساتھ معاملہ کیسا تھا، عورتوں کی آزادی کے حوالے سے، ان کے حقوق کے حوالے سے اور ان کی رائے کے احترام کے حوالے سے۔ یہ بتانے کے لیے میں نے چند واقعات کے ذریعے آپ کے سامنے عورتوں کے حقوق کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کی ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

عید میلاد المسیحؑ اور اسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ
وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَأَتْبَاعِهٖ أَجْمَعِيْنَ أَمَّا بَعْدُ

ہر سال 25 دسمبر کو مسیحی مذہب کے پیروکار کرسمس مناتے ہیں جو ان میں سے اکثر کے بقول سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم ولادت ہے۔ چنانچہ مسیحیوں کے مذہبی حلقے اسے "عید میلاد المسیح" کا نام دیتے ہیں جبکہ عمومی مسیحی حلقے اسے ایک قومی دن کے طور پر پوری دنیا میں جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہ دن بھرپور انداز میں منایا جاتا ہے اور مسیحی مذہب کے پیروکار مختلف تقریبات اور پروگراموں کے ذریعے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس حوالے سے آج ہم سیدنا حضرت عیسیٰؑ کی ذات بابرکات کے ساتھ اپنی عقیدت و محبت کا اسلامی تعلیمات کے حوالے سے اظہار کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے قرآن و حدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں بیسیوں مقامات پر بکھرے ہوئے تذکروں میں سے چند ایک کا ذکر کریں گے۔

سیدنا حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور رسول ہیں، ان کی والدہ محترمہ حضرت مریمؑ پاک باز خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قدرت سے معجزے کے طور پر بغیر باپ کے پیدا کیا اور نبوت اور رسالت سے نوازا۔ حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر تھے، انہیں چار بڑی آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب انجیل دی گئی۔ یہودیوں نے دشمنی میں انہیں قتل کرنا چاہا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا۔ انہیں ابھی تک موت نہیں آئی اور نہ وہ سولی پر چڑھائے گئے بلکہ وہ اسی دنیوی حیات کے ساتھ آسمانوں پر

موجود ہیں، قیامت سے پہلے دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے، دجال اکبر کا مقابلہ کر کے اسے شکست دیں گے اور اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کریں گے۔ مسلمانوں کے اس وقت کے امیر حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مل کر دنیا میں پھر سے آسمانی تعلیمات کی حکمرانی، جسے مسلمانوں کی اصطلاح میں خلافت کہا جاتا ہے، قائم کریں گے۔ حضرت عیسیٰؑ کچھ عرصہ حیات رہیں گے، ان کی شادی ہوگی، بچے ہوں گے اور پھر وہ وفات پائیں گے جس کے بعد انہیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر میں سپرد خاک کر دیا جائے گا جہاں آنحضرت ﷺ، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی تین قبروں کے ساتھ ایک قبر کی خالی جگہ موجود ہے اور اسے حضرت عیسیٰؑ کی قبر کے لیے مخصوص رکھا گیا ہے۔

قرآن کریم میں مختلف مقامات پر حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ موجود ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

سورۃ البقرہ کی آیت ۸۷ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اور آیت ۲۵۳ میں ارشاد خداوندی ہے وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کہ ہم نے حضرت موسیٰؑ کو کتاب (توراۃ) دی اور ان کے بعد لگاتار نبی بھیجے اور حضرت عیسیٰؑ کو ہم نے کھلے معجزات دیے اور روح القدس کے ساتھ ان کی مدد کی۔

سورہ آل عمران ۳۵ تا ۶۰ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (35) فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْۤ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (36) فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (37) هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (38) فَنَادَتْهُ الْمَلٰۤئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ(39) قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ
وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ(40) قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا
تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِىِّ وَالْاِبْكَارِ(41) وَاِذْ قَالَتِ
الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ(42) يٰمَرْيَمُ
اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ(43) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا
كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ(44)
اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ
وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ(45) وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ
الصّٰلِحِيْنَ(46) قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا
يَشَآءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ(47) وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ(48) وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ
الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ
الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ(49) وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ
عَلَيْكُمْ ۭ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ(50) اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ(51) فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِىْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ
الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ(52) رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ
وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ(53) وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ
الْمٰكِرِيْنَ(54) اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ(55) فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ(56) وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا
يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ(57) ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ(58) اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ
اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ(59) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْمُمْتَرِيْنَ(60) ان آیات میں حضرت مریمؑ کی ولادت و پرورش اور پھر اس کے بعد حضرت
عیسیٰؑ کی ولادت و نبوت کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: حضرت مریمؑ کی والدہ محترمہ

نے نذر مانی کے اے اللہ! میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کرتی ہوں۔ مگر جب بچہ پیدا ہوا تو وہ لڑکی (مریم) تھی، ان کی والدہ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یہ تو بچی ہے میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں اور اس کی اولاد کو بھی مردود شیطان کے شر سے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نذر قبول کر لی اور اسے اچھی پرورش کے ساتھ بڑھایا جبکہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اس بچی کی کفالت کا۔

فرشتوں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا اور پاکیزگی بخشی ہے اور تجھے جہانوں کی عورتوں میں سے چنا ہے اس لیے تم اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور اس کے لیے رکوع اور سجدہ کرو۔ پھر فرشتوں نے حضرت مریمؑ کو خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ تجھے اپنے کلمہ کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام مسیح اور عیسیٰ بن مریم ہو گا، وہ دنیا و آخرت میں باوقار ہو گا، اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں سے ہو گا، ماں کی گود میں اور پختہ عمر میں یکساں کلام کرے گا اور نیکوکاروں میں سے ہو گا۔ حضرت مریمؑ نے کہا کہ مجھے تو ابھی تک کسی مرد نے چھوا تک نہیں، میرا بیٹا کیسے پیدا ہو گا؟ فرشتوں نے کہا کہ اسی کیفیت میں ہو گا، اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو صرف اتنا کہہ دیتے ہیں کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اسے کتاب و حکمت اور توراۃ و انجیل کی تعلیم دے گا اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائے گا۔

حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانیاں لے کر آیا ہوں، میں مٹی سے پرندے کا مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اڑنے لگتا ہے، میں مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تندرست بنا دیتا ہوں، میں مردے کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کرتا ہوں، جو کھانا تم کھاتے ہو اور جو گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو میں اس کی تمہیں خبر دے سکتا ہوں، میں اپنے سے پہلی کتاب توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہوں، بعض چیزیں جو تم پر پہلے حرام کی گئی تھیں انہیں حلال کرنے آیا ہوں اور تمہارے رب کی طرف سے کھلی نشانی لایا ہوں۔ اس لیے تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری پیروی کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا رب ہے، بس اسی کی عبادت کرو کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے۔

جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم کی طرف سے جھٹلائے جانے کا خطرہ محسوس کیا تو کہا کہ اللہ کی راہ میں میرے مددگار کون ہیں؟ ان کے حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے مددگار ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اے اللہ! ہم آپ کے اتارے ہوئے احکام پر ایمان لاتے ہیں اور ہم نے آپ کے رسول (حضرت عیسیٰؑ) کی پیروی اختیار کی ہے اس لیے ہمیں حق کی گواہی دینے والوں میں شمار فرما۔ جبکہ حضرت عیسیٰؑ کے منکروں نے تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر تدبیر کرنے والے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ سے کہا کہ میں تجھے وصول کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھالینے والا ہوں اور تجھے کافروں سے نجات دینے والا ہوں اور تیرے پیروکاروں کو قیامت تک تیرے دشمنوں پر غلبہ دینے والا ہوں۔

بے شک حضرت عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی طرح ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مٹی سے بنایا اور پھر فرمایا کہ ہو جا تو وہ (ایک زندہ انسان) ہو گیا۔ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے، بس ہرگز تم شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔

سورہ النساء آیت 155 تا 159 فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (155) وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا (156) وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (157) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (158) وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (159) میں اللہ تعالیٰ نے یہود بنی اسرائیل کے دلوں پر کفر کی مہر لگا دینے کے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بھی ذکر کیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کا انکار کر دیا اور حضرت مریمؑ پر (حضرت عیسیٰؑ کی بغیر باپ ولادت کے حوالے سے) بہتان عظیم باندھ دیا اور یہ کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ کو قتل کر دیا ہے۔ حالانکہ نہ

انہوں نے اسے قتل کیا اور نہ سولی پر لٹکایا بلکہ وہ شبہہ میں ڈال دیے گئے اور جس بات میں وہ اختلاف کرتے ہیں وہ شک کی بنیاد پر کرتے ہیں، ان کے پاس اس کے بارے میں کوئی علم نہیں اور وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا تھا اور اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔ اور اہل کتاب میں کوئی بھی نہیں ہے مگر وہ سب حضرت عیسیٰؑ پر ان کی موت سے پہلے ایمان لائیں گے۔

سورہ النساء آیت 172 میں ہے لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا کہ حضرت عیسیٰؑ نے کبھی اس بات سے عار محسوس نہیں کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور نہ ہی اس بات سے اللہ تعالیٰ کے فرشتے عار محسوس کرتے ہیں۔ اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی بندگی سے عار محسوس کرتا ہے اور تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

سورۃ المائدہ آیت 17 لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا جنہوں نے کہا کہ مسیح بن مریمؑ ہی خدا ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ، ان کی والدہ اور روئے زمین کے سب لوگوں کو موت دے دیں تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کس کا بس چل سکتا ہے؟

سورۃ المائدہ آیت 46 وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کے بعد ان کے نقش قدم پر عیسیٰؑ بن مریمؑ کو بھیجا، وہ اس سے پہلے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ توراۃ کی تصدیق کرتی تھی اور متقین کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی۔

سورۃ المائدہ آیت 72 تا 75 لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (72) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (73) أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (74) مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ (75) میں ارشاد خداوندی ہے کہ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا جنہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ ہی خداوند ہیں۔ حالانکہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے۔ اور بے شک جس نے اس کے ساتھ شرک کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانہ آگ ہے۔ اور ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تین میں سے ایک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو انہیں دردناک عذاب پہنچے گا۔ حضرت عیسیٰؑ صرف اللہ تعالیٰ کے رسول تھے ان سے پہلے کئی رسول گزر چکے اور ان کی والدہ (حضرت مریمؑ) سچی خاتون تھیں اور وہ دونوں ماں بیٹا کھانا کھایا کرتے تھے۔

سورۃ المائدہ آیت 78 تا 80 لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ (78) كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (79) تَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ (80) میں ہے کہ بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے ان پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر (ان کے ذریعے) لعنت کی گئی اس لیے کہ وہ نافرمانی میں حد سے بڑھ گئے تھے، وہ ایک دوسرے کو برائی سے نہیں روکتے تھے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے اور کافروں کے ساتھ دوستی کیا کرتے تھے۔

سورۃ المائدہ آیت 109 تا 118 يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ ۖ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ (109) إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ

وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِىْ فَتَنْفُخُ
فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِىْ ۚ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِىْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِىْ ۚ وَاِذْ
كَفَفْتُ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ (110) وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِىْ وَبِرَسُوْلِىْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا
مُسْلِمُوْنَ (111) اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا
مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۗ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (112) قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا
وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (113) قَالَ عِيْسَى ابْنُ
مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً
مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (114) قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ
مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (115) وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْٓ اَنْ
اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ ۗ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۗ تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِىْ
نَفْسِكَ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (116) مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ
وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۗ
وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ (117) اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (118) میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنی نعمتیں یاد دلاتے ہیں کہ میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیں، جب روح القدس (جبرائیل علیہ السلام) کے ساتھ تمہاری مدد کی، جب تم ماں کی گود میں اور پختہ عمر میں یکساں کلام کرتے تھے، جب میں نے تمہیں کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل کی تعلیم دی، جب تم مٹی سے پرندوں کے مجسمے بنا کر ان میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے اڑنے لگتے تھے، تم اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے تندرست بنا دیا کرتے تھے، جب تم قبروں سے مردوں کو زندہ اٹھالیا کرتے تھے، جب میں نے بنی اسرائیل کو تمہیں نقصان پہنچانے سے روک دیا، جب تم ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے تھے اور انہوں نے انہیں جھٹلاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، جب میں نے حواریوں سے کہا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو وہ ایمان لے

آئے، جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰؑ بن مریم کیا آپ کا رب اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (تیار کھانے کا) دستر خوان اتارے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ حواریوں نے کہا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم (آسمانی کھانا) کھائیں اور ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو اور ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے دعا مانگی کہ اے اللہ! ہم پر آسمان سے دستر خوان اتار دے، وہ ہمارے لیے عید کا دن ہو گا اور ہمارے بعد والوں کے لیے بھی عید ہو گی اور تیری قدرت کی نشانی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر دستر خوان اتارنے والا ہوں لیکن اس کے بعد جس نے کفر کیا اسے ایسا عذاب دوں گا کہ سارے جہانوں میں ایسا عذاب کسی اور کو نہیں دوں گا۔

سورۃ المائدہ کی انہی آیات کے مطابق یہ نعمتیں یاد دلا کر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے قیامت کے دن پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ کے سوا خدا بنا لینا؟ حضرت عیسیٰؑ جواب دیں گے کہ اے اللہ تیری ذات ان باتوں سے پاک ہے، مجھے ایسی بات کہنے کا کوئی حق ہی نہیں تھا اور اگر یہ بات میں نے کہی ہوتی تو آپ کے علم میں ہوتی، میں نے تو انہیں وہی کہا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے۔

سورۃ التوبہ آیت ۲۹ تا ۳۰ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (29) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (30) کہ یہود نے کہا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کی خود ساختہ باتیں ہیں اور وہ پہلے کافروں کی طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب بنا رکھا ہے اور عیسیٰ بن مریمؑ کو بھی خدا بنا لیا ہے۔ حالانکہ

انہیں اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں جو ایک ہی خدا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔

سورہ مریم آیت 16 تا 40 وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا
شَرْقِيًّا(16) فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا(17)
قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا(18) قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا
زَكِيًّا(19) قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا(20) قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ
رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَقْضِيًّا(21) فَحَمَلَتْهُ
فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا(22) فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ
قَبْلَ هَٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَنْسِيًّا(23) فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ
سَرِيًّا(24) وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا(25) فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي
عَيْنًا فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ
إِنْسِيًّا(26) فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا(27) يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا
كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا(28) فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي
الْمَهْدِ صَبِيًّا(29) قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا(30) وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا
كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا(31) وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا
شَقِيًّا(32) وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا(33) ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ(34) مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحَانَهُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا
فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ(35) وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ(36)
فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ(37) أَسْمِعْ بِهِمْ
وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا لَٰكِنِ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ(38) وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ
قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ(39) إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا
يُرْجَعُونَ(40) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔ جب حضرت مریمؑ اپنے گھر والوں سے مشرقی جگہ میں الگ ہو کر اوٹ میں ہو گئیں تو ہم نے روح القدس کو بھیجا جس نے ایک کامل انسان کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت مریمؑ نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خدا خوفی

رکھنے والا ہے۔ اس نے کہا کہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔ حضرت مریمؑ نے کہا کہ میرا لڑکا کہاں سے ہو گا جبکہ مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں اور میں بدکار عورت بھی نہیں ہوں۔ فرشتے نے کہا کہ اسی کیفیت میں ہو گا، تیرا رب کہتا ہے کہ یہ بات میرے لیے آسان ہے اور میں اس لڑکے کو اپنی قدرت کی نشانی بناؤں گا اور وہ رحمت ہو گا اور یہ بات تو طے شدہ ہے۔ پس وہ حاملہ ہوئی اور اسے لے کر الگ دور جگہ میں چلی گئی، جب اسے دردزہ ایک کھجور کے تنے کے پاس لے گیا تو اس نے (بدنامی کے خوف سے) کہا کہ اے کاش! میں اس سے قبل مر چکی ہوتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔ فرشتے نے نیچے سے آواز دی کہ گھبراؤ نہیں تمہارے رب نے تمہارے قدموں میں پانی کا چشمہ نکال دیا ہے اور کھجور کے تنے کو حرکت دو تم پر تروتازہ کھجوریں گریں گی، پس کھاؤ، پیو اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرو۔ اور اگر کسی انسان کو دیکھو تو اسے بتاؤ کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے لیے کلام نہ کرنے کا روزہ رکھا ہوا ہے اس لیے آج کا دن میں کسی سے کلام نہیں کروں گی۔ پس وہ اپنے بچے کو لے کر قوم کے پاس آئی، وہ اسے اٹھائے ہوئے تھی، لوگوں نے کہا کہ اے مریمؑ! تم تو یہ بہت بری چیز لے آئی ہو، نہ تو تمہارا باپ برا شخص تھا اور نہ ہی تمہاری ماں بدکار تھی۔

حضرت مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کیا کہ اسی سے پوچھو۔ انہوں نے کہا کہ گود کے بچے سے ہم کیسے کلام کریں؟ اس پر حضرت عیسیٰؑ (ماں کی گود میں) بول پڑے کہ بے شک میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، مجھے اس نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے، مجھے برکت والا بنایا ہے، میں جہاں بھی ہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، مجھے اپنی ماں کے لیے فرمانبردار بنایا ہے اور تندخو اور بدنصیب نہیں بنایا، مجھ پر سلامتی ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

یہ تفصیل بیان کر کے اللہ تعالیٰ ان آیات میں یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریمؑ یہی ہیں، یہی حق ہے جس کے بارے میں یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے، اس کی ذات پاک ہے، وہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے (یعنی اس کو کسی مددگار کی ضرورت نہیں)۔

سورۃ المومنون آیت ۵۰ میں وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ (50) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ محترمہ کو اپنی خاص قدرت کی نشانی بنایا اور ہم نے ان دونوں کو ایک بلند ٹیلے پر پناہ دی جو قرار گاہ اور چشمے والی تھی۔

سورۃ الزخرف آیت 60 میں فرمایا ہے وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ (60) کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں، اس بات میں ہرگز شک میں نہ پڑنا اور میری پیروی کرنا یہی صراط مستقیم ہے۔

سورۃ الصف آیت ۶ میں ہے وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (6) کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے کتاب توراۃ ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد آنے والے نبی کی بشارت دینے والا ہوں جس کا نام احمد ﷺ ہو گا۔

یہ ایک خلاصہ ہے جو قرآن کریم کے بیسیوں مقامات میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے تذکروں میں سے ہم نے پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سینکڑوں ارشادات میں سے بھی کچھ کا تذکرہ کیا جائے جو پیغمبر آخر الزمان ﷺ نے اس مقدس ماں اور اس کے مقدس بیٹے کے بارے میں فرمائے ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ البتہ ضرور تم میں ابن مریمؑ نازل ہوں گے حاکم اور عادل بن کر۔ وہ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کو ختم کر دیں گے اور مال کو اتنا عام کریں گے کہ کوئی قبول کرنے والا نہیں ہو گا اور یہ اس وقت ہو گا جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک سجدہ دنیا اور اس کی ساری دولت سے بہتر ہو گا۔

مسلم شریف میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک گروہ حق پر لڑتا رہے گا اور قیامت تک وہ گروہ غالب رہے گا (کہ اسے حق سے کوئی ہٹا نہیں سکے گا)۔ پھر حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے، مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ حضرت تشریف لایئے اور ہمیں نماز پڑھا دیجئے، وہ فرمائیں گے کہ تم آپس میں ہی ایک دوسرے کے امام ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کا اعزاز ہے۔

مسلم شریف میں حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اکرم ﷺ نے قیامت سے قبل امت مسلمہ کی زبوں حالی کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اسی دوران اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریمؑ کو بھیج دے گا اور لوگ دمشق کے مشرقی جانب عیسیٰؑ کو موجود پائیں گے۔

ابو داؤد طیاسی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، مال کو پانی کی طرح بہائیں گے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کے دور میں اسلام کے سوا باقی سارے دینوں کو مٹا دیں گے۔ جھوٹے مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے، زمین میں امن قائم ہو جائے گا حتیٰ کہ شیر اونٹ کے ساتھ، چیتا گائے کے ساتھ اور بھیڑیا بکریوں کے ساتھ پانی پیئے گا اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے اور کوئی کسی کو نہیں کاٹے گا۔ حضرت عیسیٰؑ زمین پر چالیس سال تک رہیں گے پھر ان کی وفات ہو گی، مسلمان ان کا جنازہ پڑھیں گے اور انہیں دفن کریں گے۔

مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے حضرت عیسیٰؑ فج الروحاء کے مقام سے (مدینہ منورہ سے چھ میل دور ایک جگہ کا نام ہے) حج یا عمرے کا یا دونوں کا احرام باندھیں گے۔ جبکہ مستدرک حاکم کی روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ یہ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پھر حضرت عیسیٰؑ میری قبر پر آکر مجھے سلام کہیں گے اور میں ان کے سلام کا جواب دوں گا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ جزام کے لوگوں سے، جو قبیلہ ازد کی شاخ ہے، فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ تمہارے خاندان کی ایک خاتون سے شادی کریں گے اور شادی کے بعد انیس سال زندہ رہیں گے۔ جبکہ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی کتاب "التصریح" میں علامہ سفارینیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس خاتون سے حضرت عیسیٰؑ کے دو بیٹے ہوں گے، وہ ایک کا نام موسیٰ اور دوسرے کا نام محمد رکھیں گے۔

امام نور الدین الہیثمیؒ مسند بزار کے حوالے سے راویوں کی توثیق کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں بیان کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان سے نازل ہوں گے اور لوگوں کی امامت کریں گے۔ محدثینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ پہلی نماز اس امت کے امام کے پیچھے پڑھیں گے جبکہ اس کے بعد وہ نمازوں کی امامت بھی فرمائیں گے اور امت کی قیادت بھی کریں گے۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں دنیا اور آخرت دونوں جگہ حضرت عیسیٰؑ سے زیادہ قریب ہوں۔ اس لیے ہم مسلمانوں کا تعلق اور عقیدت بھی حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ باقی سب سے زیادہ ہے اور ان کا ادب و احترام ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ البتہ ہمارے نزدیک عقیدت، ادب اور احترام کا حقیقی اظہار کوئی دن منا لینے سے زیادہ ان کی اطاعت اور پیروی میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دے، آمین یارب العالمین۔

غلامی کا تصور اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

غلامی کیا ہوتی ہے، آج کے دور میں غلام موجود ہیں یا نہیں اور غلامی کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ یہ آج کی دنیا کے نازک موضوعات میں سے ہے۔ اسلام پر جو اعتراضات ہوتے ہیں ان میں سے ایک اعتراض غلامی کے حوالے سے بھی ہے۔ جب اقوام متحدہ نے غلامی کو انسانی حقوق کے عالمی منشور میں کلیتاً ممنوع قرار دیا تو اس سے کچھ عرصہ پہلے تک یہاں امریکہ میں بھی غلامی کا سلسلہ قائم تھا۔ لیکن جب غلامی کو ممنوع قرار دینے کی بات ہوئی تو یہ کہا گیا کہ اسلام بھی ان مذاہب میں سے ہے جنہوں نے غلامی کو جائز قرار دیا اور اپنے نظام میں غلامی کا رواج برقرار رکھا۔ اس بات کی بظاہر تائید بھی ہوتی ہے اس لیے کہ قرآن کریم میں غلامی کے بارے میں آیات موجود ہیں، احادیث میں ان کا ذکر ہے اور غلامی کے متعلق فقہ کے ابواب ہیں۔ اگرچہ آج کے دور میں عملاً غلامی موجود نہیں ہے لیکن اسلام کے اندر غلامی کا ایک مستقل تصور ہے جو پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ غلامی کیا تھی اور اسلام نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔

غلامی کیا ہے؟

غلامی یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو ہر طرح سے اپنا تابع بنالے۔ غلام بننے والا آدمی مکمل طور پر اپنے مالک کے حکم کے تابع ہو جاتا ہے کہ جو وہ کہے گا یہ وہی کرے گا، غلام اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہوتی تھی کہ غلام ایک مالک کے ہاں سے بکتا تھا اور دوسرے کے ہاں جاتا تھا، منڈی میں اس کی قیمت پڑتی تھی اور بولی لگتی تھی۔ ایک آزاد آدمی اسے بیچتا تھا اور دوسرا آزاد آدمی اسے خریدتا تھا ایسے ہی جیسے

جانور خریدے دیچے جاتے ہیں اور جس طرح جانوروں سے جو چاہے کام لیں اسی طرح غلام انسانوں سے بھی ان کی مرضی اور منشاء کے بغیر کام لیا جاتا تھا۔ غلام آدمی کی ضروریاتِ زندگی اس کے مالک کے ذمے ہوتی تھیں۔ ایک غلام کا معیار زندگی کیسا ہوتا تھا؟ اس کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ اس کا مالک کتنا سخی اور رحمدل ہے۔

ایک آدمی دوسرے آدمی کا غلام کیسے بنتا تھا اس کے دو طریقے رائج تھے۔ ایک یہ کہ آزاد آدمی کو جبراً غلام بنالیا جاتا اور دوسرا یہ کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاتا۔

آزاد آدمی کا غلام بننا

ایک طریقہ یہ تھا کہ کوئی طاقتور آدمی یا گروہ کسی کمزور آدمی کو پکڑ کر بیچ دیتا تھا، اسے "بیع الحر" کہتے ہیں جس کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک آزاد آدمی نے کوئی ایسا جرم کیا کہ جس کی سزا میں قبیلے کی پنچایت یا سردار نے اسے غلام بنا دیا کہ اب تم غلامی کی زندگی بسر کرو گے۔ یا پھر ویسے ہی کسی طاقتور گروہ نے راہ چلتے مسافر کو پکڑ کر کسی کے ہاتھ بیچ دیا، بے شمار لوگ اس طرح بِک جاتے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک آزاد گھرانے کے فرد تھے، مجوسیت چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے اور عیسائیت میں ایک عرصہ گزارا۔ وہ گھر سے مذہبی تعلیم کے حصول کے لیے نکلے ہوئے تھے کہ راستے میں لوگوں نے پکڑا اور غلام بنا کر بیچ دیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ غلام بن کر مدینہ منورہ کے ایک یہودی خاندان کے پاس آ گئے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے وہ بھی آزاد باپ کے بیٹے تھے اور آزاد گھرانے کے فرد تھے۔ بھائیوں نے اپنے حسد کی وجہ سے انہیں کنویں میں پھینک دیا جہاں سے کسی قافلے والوں نے نکالا اور آگے کسی کے ہاتھ بیچ دیا۔ اسے بیع الحر کہتے ہیں کہ کوئی طاقتور کسی آزاد آدمی کو پکڑے اور اس کے دام کھرے کرے۔ اس طرح سے بکنے والا آدمی ساری زندگی غلامی کی بسر کرتا تھا۔ بیع الحر کی ایک اور مثال حضرت زید بن حارثہؓ تھے جو کہ غلام بن کر حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تھے اور حضرت خدیجہؓ نے انہیں حضور ﷺ کی خدمت میں دے دیا تھا۔ حضور ﷺ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا اس کا ذکر آگے آگے آئے

گا۔ آزاد آدمی کو غلام بنانے کا ایک طریقہ وہ ہوتا تھا جو چند دہائیاں قبل تک یہاں (امریکہ) میں رائج رہا کہ افریقہ سے جہاز بھر کر لائے جاتے تھے اور بطور غلام بیچ دیے جاتے تھے۔ وہاں سے روزگار کے لالچ میں لائے جاتے تھے اور یہاں پر غلام بنا لیے جاتے تھے، امریکہ میں غلامی کا یہ سلسلہ صدیوں تک رہا ہے۔ غلامی کے حوالے سے اگر تاریخ سامنے رکھی جائے تو سب سے سنگین اور سب سے صبر آزما تاریخ یہیں کی ہے۔

جنگی قیدی کا غلام بننا

دوسرا طریقہ غلام بنانے کا یہ ہوتا تھا کہ دو قوموں کے درمیان جنگ کے نتیجے میں جو قیدی ہاتھ میں آتے تھے انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اب قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا اس بارے میں بھی مختلف طریقے رائج تھے، مثلاً:

قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جاتا۔

احسان کے طور پر یا فدیہ لے کر قیدی چھوڑ دیے جاتے۔

قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا۔

قید کر لیا جاتا۔

جب جنگوں کے نتیجے میں گرفتار ہونے والے افراد کو قیدی بنانے کا فیصلہ کیا جاتا تو پھر یہ مسئلہ درپیش ہوتا تھا کہ انہیں قید کہاں کیا جائے۔ چونکہ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے اس لیے یہ قیدی مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے، اِن قیدیوں کی حیثیت غلاموں کی ہوتی تھی۔ یعنی جنگوں میں جو لوگ پکڑے جاتے اگر ان کو فدیہ لے کر یا ویسے چھوڑنا مناسب نہ ہوتا، تبادلہ کی بھی کوئی صورت نہ بنتی، قتل کرنا بھی مصلحت کے خلاف ہوتا تو پھر آخری صورت یہ ہوتی تھی کہ انہیں قیدی بنا لیا جائے۔ پھر قیدی بنانے کی شکل یہ ہوتی تھی کہ قید خانے میں ڈالنے کے بجائے انہیں غلام اور لونڈی بنا کر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان جنگی قیدیوں کو غلام سمجھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ غلامی کے اصولوں پر ہی معاملہ ہوتا تھا، ان سے کام بھی لیا جاتا تھا اور ان کی خرید و فروخت بھی

ہوتی تھی۔ جب کوئی عورت قید ہو کر لونڈی بنتی تو اس کا پچھلا ازدواجی رشتہ ختم ہو جاتا تھا اور جس کی مِلک میں وہ آجاتی تھی اسی کے ساتھ وہ رہتی تھی۔ جس شخص کی مِلک میں یہ لونڈی ہوتی تھی اس کے لیے لونڈی کے ساتھ جنسی تعلقات بھی جائز ہوتے تھے۔ مالک خود اس لونڈی سے جنسی تعلق رکھ سکتا تھا یا اسے کسی اور شخص کے نکاح میں دے سکتا تھا، حتیٰ کہ جاہلیت کے دور میں لونڈیوں کو فحاشی اور زنا کے کاروبار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

اسلام میں غلامی کا تصور

پہلی بات یہ ہے کہ غلامی مسلمانوں نے رائج نہیں کی اس لیے کہ مسلمانوں سے پہلے یہ طریقہ دنیا میں رائج چلا آرہا تھا۔ غلامی کے ساتھ جیسے باقی قوموں کو واسطہ پڑا اسی طرح مسلمانوں کو بھی اس کے ساتھ واسطہ پڑا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ غلامی کے اس رواج کے ساتھ سب سے اچھا برتاؤ کس نے کیا۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کے پہلے طریقے "بیع الحر" کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا، احادیث میں اور فقہ کی کتابوں میں اس کے متعلق مستقل ابواب ہیں۔ جبکہ غلامی کے دوسرے طریقے یعنی جنگوں میں قیدی بنانے کو برقرار رکھا۔ وہ ایسے کہ جب قیدیوں کے ساتھ کوئی اور معاملہ کرنے کی صورت نہ ہوتی کہ احساناً چھوڑ دینا، فدیہ لے کر چھوڑ دینا، یا قتل کرنا وغیرہ جنگ کی حکمتوں کے خلاف ہوتا تو پھر انہیں قید کر لیا جاتا۔

غزوۂ بدر جو کہ اسلام اور کفر کی پہلی فیصلہ کن جنگ تھی اس میں ستر کافر مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے تھے۔ قید میں آنے والوں کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ مختلف مشورے سامنے آئے کہ انہیں قتل بھی کر سکتے ہیں، احساناً بھی چھوڑ سکتے ہیں، فدیہ لے کر بھی چھوڑ سکتے ہیں اور غلام بھی بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ فدیہ لے کر قیدی چھوڑنے کا فیصلہ ہوا۔ اسی طرح غزوۂ حنین میں سارے قیدی ویسے ہی احساناً چھوڑ دیے گئے۔ لیکن بہت سی جنگوں میں گرفتار ہونے والوں کو قید کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ جب قیدی بنانے کی نوبت آتی تو چونکہ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں

ہوا کرتے تھے اس لیے ان قیدیوں کو غلاموں کی صورت میں مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ غلامی کی یہ شکل اسلام نے برقرار تو رکھی لیکن اس میں اصلاحات کیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے غلاموں کے متعلق ایسے احکامات دیئے جن سے لوگ غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے میں محتاط ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی غلطیوں کے بدلے میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً قسم کھا کر توڑ دی تو اس کے بدلے میں غلام آزاد کرو، قتلِ خطا ہو گیا تو غلام آزاد کرو، بیوی کو غلطی سے محرمات میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دے دی جسے ظہار کہتے ہیں تو غلام آزاد کرو۔ اسی طرح یہ حکم دیا گیا کہ اگر لونڈی سے بچہ پیدا ہو گیا ہے تو اس ماں کو 'ام الولد' کہا جاتا ہے اور اس کو فروخت کرنا حرام ہے اور مالک کے مرنے کے بعد وہ آزادی کی مستحق ہو گی۔ اسلام نے اِن اصلاحات کے ساتھ غلامی کی اس شکل کو جائز رکھا اس صورت میں کہ جب جنگی قیدیوں کے ساتھ اور کوئی سلوک کرنے کی گنجائش نہ ہو۔

بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایات میں جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اَطْعِمُوْھُمْ مِمَّا تُطْعِمُوْنَ وَالْبِسُوْھُمْ مِمَّا تُلْبِسُوْنَ کہ جو خود کھاتے ہو انہیں بھی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو انہیں بھی پہناؤ، ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام مت لو، اگر کام ان کی ہمت سے زیادہ ہے تو خود ساتھ مل کر ان کی مدد کرو۔ یعنی اسلام نے غلاموں کے معاشرتی مقام میں ایک عملی تبدیلی کرتے ہوئے یہ تعلیم دی کہ ان کا مقام یہ نہیں ہے کہ وہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کریں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور کام کاج کے معیار میں وہ تمہارے برابر ہوں یعنی عملی طور پر ان کا مقام خادم کا ہو نہ کہ غلام کا۔

حضرت زید بن حارثہؓ بھی ایک آزاد خاندان کے فرد تھے راستے میں سفر کرتے ہوئے کسی نے پکڑا اور بیچ دیا، یہ حضرت خدیجہؓ کی ملکیت میں آئے انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضور ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا لیکن وہ آزادی کے بعد بھی آپ ﷺ کی خدمت میں رہے۔ حضور ﷺ نے انہیں متبنّٰی یعنی منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا اور وہ اس وقت تک حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے رہے جب تک اس کی ممانعت کے احکامات

نازل نہیں ہوئے۔ یہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن کریم میں ہے۔ حضرت زید بن حارثہؓ کے خاندان کو معلوم ہوا تو وہ لوگ انہیں ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب حضور ﷺ زید بن حارثہؓ کو آزاد کر چکے تھے۔ خاندان کے لوگ آئے کہ ہمارا ایک بچہ تھا جسے کچھ لوگوں نے غلام بنا کر بیچ دیا ہے ہم اس کی تلاش میں ہیں، اس طرح وہ زید بن حارثہؓ تک پہنچ گئے۔ خاندان والوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ ہم اسے واپس لے جانا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ خاندان کے لوگ چچا اور بھائی وغیرہ نے حضرت زیدؓ سے کہا کہ ہمارے ساتھ چلو۔ حضرت زید بن حارثہؓ نے کہا یہ ٹھیک ہے کہ آپ میرے خاندان کے لوگ ہیں چچا ہیں تایا ہیں بھائی ہیں لیکن جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے مجھے کائنات میں اور کہیں نہیں ملے گا، میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ ایک غلام کے ساتھ جناب نبی کریم ﷺ کے حسنِ سلوک کی یہ ایک بہترین مثال ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی کہہ رہے ہیں کہ میں تو غلام ہی بہتر ہوں۔ پہلے غلام بنانے سے بنا تھا اب اپنی مرضی سے بن رہا ہوں۔ اس غلامی سے مراد حضور ﷺ کی خدمت تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو حضور ﷺ کا خادم بنانے میں سعادت سمجھی۔ یہ حضور ﷺ کا حسنِ سلوک تھا کہ ایک اجنبی غلام جسے اس کا خاندان مل جاتا ہے لیکن وہ اپنے خاندان کے ساتھ جانے کے بجائے جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔

غلاموں کے ساتھ آپ ﷺ نے کیا سلوک کیا اور اپنے اصحابؓ کو کس سلوک کی تلقین کی اس کے متعلق بیسیوں روایات ہیں۔ ایک انصاری صحابیؓ حضرت ابو مسعودؓ نے اپنے غلام کو کسی بات پر تھپڑ مار دیا۔ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے غلام کو تھپڑ مارا ہے؟ صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ جی! میں نے اس سے ایک کام کہا تھا جو اس نے نہیں کیا تو میں نے اس پر اسے تھپڑ مارا۔ فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے اوپر بھی کوئی طاقت ہے جو تمہارے تھپڑ پر تمہیں سزا دے سکتی ہے۔ صحابیؓ نے کہا یارسول اللہ غلطی ہو گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا اس غلطی کی تلافی؟ صحابیؓ نے کہا یارسول اللہ میں اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو اللہ کے عذاب کا شکار ہوتے۔

اسلام نے غلامی کا وہ تصور پیش کیا کہ جس میں مالک اپنے غلام کو اپنے جیسے کپڑے پہنائے اپنے جیسا کھانا کھلائے اور اپنے جیسی زندگی کی سہولتیں مہیا کرے۔ ایسی غلامی کہ جس میں مالک کے اپنے غلام کو تھپڑ تک مارنے پر وعید ہے۔ جنگی قیدیوں کے لیے ایسی غلامی تو کسی آسان سے آسان قید سے بھی کئی گنا بہتر ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے اپنی تعلیمات سے غلاموں کا معاملہ اتنا حساس بنا دیا کہ لوگوں نے معمولی زیادتی ہو جانے پر غلاموں کو آزاد کرنا شروع کر دیا۔ ایک غزوہ میں جناب نبی کریم ﷺ کو فتح حاصل ہوئی اور مخالف قبیلے کے لوگ قیدی ہو کر آ گئے جن میں غلام بھی تھے اور لونڈیاں بھی۔ حضور ﷺ کے حصے میں قبیلے کے سردار کی بیٹی آ گئی، کسی نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس شہزادی کو اگر آپ اپنی بیوی ہونے کا اعزاز دیں تو پورا قبیلہ مسلمان ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں شہزادی کو آزاد کرتا ہوں۔ آزاد کرنے کے بعد حضور ﷺ نے شادی کی پیشکش کی تو شہزادی نے اسے اپنے لیے ایک بہت بڑا اعزاز سمجھا اور ہاں کر دی۔ یہ ام المؤمنین حضرت جویریہؓ تھیں۔ جب یہ شادی ہوئی تو صحابہؓ نے سوچا کہ حضور ﷺ کے سسرال والے ہماری غلامی میں رہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تمام صحابہؓ نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ حضور ﷺ کے سسرال کی کوئی بندی یا کوئی بندہ ہماری غلامی میں نہیں رہے گا۔ حضرت جویریہؓ سے لوگ کہا کرتے تھے کہ تم اپنے خاندان کے لیے کتنی خوش قسمت ثابت ہوئی ہو کہ خود ام المؤمنین بن گئی ہو اور تمہارا قبیلہ نہ صرف تمہاری وجہ سے آزاد ہوا بلکہ مسلمان بھی ہو گیا۔

آج کے دور میں غلامی

لوگ پوچھتے ہیں کہ آج کے دور میں غلامی کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟ غلاموں اور لونڈیوں کا قرآن کریم میں بھی ذکر ہے اور حدیث میں بھی اور یہ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں غلامی مسلمانوں میں رائج بھی رہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آج کے دور میں غلامی کے اسباب موجود نہیں ہیں اور آج کے دور میں جو جنگی قیدی ہوتے ہیں ان کے متعلق بین الاقوامی معاہدات موجود ہیں۔ اسلام بین

الاقوامی معاہدات کا احترام کرتا ہے۔ بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں ایک اصولی بات عرض کروں گا کہ جو بات ہمارے کسی شرعی حکم سے نہ ٹکراتی ہو، اسلام ہمیں ایسے بین الاقوامی معاہدات کے احترام کا درس دیتا ہے۔ہاں اگر کوئی معاہدہ یا کوئی بات نص صریح سے ٹکرائے اور ہمارے شرعی اصولوں میں اس کا کوئی جواز نہ نکلتا ہو تو اس کی بات الگ ہے۔ ایک مثال سے دیکھ لیں کہ اسلام بین الاقوامی عُرف اور معاہدات کا کس حد تک احترام کرتا ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ کے پاس مسیلمہ کذاب کے دو نمائندے اس کا خط لے کر آئے، مسیلمہ نبوت کا دعوے دار تھا اور یمامہ کا سردار تھا، اس کے پاس بڑی فوج تھی۔ خط کا عنوان کچھ اس طرح تھا من مسیلمہ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ۔ اس نے کہا کہ میں بھی اللہ کا رسول ہوں اور آپ بھی اللہ کے رسول ہیں اس لیے میرے ساتھ معاملات طے کریں۔ نبوت کا دائرہ عمل تقسیم کرلیں کہ لنا و بر ولک مدر شہروں کے پیغمبر آپ بن جائیں اور دیہات کا پیغمبر میں بن جاتا ہوں۔ یعنی اس نے پیش کش کی کہ ہم دونوں مل کر نبوت کرتے ہیں، اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو پھر مجھے اپنا جانشین مقرر کردیں کہ آپ کے بعد میں نبی ہوں گا۔ آپ ﷺ نے مسیلمہ کے دونوں نمائندوں سے پوچھا کہ کیا تم مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نشهد انك رسول الله ہاں آپ کے بارے میں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا نشهد ان مسیلمۃ رسول اللہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ مسیلمہ کی اذان بھی یہی تھی اشهد ان محمد رسول اللہ اس کے بعد اشهد ان مسیلمۃ رسول اللہ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ایک جملہ فرمایا جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں لولا ان الرسل لا تقتل لضربت أعناقکما اگر (دنیا میں) یہ ضابطہ نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہیں کیے جاتے تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔

یہاں سے فقہاء یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ ہم ان بین الاقوامی قوانین کا، عرف کا اور تعامل کا احترام کریں گے جو نص قطعی سے ٹکراتے نہ ہوں۔ اس اصول کی رو سے اسلام نے

جو غلامی کا ایک طریقہ بر قرار رکھا تھا وہ بھی آج کے دور میں عملاً باقی نہیں رہا اس لیے کہ بین الاقوامی معاہدات کی رو سے آج دنیا میں جنگی قیدیوں سے متعلق واضح اصول اور ضابطے موجود ہیں، ان ضابطوں کی کوئی بھی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آج دنیا میں کہیں بھی غلامی کا کوئی امکان موجود نہیں ہے حتیٰ کہ گزشتہ ایک صدی کے دوران دنیا میں کہیں بھی جہاد کے عنوان سے کوئی جنگ لڑی گئی ہے تو اس میں کسی کو غلام یا لونڈی نہیں بنایا گیا اور نہ ہی آج دنیا میں جہاد کے نام سے لڑی جانے والی جنگوں میں کسی کو غلام یا لونڈی بنایا جارہا ہے۔ یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں آج کے بین الاقوامی معاہدات کو امت مسلمہ نے قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ غلامی کے امکان کے نہ ہونے کو ہماری شریعت تسلیم کرتی ہے۔ لیکن اگر کسی وقت دنیا کے حالات تبدیل ہو کر ایسے ہو جائیں کہ پرانی طرز کا کوئی دور واپس آجائے تو اسلام نے اس کی گنجائش رکھی ہے اور اس کے متعلق اسلام کی تعلیمات موجود ہیں۔

میں نے مختصراً یہ بات عرض کی کہ اسلام نے غلام بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ آخری درجے میں اس کی گنجائش رکھتے ہوئے اجازت دی ہے اور وہ بھی حکم کے طور پر نہیں بلکہ ایک آپشن کے درجہ میں ہے۔ پھر اس کے ساتھ خاص ہدایات اور تعلیمات ہیں کہ جن پر عمل پیرا رہنے سے وہ غلامی کا آخری درجہ بھی کچھ عرصہ بعد عملاً ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ کہ آج کے دور میں غلامی کا کوئی تصور اور اسباب موجود نہیں ہیں اور غلامی سے ممانعت کے بین الاقوامی معاہدات موجود ہیں جن کا اسلامی شریعت احترام کرتی ہے۔

غیر مسلموں سے سلوک اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

غیر مسلموں کے ساتھ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات کی نوعیت کیا تھی یہ ایک بڑا موضوع ہے جس کے بیسیوں پہلو ہیں۔ یہ ایک حساس اور پیچیدہ موضوع بھی ہے جس پر میں اصولی طور پر چند گزارشات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ قرآن کریم اور جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت کے حوالے سے کافروں کے ساتھ تعلقات دیکھے جائیں تو اس کی الگ الگ نوعیتیں اور درجات سامنے آتے ہیں جن کے الگ الگ احکام ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی امتِ دعوت

مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی سب سے پہلی نوعیت وہ ہے جس کا دائرہ پوری دنیا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں جناب نبی کریم ﷺ کی امتِ دعوت ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی امت دو طبقوں میں منقسم ہے، ایک امت دعوت اور دوسری امت اِجابت۔ امت دعوت تو ہر انسان ہے خواہ کسی نسل کسی علاقے اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کی سب سے پہلی دعوت یہ تھی یاایھا الناس قولوا لاالٰہ الا اللہ تفلحوا کہ اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تاکہ تم فلاح پاجاؤ۔ جناب نبی کریم ﷺ نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر کھلے بندوں یہ سب سے پہلی دعوت دی تو آپ ﷺ کے سامنے عرب والے، قریش والے اور مکہ والے بیٹھے تھے۔ لیکن حضور ﷺ نے یااہل عرب کہہ کر، یااہل مکہ کہہ کر یاقریش کہہ کر خطاب نہیں کیا بلکہ یاایھا الناس کہہ کر خطاب کیا۔ آپ ﷺ کے سامنے جو لوگ موجود تھے وہ محدود اور مقامی تھے لیکن آپ ﷺ کی دعوت صرف ان کے

لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے تمام بنی نوع انسانوں کے لیے تھی۔ قرآن کریم نے حضور ﷺ کی اس دعوت کی تائید اس طرح سے کی قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃالاعراف:۱۵۸) کہ آپ کہہ دیجیے کہ اے (دنیا جہان کے) لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔

آج کے دور میں جدید تہذیب کے علمبرداروں کا ایک بڑا مغالطہ ہے کہ گلوبلائزیشن اور انٹرنیشنلزم کے داعی وہ ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں گلوبلائزیشن کا سب سے پہلا اعلان صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر جناب رسول اللہ ﷺ نے کیا، یہ گلوبلائزیشن کا اور انٹرنیشنلزم کا پہلا اعلان تھا۔ حضور ﷺ نے جب یہ اعلان فرمایا تو اس کے ٹھیک اکیس سال بعد اسی صفا کے دامن میں منیٰ کے مقام پر حضور ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کی صورت میں گلوبلائزیشن کے چارٹر کا اعلان کیا۔ میں نے عرض کیا کہ پوری نسل انسانی جناب نبی کریم ﷺ کی امتِ دعوت ہے اور ظاہر بات ہے کہ جب ہم مسلمان کسی کو دعوت دیں گے تو دعوت کا ماحول پیدا کرنا بھی ضروری ہے اس لیے کہ دعوت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ہم عملی طور پر جیسے کیسے بھی ہیں بہر حال جناب رسول اکرم ﷺ کے مشن کے نمائندے ہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کام میں جو تکلیفیں برداشت کیں، بھوک برداشت کی، طعنے برداشت کیے اور جس طرح سے اس مشن کی راہ میں آپ ﷺ نے صبر و حوصلے سے کام لیا، یہ دعوت کے اس میدان میں آج بھی آپ ﷺ کی سنت ہے اور قیامت تک آپ ﷺ کی سنت رہے گی۔ چنانچہ جب ہم دعوت کی بات کریں گے اور نسل انسانی کو اسلام کے دائرے میں لانے کی کوشش کریں گے تو ہمیں دعوت کے یہ تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔

غیر مزاحم کفار

غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات کی دوسری نوعیت میں وہ کفار آتے ہیں جنہیں اسلام کی دعوت ملی لیکن انہوں نے نہ تو اس دعوت کو قبول کیا اور نہ ہی اس کی راہ میں مزاحم

بنے۔ کافروں کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جنہیں ہماری دعوت پہنچتی ہے تو وہ اسے قبول نہیں کرتے لیکن ہماری دعوت میں رکاوٹ بھی نہیں بنتے۔ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ تم دنیا میں لوگوں کو مسلمان بناتے رہو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ہم مسلمان نہیں بنیں گے۔ ایسے کافر جو دعوتِ اسلام بھی قبول نہ کریں اور اس کی راہ میں رکاوٹ بھی نہ بنیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی کیٹیگری اس طرح بیان کی ہے لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (سورۃ الممتحنۃ: ۸) کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ کافر جو تم سے لڑتے نہیں، تمہاری دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے، تم پر ظلم و ستم نہیں کرتے اور ایسے لوگ بطور انسان تمہارے ساتھ معاملات رکھنا چاہتے ہیں، تمہارے خلاف کسی مہم میں شریک نہیں ہیں تو اسلام کہتا ہے کہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ کاروبار بھی کر سکتے ہو اور حسنِ سلوک و برابری کا معاملہ بھی کر سکتے ہو۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جیسے دنیا میں اقوام کے ساتھ برابری کے اور خوش اسلوبی کے تعلقات ہوتے ہیں ایسے ہی تم بھی بین الاقوامی برادری میں رہتے ہوئے ان کافروں کے ساتھ برابری کے معاملات رکھ سکتے ہو۔

دعوتِ اسلام کی راہ میں حائل کفار

مسلم و غیر مسلم تعلقات کی تیسری نوعیت میں وہ کافر آتے ہیں جو دعوتِ اسلام میں رکاوٹ ہوں۔ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ (سورۃ الممتحنۃ: ۹) کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں (کے ساتھ دوستی) سے منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور تمہیں گھر سے نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی ہو اور جو شخص ایسوں سے دوستی کرے گا سو وہ گناہ گار ہوں گے۔ یعنی جو غیر مسلم دعوتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، تم سے لڑتے ہیں، تم پر ظلم و ستم کرتے ہیں، تمہیں گھروں سے نکالتے ہیں

ان کے ساتھ دوستی نہیں کرو بلکہ ان کے ساتھ جیسے دنیا میں دشمنی کا معاملہ ہوتا ہے ویسے ہی معاملہ ہونا چاہیے۔ جناب نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ بھی یہی ہے۔

اسلامی ریاست میں رہنے والے کفار

مسلم وغیر مسلم تعلقات کی چوتھی نوعیت میں وہ کافر آتے ہیں جو مسلمان ریاست میں رہتے ہوئے ریاست کی بالادستی کو قبول کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو ذمی کہا جاتا ہے۔ ذمی حقارت کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اعزاز ہے کہ اسلامی ریاست اپنے اندر رہنے والے غیر مسلموں کی جان، مال اور آبرو کی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے زخمی ہونے کے بعد جب طبیبوں نے ان سے کہا کہ اب تو بظاہر زندگی کا امکان نہیں ہے اس لیے جو وصیت وغیرہ کرنی ہے کر دیں۔ حضرت عمرؓ زخمی ہونے کے بعد گھر لائے گئے تھے، انہیں دودھ پلایا گیا تو وہ زخمی انتڑیوں کے راستے سے باہر نکل گیا، پھر شہد پلایا گیا تو وہ بھی انتڑیوں کے راستے نکل گیا۔ طبیبوں نے کہہ دیا کہ حضرت ہمارے حساب سے تو آپ کا وقت آگیا ہے اللہ زندگی دے تو دے بظاہر امکان نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس حالت میں چند وصیتیں کیں، ان میں سے ایک وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں بطور خاص ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے درمیان رہنے والے غیر مسلموں کی جان، مال اور آبرو کے تم محافظ ہو، ان کی بابت قیامت کے دن تم سے پوچھا جائے گا۔

محدثین فرماتے ہیں کہ اس وصیت کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کو زخمی کرنے والا ایک غیر مسلم مجوسی شخص تھا، حضرت عمرؓ کو یہ خدشہ تھا کہ مسلمان کہیں رد عمل میں غیر مسلموں پر نہ چڑھ دوڑیں۔ امیر المؤمنین کے قتل سے زیادہ سنگین جرم کیا ہوگا، کسی غیر مسلم کا مسلمانوں پر اس سے بڑا حملہ کیا ہوگا کہ حضرت عمرؓ جیسے امیر المؤمنین کو شہید کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ کافروں کی چوتھی کیٹیگری ہے کہ وہ اسلامی ریاست کی بالادستی کو قبول کرتے ہوئے ایک مسلمان ملک میں رہتے ہیں، ریاست ان کی جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔

منافقین

مسلم و غیر مسلم تعلقات کی پانچویں نوعیت میں وہ لوگ آتے ہیں جنہیں قرآن کریم نے منافقین کے نام سے ذکر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں جب حضور ﷺ مدینہ منورہ کے حکمران تھے اور ریاست کا انتظام آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھا اس دور میں منافقین سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ غزوۂ احد میں ان کا تناسب یہ تھا کہ ایک ہزار میں سے تین سو منافقین نکل گئے تھے اور مسلمان لشکر میں سات سو باقی بچے تھے۔ منافقین نے فتنے بھی پیدا کیے اور سازشیں بھی کیں۔ قرآن کریم میں ان کے فتنوں کا ذکر ہے، غزوہ تبوک کے حوالے سے بھی اور دیگر متعدد حوالوں سے بھی۔ منافقین نے مسجد کے نام پر مخالف مورچہ بھی لگایا جسے قرآن کریم نے مسجد ضرار کا نام دیا وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (سورۃ التوبہ:۱۰۷) اور جنہوں نے نقصان پہنچانے اور کفر کرنے اور مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کے لیے مسجد بنائی ہے اور ان لوگوں کے لیے مورچہ بنانے کے واسطے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے لڑ چکے ہیں۔ چنانچہ مدینہ کے منافقین نے منافقت کی وہ ساری حرکتیں کیں جو وہ کر سکتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے متعلق صاف کہا اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْھَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُہٗ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (سورۃ المنافقون:۱) کہ جب منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ (یہ بات) جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک منافقین (دل سے گواہی دینے میں) جھوٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ لوگ آپ ﷺ کو دل سے اللہ کا رسول ماننے میں جھوٹ بولتے ہیں۔ یعنی ان کے کافر اور منافق ہونے پر قرآن کریم نص قطعی کے طور پر گواہی دے رہا ہے۔ ایک موقع پر تو یہ کہا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ۝ (سورۃ البقرہ:۸۔۹) اور کچھ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت کے دن

پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم میں یہ صراحتیں موجود ہیں کہ یہ مومن نہیں ہیں بلکہ جھوٹے اور دھوکے باز ہیں۔

بظاہر تو یہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ رہے، صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر نمازیں بھی پڑھتے رہے، روزے بھی رکھتے رہے اور جہاد میں بھی جاتے رہے۔ لیکن درپردہ وہ فتنے کھڑے کرتے تھے اور سازشوں کے تانے بانے بنتے تھے۔ چند مرتبہ تو ایسا ہوا کہ جناب نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا ان منافقین کو قتل نہ کر دیا جائے؟ حضرت خالد بن ولیدؓ نے بھی حضور ﷺ سے سوال کیا اور حضرت عمرؓ نے بھی۔ ایک دفعہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے بیٹے نے بھی آپ ﷺ سے سوال کیا۔ باپ اور بیٹے دونوں کا نام عبد اللہ تھا۔ باپ پکا منافق جبکہ بیٹا پکا مسلمان تھا۔ عبد اللہ بن عبد اللہ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! یہ لوگ اتنا فتنہ پھیلاتے ہیں اتنا شر پیدا کرتے ہیں کیا ہم انہیں قتل نہ کر دیں؟ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے منع کر دیا اور آپ ﷺ نے پھر اس کی وجہ بیان کی۔ آپ ﷺ اللہ کے پیغمبر تھے اور اللہ کے پیغمبر سے زیادہ صاحبِ بصیرت کون ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ یہ بات تو صرف تم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ لوگ بے ایمان ہیں، باقی دنیا کی نظر میں تو یہ مسلمان ہیں، انہیں قتل کرو گے تو دنیا میں یہ پروپیگنڈہ ہو گا کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ ہمارے ساتھ دین و دنیا کے تمام معاملات میں شریک ہوتے ہیں اور ان میں ایسی بات نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ لوگ کافر اور منافق ہیں۔ اس لیے چند مخصوص مسلمانوں کے علاوہ باقی لوگ تو یہی کہیں گے کہ محمد ﷺ نے کسی وجہ سے اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیا ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے عمومی تاثر کا لحاظ رکھتے ہوئے ان منافقین کی شر پسندی کو برداشت کیا۔ یہ جناب نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ ہے کہ کوئی بھی کام کرنے اور بالخصوص اجتماعی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے معاشرتی اثرات و نتائج اور پبلک ری ایکشن دیکھا جائے کہ لوگ اسے کس نظر سے دیکھیں گے۔ حضرت عمرؓ نے تو آپ ﷺ سے اجازت مانگی کہ یارسول اللہ! منافق کی گردن اڑا دوں؟

آپ ﷺ نے فرمایا خدا کے بندے! لوگ کیا کہیں گے کہ مسلمانوں نے اپنے ساتھی کو مار دیا، یہ بات دعوتِ اسلام میں رکاوٹ بنے گی۔ گویا جناب نبی کریم ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے عمومی تاثر دیکھا جانا چاہیے۔

یہ دیکھنا کہ جو کام ہم کرنے جارہے ہیں اس کا عوام میں کیا اثر ہوگا، اسلام کے حق میں ہوگا یا اسلام کے خلاف، اس کا لحاظ رکھنا حکمت کے تقاضوں میں سے ہے۔ بیت اللہ شریف کی موجودہ عمارت ابراہیمیؑ بنیادوں پر نہیں ہے۔ کعبہ کے باہر جو حطیم کی جگہ ہے یہ اصل میں بیت اللہ کا حصہ تھی۔ کعبہ کے دو دروازے ہوا کرتے تھے اور یہ دروازے زمین کی سطح کے برابر ہوتے تھے۔ قریش نے جب حضورِ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ کی جوانی کے زمانے میں خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی تو یہ تبدیلیاں انہوں نے کیں کہ حطیم کو کعبہ کی عمارت سے باہر نکال دیا، دو کی جگہ صرف ایک دروازہ باقی رہنے دیا اور دروازے کی سطح زمین سے اونچی کر دی۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد خانہ کعبہ کی تعمیر کو پرانی طرز پر واپس لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا، بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں قریش کی اس تعمیر کو ختم کر کے ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کر دوں۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ابراہیمی تعمیر کیا تھی۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایسا نہیں کروں گا اس لیے کہ لولا حدیث عهد قومِ بالجاهلية تیری قوم قریش نئی نئی مسلمان ہوئی ہے کہیں یہ تاثر نہ لے لے کہ ان لوگوں نے ہمارا تعمیر کیا ہوا قبلہ بھی برداشت نہیں کیا۔ ورنہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس تعمیر کو گرا کر ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کروں۔

اللہ کی قدرت کہ عبد اللہ بن زبیرؓ نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے یہ بات سن رکھی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ خانہ کعبہ کی ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر ہو۔ جب عبد اللہ بن زبیرؓ حجاز کے حاکم بنے تو انہوں نے حجاج بن یوسف کے ساتھ جنگ کے دوران خانہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچنے کے بعد خالہ محترمہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ

کی خواہش کی تکمیل کے لیے بیت اللہ کی عمارت گرائی اور اسے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کر دیا۔ زمین کی سطح کے برابر کعبہ کے دو دروازے بنائے اور حطیم کو چھت کے اندر کر دیا۔ عبد اللہ بن زبیرؓ کے خلاف حجاج بن یوسف نے چڑھائی کر کے بیت اللہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اس لڑائی میں عبد اللہ بن زبیرؓ شہید ہوگئے اور حجاز پر بنو امیہ کی خلافت کا قبضہ ہو گیا۔ حجاج بن یوسفؒ نے بیت اللہ کی عمارت گرا کر دوبارہ قریش کی طرز پر کعبہ تعمیر کروا دیا۔ بنو امیہ کی خلافت کا زمانہ ختم ہوا تو بنو عباس کی خلافت کا زمانہ آ گیا، بنو عباس کے ابتدائی دور میں انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم اسے پھر گراتے ہیں اور ابراہیمی طرز پر دوبارہ تعمیر کر دیتے ہیں۔ یہ حضرت امام مالکؒ کا دور تھا جو کہ اس وقت کے علمی فرمانروا تھے، اس وقت عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم حضرت امام مالکؒ تھے۔ امام دار الھجرہ، امام اہل سنت، امام المدینۃ، ان کا عالم اسلام میں فتویٰ چلتا تھا۔ انہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ میں امام مالک بن انسؒ بطور امام مدینہ کے فتویٰ دیتا ہوں کہ یہ بیت اللہ شریف جس طرزِ تعمیر پر ہے، قیامت تک اسی طرزِ تعمیر پر رہے گا۔ یہ تم لوگوں نے کیا تماشا لگایا ہوا ہے کہ جو صاحب اثر خلیفہ آتا ہے وہ پہلے سے موجود عمارت گرا کر اپنی مرضی کا کعبہ تعمیر کر دیتا ہے، ایسے تو کعبہ حکمرانوں کے لیے کھلونا بن جائے گا، اس لیے اب اس کعبہ کو ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امام صاحبؒ کے فتوے میں اتنی برکت دی کہ کعبہ کی طرزِ تعمیر آج تک قائم ہے۔ مسلمانوں کے علمی حلقوں میں اب بھی ایک ایسی تحریک موجود ہے اور میری نظر سے ان کی ایک کتاب گزری ہے کہ کعبہ کی تعمیر ابراہیمی بنیادوں پر ہونی چاہیے لیکن امام صاحب کے فتوے میں اللہ تعالیٰ نے اتنی جان ڈال دی تھی کہ یہ بحث صرف علمی حلقوں تک ہی محدود رہی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ کسی بھی عمل کا ردعمل کیا ہو گا اور اس کے نتیجے میں عوام الناس کا تاثر کیا ہو گا، اس کا خیال رکھنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ چنانچہ باوجود معلوم ہونے کے کہ یہ لوگ منافقین ہیں اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، حالات کے تقاضوں کے مطابق ان کے ساتھ عمومی طور پر مسلمانوں والا معاملہ ہی کیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کا کفار کے ساتھ معاملہ

میں نے اصولی طور پر کافروں کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں جن کے متعلق اسلام میں الگ الگ احکام ہیں۔ کفار کے معاملے میں جناب رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل کیا تھا اس کے لیے میں چند واقعات ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ میں یہودی اور منافق کا آپس میں جھگڑا ہو گیا، یہ زمین کی حد بندی کے متعلق ایک تنازعہ تھا۔ دونوں اپنا مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے، ایک طرف کلمہ گو تھا جبکہ دوسری طرف یہودی تھا۔ کلمہ گو در اصل ایک منافق تھا اور نبی کریم ﷺ کے پاس اِس ارادے سے گیا تھا کہ آپ ﷺ بہر حال اس معاملے میں ایک مسلمان کا لحاظ کریں گے۔ یعنی آپ ﷺ اپنی جماعت کے اور اپنے دھڑے کے آدمی کا خیال کریں گے۔ لیکن اگر اللہ کے پیغمبر ﷺ نے بھی دھڑے بندی کی بنیاد پر ہی فیصلے کرنے تھے تو پھر دنیا میں انصاف کا فیصلہ اور کون کرتا۔ حضور ﷺ نے ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر فرمایا تھا من یعدل اذ لم اعدل کہ اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو اور کون انصاف کرے گا۔ چنانچہ جناب نبی کریم ﷺ نے انصاف کے مطابق یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حضور ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے مفاد سے بالاتر ہو کر اور قانونی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انصاف پر مبنی فیصلہ کرو۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر جناب نبی کریم ﷺ نے خیبر کے قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا، آپ ﷺ اپنے لشکر کے ساتھ اچانک وہاں جا پہنچے تھے۔ یہ حضور ﷺ کی جنگی حکمت عملی ہوتی تھی کہ مدینہ سے نکلتے وقت عام اعلان نہیں فرماتے تھے کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ صرف تبوک کی جنگ سے پہلے حضور ﷺ نے یہ اعلان کیا کہ ایک بڑی طاقت رومیوں سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے اس لیے پوری تیاری کر لو۔ چنانچہ جب آپ ﷺ کا لشکر خیبر پہنچا تو ان لوگوں کو بالکل خبر نہ تھی، ان کے کسان صبح کے وقت زمینوں پر کام کاج کے لیے نکل رہے تھے، دیکھا کہ اسلام کا لشکر آن پہنچا ہے۔ وہ بھاگے بھاگے یہ کہتے ہوئے واپس گئے محمد والخمیس، محمد والخمیس محمد آ گئے، لشکر

آگیا۔ محمد آگئے، لشکر آگیا۔ قلعے کے دروازے وغیرہ بند ہو گئے اور اسلامی لشکر نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ عبد اسود کے نام سے ایک غلام تھا جو وہاں کسی خاندان کی بکریاں چرا رہا تھا۔ اس نے حضور ﷺ سے آپ ﷺ کی دعوت کے متعلق دریافت کیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے اور ایک مسلمان جنت کا مستحق ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں اس لیے آپ مجھے کلمہ پڑھائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے لیکن یہ بکریاں جو تم چرا رہے ہو یہ کس کی ہیں؟ اس نے بتایا کہ یہ بکریاں فلاں شخص کی ہیں اور وہ قلعے کے اندر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اور اس کی بکریاں واپس کر کے آؤ۔ اس نے کہا کہ یارسول اللہ! میں تو اب مسلمان ہو گیا ہوں واپس کیسے جاؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مسلمان ہو گئے ہو لیکن بکریاں تو بہرحال اسی کی ملکیت ہیں اس لیے جاؤ اور واپس کر کے آؤ۔ جناب نبی کریم ﷺ نے حالت جنگ میں ایک دشمن کی بکریاں اسے واپس دلوا کر یہ تعلیم دی کہ جنگ اپنے مقام پر ہے جبکہ دیانت و امانت اپنے مقام پر ہے۔ صلح و جنگ اور دیانت و انصاف کے تقاضوں کو بیک وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کا طرزِ عمل

مجھ سے بہت سے دوست پوچھتے ہیں کہ یہاں امریکہ کے مسلمانوں کو نائن الیون کے بعد کی اس مسلم و غیر مسلم کشمکش کی فضا میں کیا کرنا چاہیے۔ یہ ایک نازک، سنگین اور لازمی سوال ہے۔ دنیا میں اِس وقت صورتحال یہ ہے کہ بہت سی جگہوں پر مسلمان اور کافر حالت جنگ میں ہیں۔ اس صورتحال میں ایسے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے جو ان غیر مسلم ممالک میں رہتے ہیں جو کسی نہ کسی درجے میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں ملوث ہیں۔ میں اس کے دو جواب دیا کرتا ہوں۔

پہلا جواب یہ کہ انہیں وہی کرنا چاہیے جو حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے کیا تھا۔ غزوۂ بدر اسلامی تاریخ کا سب سے سنگین معرکہ تھا جب مسلمانوں کے پاس بقدرِ ضرورت نہ تو افرادی قوت تھی اور نہ اسلحہ تھا۔ چند تلواریں، چند گھوڑے، ستر اونٹ اور بچے اور بوڑھے ملا کر ۳۱۳ افراد تھے۔ مقابلے پر ۱۰۰۰ کا قریشی لشکر جو ہر طرح کے اسلحہ کے ساز و سامان سے لیس تھا۔

حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ، یہ اپنے وطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے نکلے کہ اب مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے درمیان لڑائی کا مرحلہ آنے والا ہے اس لیے ہم حضور ﷺ کی خدمت میں جاتے ہیں تاکہ قریشیوں کے ساتھ جنگ کی صورت میں ہم حضور ﷺ کے لشکر شامل ہو سکیں۔ راستے میں کفارِ مکہ کے قافلے نے پکڑ لیا انہوں نے پوچھا کہ تم دونوں باپ بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ اِنہوں نے بتایا کہ یثرب جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا! ہمارے خلاف لڑائی میں شریک ہونے کے لیے جا رہے ہو؟ اِن باپ بیٹا نے گول مول جواب دینے کی کوشش کی لیکن کفار کے لوگ ان کی اصل نیت بھانپ گئے۔ چنانچہ انہوں نے گرفتار کر کے چند دن اِنہیں اپنے پاس رکھا پھر قافلے والوں نے کہا کہ ہم تم باپ بیٹے کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ تم ہمارے ساتھ وعدہ کرو کہ ہمارے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہو گے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد نے کفارِ مکہ سے جان چھڑانے کی خاطر یہ حلف اٹھالیا کہ ہم مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے درمیان ہونے والی اس جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ یہ مدینہ منورہ پہنچ کر حضور ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے بدر کے میدان میں آ گئے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچتے ہی انہوں نے سارا واقعہ آپ ﷺ سے عرض کر دیا کہ ہم گرفتار ہو گئے تھے اور ہمیں اس شرط پر چھوڑا گیا ہے کہ ان کے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم لوگوں نے حلف اٹھایا؟ حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! ہاں ہم نے حلف اٹھایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں یثرب جاؤ تم لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ اسلام اور کفر کے درمیان پہلا معرکہ تھا جب اسلامی لشکر کو ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ کفار کے ساتھ اپنے وعدہ کی پاسداری میں بدر کے میدان میں موجود ہوتے ہوئے بھی لڑائی میں شریک نہ ہو سکے، حضور ﷺ نے انہیں مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ چنانچہ غیر مسلم ممالک مین رہائش پذیر مسلمانوں کو میرا پہلا جواب یہ ہوتا ہے کہ آپ اِن ممالک میں رہتے ہوئے جن معاہدات کے پابند ہیں ان کی پاسداری کرنا اسلام کی رو سے آپ پر لازمی ہے۔

دوسرا جواب اس سے ذرا نازک ہے۔ نائن الیون کے کچھ عرصہ بعد میں لندن گیا تو وہاں ایک ٹی وی والوں نے مجھے ایک پروگرام میں بلالیا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ یہاں (غیر مسلم ممالک) کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ بے حد جذباتی فضا میں ایک بہت حساس سوال تھا۔ میں نے کہا کہ میرا یہاں کے مسلمانوں کو مشورہ ہے کہ انہیں اس معاملے میں یہودیوں کی پیروی کرنی چاہیے۔ انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ ایک مولوی صاحب مسلمانوں کو یہ کیا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک یہودی اپنی کیمونٹی کے لیے مشکلات پیدا نہیں کرتا، قانون اور معاہدات کی پابندی بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دین اور اپنی ریاست اسرائیل کے لیے کام بھی کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہمیں یہودیوں سے طریقہ سیکھ کر اپنا کام کرنا چاہیے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کلمة الحکمة ضالة المؤمن کہ دانائی کی بات جہاں سے ملے لے لو وہ مومن کی گمشدہ میراث ہے۔

میں نے عرض کیا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں دیانت و عدل کی تلقین کی ہے اور ہر معاملے میں اخلاقیات کی پاسداری کا سبق دیا ہے۔ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ معاملات میں توازن قائم کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سنت نبوی ﷺ کی صحیح معنوں میں پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

فرقہ وارانہ کشمکش اور اصول انسانیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ
وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد (IPS) نے ریڈ کراس کی انٹرنیشنل کمیٹی (ICRC) کے اشتراک سے ۲۷ و ۲۸ اگست ۲۰۱۹ء کو "اسلام اور اصول انسانیت" کے عنوان پر دو روزہ قومی کانفرنس کا اہتمام کیا جس کی مختلف نشستوں میں سرکردہ اصحاب فکر و دانش نے انسانیت اور انسانی حقوق کے حوالہ سے اسلامی تعلیمات و احکام کے متعدد پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ مجھے ۲۸ اگست کو کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں معروضات پیش کرنے کے لیے کہا گیا جس کی صدارت اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز نے کی جبکہ معاون صدر دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر سہیل حسن تھے اور ان کے علاوہ اظہار خیال کرنے والوں میں مولانا محمد یاسین ظفر، ڈاکٹر شمس الحق حنیف، ڈاکٹر محمد اقبال خلیل، جناب خالد رحمان، ڈاکٹر عطاء الرحمان اور ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی شامل ہیں۔ میری گزارشات کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

میری گفتگو کا عنوان "فرقہ وارانہ کشیدگی اور اصول انسانیت" ہے اور مجھے انسانی معاشرہ کی مختلف حوالوں سے تفریق کے متنوع دائروں میں انسانی اصول و اخلاق کی پاسداری کے تقاضوں پر کچھ گزارشات پیش کرنی ہیں۔ انسانی سماج میں تفریق کئی حوالوں سے ہمیشہ سے موجود چلی آرہی ہے۔ یہ نسل کے عنوان سے بھی ہے، رنگ اور زبان کے حوالہ سے بھی ہے، مذہب بھی اس کا ایک دائرہ ہے اور وطن، قومیت، علاقہ اور دیگر بہت سے امور اس کے اسباب میں شامل ہیں۔ مگر میں ان میں سے مذہب کے حوالہ سے پائی جانے والی تفریق کی بات کروں گا۔

مذہبی تفریق کا ایک دائرہ اسلام اور کفر کا ہے اور دوسرا دائرہ امت مسلمہ کے داخلی ماحول میں باہمی اختلافات کا ہے، ان میں سے ہر ایک کے بہت سے پہلو ہیں جن کا مختصر وقت میں تذکرہ تو کجا ان کی فہرست پیش کرنا بھی مشکل ہے، اس لیے ہر دائرہ کے دو بڑے پہلوؤں کا ذکر کروں گا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ اسلام اور کفر کا دائرہ سب سے نمایاں ہے کہ انسانی معاشرہ میں مسلمانوں کے ساتھ مسیحی، یہودی، ہندو، بدھ مت، سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور سب کے آپس میں معاملات چلتے رہتے ہیں۔ کافر قوموں کے ساتھ انسانی تعلقات اور اخلاقیات کے حوالہ سے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے چند واقعات کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ تشریف فرما تھے، آپ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ جنازہ گزر جانے کے بعد ساتھیوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تو یہودی کا جنازہ تھا، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "الیست نفساً؟" کیا وہ انسان نہیں ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان یا کافر ہونا اپنے مقام پر مگر بطور انسان احترام کا حق کافر کو بھی اسی طرح حاصل ہے جس طرح کسی مسلمان کا حق ہے۔

جناب رسول اکرم ﷺ پر جب طائف کے اوباش لڑکوں نے پتھراؤ کیا اور آپ زخمی حالت میں اپنے خادم حضرت زید بن حارثہؓ کے ہمراہ مکہ مکرمہ کی طرف اس کیفیت میں واپس آ رہے تھے کہ زخمی تھے اور لڑکے بدستور پیچھا کر رہے تھے، راستہ میں ایک سردار مطعم بن عدی نے یہ منظر دیکھ کر اپنے ڈیرے کا گیٹ کھول دیا اور حضور ﷺ کو ان لڑکوں کے تعاقب سے محفوظ کیا۔ آپ ﷺ نے وہاں کچھ دیر آرام کیا، زخم وغیرہ دھوئے، کچھ کھایا پیا اور مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کو مطعم بن عدی کا یہ احسان یاد تھا، چنانچہ جنگ بدر کے بعد قیدیوں کی رہائی کے فیصلہ کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا، اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان قیدیوں کے بارے میں مجھ سے بات کرتے تو میں ان کی سفارش

پر ان قیدیوں کو ویسے ہی چھوڑ دیتا۔ مطعم بن عدی کافر سردار تھے اور اسی حالت میں انتقال ہوا تھا مگر آنحضرت ﷺ نے ان کے احسان کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ ایک اہم موقع پر اس کا اظہار بھی فرمایا۔

جاہلیت کے دور میں کچھ قبائل نے مظلوموں کی حمایت اور ظلم و جبر کے خاتمہ، نیز ناداروں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کے لیے ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں "حلف الفضول" کے نام سے معروف ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ اس کا تذکرہ فرماتے تھے، اس کی تعریف کرتے تھے اور ایک موقع پر فرمایا کہ اگر آج بھی اس قسم کا کوئی معاہدہ ہو تو میں اس میں شریک ہوں گا۔

اس حوالہ سے میں ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہوں گا کہ بین الاقوامی معاہدات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی ہوتے تھے اور آج بھی دنیا میں بین الاقوامی معاہدات کا دور دورہ ہے، بلکہ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ آج کی دنیا میں اکثر ملکوں پر حکومتوں کی نہیں بلکہ بین الاقوامی معاہدات کی حکومت ہے، ان معاہدات کی تعداد تیس کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے جنہوں نے پوری دنیا کو اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے اور دنیا کا ہر ملک ان کا پابند سمجھا جا رہا ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جس ملک و قوم کے پاس طاقت زیادہ ہے یا جس کے پاس دولت زیادہ ہے وہ ان معاہدات کی جکڑ بندی سے اپنے لیے راستہ نکال لیتا ہے، مگر جو ہماری طرح طاقت و دولت میں کمزور ہے اسے بہر صورت ان معاہدات کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اس پس منظر میں اصحاب فکر و دانش سے میری ہمیشہ یہ گزارش رہتی ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے دور کے بین الاقوامی معاہدات اور آج کے دور کے بین الاقوامی معاہدات پر تحقیق و مطالعہ کا کام ہونا چاہیے اور آنحضرت ﷺ کی سیرت و اسوہ کی روشنی میں ہمیں آج کے بین الاقوامی معاہدات کے ماحول میں اپنا طرز عمل طے کرنا چاہیے۔

جناب رسول اکرم ﷺ نے جنگ کے ماحول میں جو ہدایات دی ہیں وہ انسانی احترام اور اخلاقیات کی اعلیٰ ترین مثال ہیں اور میری گزارش ہے کہ جنگی اخلاقیات کا جو معیار اسلام

اور جناب نبی کریم ﷺ نے پیش کیا تھا اسے دوبارہ دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو، صرف اسی پر ہتھیار اٹھاؤ جو جنگ میں شریک ہے، اور املاک کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ مگر آج کے جدید ہتھیاروں نے یہ سارے دائرے توڑ دیے ہیں اور حالت جنگ میں انسانی اخلاقیات کے اصولوں کو قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔ اصحاب دانش سے میری گزارش ہے کہ اگرچہ ہم بھی مجبوراً آج کے ہتھیاروں کو استعمال کر رہے ہیں جو جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کردہ جنگی اصولوں اور اخلاقیات کے منافی ہیں، مگر ہمیں اسلام کے ان اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا تذکرہ تو نہیں چھوڑ دینا چاہیے اور دنیا کو بتاتے رہنا چاہیے کہ اسلام کے جنگی اصول کیا ہیں اور جناب رسول اکرم ﷺ نے کن جنگی اخلاقیات کی تعلیم دی ہے۔

مذہبی تفریق کا دوسرا دائرہ وہ ہے جو امت کے داخلی ماحول میں پایا جاتا ہے اور اس کے بھی بہت سے پہلو ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو کافر کہہ دیتے ہیں اور گمراہ قرار دے دیتے ہیں جس کی بنیاد پر فرقہ واریت کا وسیع ماحول بن جاتا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے اس لیے صرف ایک پہلو پر عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں جن لوگوں کو ان کے کلمہ پڑھنے کے باوجود قرآن کریم نے "وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ" کہا اور ان کے بارے میں فرمایا کہ "وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ" اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہیں اور جن کو مدینہ منورہ میں ایک متوازی مرکز "مسجد ضرار" تعمیر کرنے کی کوشش پر قرآن کریم نے "كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا ۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" کا مصداق قرار دیا، ان کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا معاشرتی طرز عمل یہ تھا کہ ان کا مرکز تو قائم نہیں ہونے دیا گیا بلکہ اسے گرا کر نذر آتش کر دیا گیا، لیکن ان کے ساتھ معاشرتی تفریق کا ماحول قائم نہیں ہونے دیا۔

میرا ایک طالب علمانہ سا سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور نبی اکرم ﷺ سے فرمایا کہ "جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" کافروں اور منافقوں

سے جہاد کریں اور ان کے ساتھ سختی کریں، آنحضرت ﷺ نے دس سالہ مدنی دور میں مختلف کافر قوموں کے ساتھ تو بعض روایات کے مطابق ستائیس جنگیں لڑی ہیں مگر منافقوں کے ساتھ ایک لڑائی بھی نہیں کی، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس آیت کریمہ پر عمل نہیں کیا؟ نعوذ باللہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ معاملہ یوں ہے کہ کافروں کے ساتھ تو آپ نے تلوار کا جہاد کیا مگر منافقین کے خلاف حکمت عملی کا جہاد کیا کہ نہ انہیں اپنے ملی معاملات میں دخل انداز ہونے دیا اور نہ ہی اپنے خلاف مدینہ منورہ میں کوئی محاذ قائم کرنے دیا۔ ایسے منافقین کا تناسب جنگ احد کے موقع پر ہزار میں تین سو تھا، مگر صرف آٹھ سال میں جناب نبی اکرم ﷺ کی وفات پر ان کی تعداد چند افراد تک محدود ہو کر رہ گئی تھی جن کے ناموں کا صرف حضرت حذیفہؓ کو علم تھا اور ان پر بھی پابندی تھی کہ وہ ان میں سے کسی کا نام ظاہر نہیں کریں گے، یہ جناب نبی اکرم ﷺ کی معاشرتی حکمت عملی اور تدبر کا شاہکار تھا۔

میں نے کلمہ پڑھنے والوں کے درمیان داخلی تفریق کا صرف ایک دائرہ بیان کیا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دائرے ہیں جن کے بارے میں فقہاء کرام نے مستقل احکام و قوانین بیان فرمائے ہیں ان میں سے کسی ایک سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام اور کفر کے دائرے مختلف حوالوں سے موجود ہیں مگر میری طالب علمانہ رائے ہے کہ معاشرتی تعلقات اور سماجی معاملات کی بنیاد انسانی اخلاقیات اور تقاضوں پر ہوتی ہے، ان دونوں امور کو اپنے اپنے دائرے میں رکھ کر ہی ہم معاملات کو صحیح رخ پر رکھ سکتے ہیں۔

یہاں مجھ سے میری گفتگو کے حوالہ سے سوال کیا گیا ہے کہ کیا قادیانیوں کو بھی ان انسانی اصولوں اور اخلاقیات کے حوالہ سے گنجائش دی جا سکتی ہے؟ میری گزارش ہے کہ ہمارا قادیانیوں کے ساتھ تنازعہ ان کے معاشرتی اور شہری حقوق کے دائرہ میں نہیں ہے بلکہ ان کی طرف سے سماج اور معاشرہ کے متفقہ موقف کو مسترد کرنے کے باعث ہے، اس لیے ان کے ساتھ وہی معاملہ رکھا جا سکتا ہے جو پوری قوم اور سماج کے اتفاقی طرز عمل کی نفی کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر آج قادیانی جماعت سماج کی اجتماعیت کو قبول کر لے اور

معاشرہ کے متفقہ موقف کو تسلیم کر لے تو جیسے باقی غیر مسلم سوسائٹیاں پاکستان میں باعزت شہری کے طور پر رہ رہی ہیں، قادیانیوں کا بھی یہ جائز حق ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پوری قوم اور سماج کے متوازی کھڑے رہنے کی بجائے قومی فیصلوں اور دستور کی بالادستی کو قبول کریں، اس کے سوا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

گھریلو زندگی اور سیرت نبوی ﷺ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

انسان گھریلو زندگی کا آغاز ماں باپ کے زیر سایہ ایک بچے کی حیثیت سے کرتا ہے، بڑا ہوتا ہے تو بہن بھائیوں کا ساتھ میسر آتا ہے، خود مختار ہوتا ہے تو میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہوتا ہے جس کے بعد اولاد کی نوبت آتی ہے، یہ ہر شخص کی گھریلو زندگی کا ایک عمومی خاکہ ہے۔ اور گھر معاشرے کی ایک بنیادی اکائی ہے، اللہ تعالیٰ نے اکیلے انسان کو اس دنیا میں نہیں بھیجا بلکہ جنت سے میاں بیوی کا ایک جوڑا زمین پر اتارا، حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی صورت میں ایک کنبہ بھیجا۔ ایک عام سوال یہ کیا جاتا ہے کہ معاشرے کا آغاز ایک فرد سے ہوتا ہے یا خاندان سے۔ ہمارے خیال میں سوسائٹی کا بنیادی یونٹ فیملی ہے، ہم فرد کو معاشرے کی بنیادی اکائی تصور نہیں کرتے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت سے ایک جوڑے کو بھیجا تھا نہ کہ تنہا ایک فرد کو۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک بھرپور خاندانی زندگی گزاری ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے دوسرے پہلو ہمارے لیے آئیڈیل ہیں اسی طرح خاندانی معاملات میں بھی آپ ﷺ ہی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ہم نے ہر معاملے میں جناب رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو دیکھنا ہے اور انہی کے طرزِ زندگی کی پیروی کرنی ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں یہی بات فرمائی لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب: ۲۱) البتہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ میں اچھا نمونہ ہے۔

حضور ﷺ کی گھریلو زندگی

آنحضرت ﷺ کی گھریلو زندگی کیسی تھی، گھر کی چاردیواری کے اندر آپ کے معمولات کیا تھے اور دینی و دنیوی معاملات میں آپ نے کیسے توازن قائم کیا؟ اس کے متعلق بہت سی احادیث روایت ہوئی ہیں، انہی میں سے ایک روایت ہے کہ بعض صحابہؓ جن میں عثمان بن مظعونؓ بھی تھے اور عبد اللہ بن عمرؓ بھی، انہوں نے آپس میں گفتگو کی کہ رسول اللہ ﷺ کی گھر سے باہر کی زندگی تو ہمارے سامنے ہے لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر حضور ﷺ کے معمولات کیا ہوتے ہیں یہ ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ حضور ﷺ کی گھریلو زندگی ہماری نظروں سے اوجھل ہے چنانچہ ہمیں اس کے متعلق معلوم کرنا چاہیے اور پھر اپنے گھروں میں اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ اب حضور ﷺ کی گھر کے اندر کی زندگی تو ازواجِ مطہرات ہی جانتی تھیں اس لیے وہی اس کے متعلق بہتر راہنمائی کر سکتی تھیں۔ چنانچہ اِن اصحاب نے آپس میں مشورہ کیا کہ ازواجِ مطہرات کی خدمت میں جاتے ہیں اور جا کر اس بارے میں پوچھتے ہیں۔ اس کے لیے طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جا کر دروازہ کھٹکھٹایا جاتا تھا اور بتایا جاتا تھا کہ ہم فلاں لوگ ہیں اور اس مقصد سے آئے ہیں، اس پر ازواج مطہرات حسب ضرورت اندر سے جواب دے دیتی تھیں۔ چنانچہ یہ اصحاب مل کر جناب نبی کریم ﷺ کی ایک زوجہ کے دروازے پر گئے اور عرض کیا کہ ام المؤمنین ہم فلاں لوگ ہیں اور آپ سے یہ بات معلوم کرنے آئے ہیں کہ حضور ﷺ کے گھر کی چاردیواری کے اندر کیا معمولات ہوتے ہیں۔ ام المؤمنین نے بتایا کہ حضور ﷺ کے گھر کے معمولات ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے دوسرے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو تو کھانا کھاتے ہیں، گھر کا کوئی کام کاج ہو تو وہ کر دیتے ہیں، کوئی سودا وغیرہ منگوانا ہو تو وہ منگوا دیتے ہیں، ہمارا حال احوال پوچھتے ہیں، ہمارے ساتھ گپ شپ بھی کرتے ہیں، گھر کی کسی چیز کی مرمت کرنی ہو تو وہ بھی کر دیتے ہیں، کوئی جوتا گانٹھنا ہو تو گانٹھ دیتے ہیں، چارپائی سیدھی کرنی ہو تو کر دیتے ہیں، کسی کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہو تو ہاتھ بٹا دیتے ہیں۔ الغرض حضور ﷺ کے معمولات دوسرے لوگوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔

ان اصحاب نے ایک زوجہ سے پوچھا پھر دوسری سے پوچھا پھر تیسری سے پوچھا۔ اسی طرح چند ازواجِ مطہرات سے پوچھنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ سب کا جواب ایک جیسا ہی تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے آپس میں بیٹھ کر بات کی کہ ہم نے جو سوچا تھا ویسی بات تو سامنے نہیں آئی، حضور ﷺ کی گھر کی زندگی تو عام معمول کے مطابق ہے اس میں کوئی بہت زیادہ خاص بات نظر نہیں آتی۔ کأنہم تقالّوھا گویا انہوں نے اسے اپنے تصور سے کم پایا۔ ان حضرات کا شاید یہ خیال تھا کہ حضور ﷺ گھر پہنچتے ہی مصلیٰ پر کھڑے ہو جاتے ہوں گے، لگاتار عبادات میں مصروف رہتے ہوں گا، پھر مصلیٰ سے اٹھ کر باہر آجاتے ہوں گے، لیکن حضور ﷺ کے گھریلو معمولات ان کی توقعات سے برعکس نکلے۔ اس پر انہوں نے خود ہی ایک توجیہ کرلی کہ حضور ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، معصوم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اس لیے حضور ﷺ کو ضرورت بھی نہیں ہے کہ وہ لمبی چوڑی عبادت کریں۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ عبادت کی ضرورت تو ہم امتیوں کو ہے۔ اِن روز مرہ کے معمولات سے ہمارا کام نہیں بنے گا ہمیں تو بہت زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر انہوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اپنے لیے عبادت کے اعمال تجویز کیے۔ ایک نے کہا کہ میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا اور مجرد زندگی گزاروں گا تاکہ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کر سکوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں ساری زندگی رات بھر نہیں سوؤں گا اور اللہ اللہ کیا کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ساری زندگی بلاناغہ روزے رکھوں گا۔

جناب نبی کریم ﷺ کو ان اصحاب کے بارے میں معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے انہیں بلالیا اور ان سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے آپس میں یہ یہ حلف اٹھائے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سارا قصہ سنایا کہ یوں ہم نے ازواجِ مطہرات سے آپ ﷺ کے گھریلو معمولات کا پتہ چلایا اور پھر اپنے لیے یہ اعمال تجویز کیے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ ناراض ہوئے۔ فرمایا انا اخوفکم باللہ واتقکم بہ کہ میں خدا کا خوف بھی تم سے زیادہ رکھتا ہوں اور تقویٰ بھی۔

نکاح، سنت نبوی ﷺ

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شادیاں بھی کیں، میری اولاد بھی ہے، روزے بھی رکھتا ہوں، کھاتا پیتا بھی ہوں اور لوگوں کے ساتھ سودا وغیرہ بھی کرتا ہوں۔ یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ضروریاتِ زندگی کے سارے کام کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر وہ جملہ ارشاد فرمایا جو ہم عام طور پر نکاح کے خطبہ میں پڑھتے ہیں اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي کہ نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ گھر کے معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ آدمی جب گھر آباد کرتا ہے تو گھر کی ضروریات کا خیال بھی کرتا ہے۔ نیکی اس کا نام نہیں ہے کہ بندہ گھر کے کام کاج اور ضروریات کو نظر انداز کر کے یہ کہے کہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گا بلکہ ضروریاتِ زندگی کا خیال رکھنا اور گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنا بھی نیکی ہے۔ اسی لیے جناب نبی کریم ﷺ نے گھر کے معمول کے کاموں کے ساتھ ساتھ گھر کے اندر نیکی کا ماحول بھی پیدا کیا تھا اور آپ ﷺ اس ماحول کو قائم بھی رکھتے تھے۔ ایک طرف گھر کی ضروریات، گھر کے مسائل اور گھر کے تقاضے ہیں جنہیں نظر انداز کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ ضروریات زندگی کو پورا کرنا بھی دین کا حصہ ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ آدمی گھر کی ضروریات میں ہی الجھ کر رہ جائے کہ گھر میں دین کا اور عبادات کا ماحول ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ فرض نماز مسجد میں پڑھا کرتے تھے جبکہ نوافل اور سنتیں زیادہ تر گھر میں پڑھتے تھے۔

نبی کریم ﷺ کا رات کی عبادت کا معمول

جناب رسول اللہ ﷺ کی رات کی عبادت تو معروف ہے جو آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سے مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رات کا ایک حصہ حضور ﷺ کی عبادت کا ہوا کرتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ عشاء کے بعد جلد سو جاتے تھے اور نصف لیل تک آرام کرتے تھے، پھر جاگ کر ثلث لیل عبادت کیا کرتے تھے اور اس کے بعد پھر سدس لیل آرام کیا کرتے تھے۔ یعنی رات اگر چھ گھنٹوں کی ہو تو تین گھنٹے

آپ ﷺ آرام فرماتے تھے پھر دو گھنٹے عبادت فرماتے تھے اور اس کے بعد ایک گھنٹہ پھر آرام فرماتے تھے۔ یہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی رات کا معمول بتایا۔ جناب نبی کریم ﷺ کی رات کی عبادت کیا ہوتی تھی اس کے متعلق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نماز کے قیام میں قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، یہی تہجد کی نماز کہلاتی ہے۔ یہ تہجد بھی ہوتا تھا اور قرآن کریم کی تلاوت بھی ہوتی تھی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (سورۃ المزمل: ۲۰) کہ پس پڑھو جتنا قرآن میں سے آسان ہو۔

ابتداء میں زیادہ تر سورتوں کے حساب سے تلاوت کی جاتی تھی، کبھی سورۃ البقرہ پڑھ لی کبھی سورۃ آل عمران پڑھ لی کبھی سورۃ الانبیاء پڑھ لی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور ام المؤمنین حضرت سلمہؓ دونوں فرماتی ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کھڑے کھڑے حضور ﷺ کی ٹانگیں سوج جاتی تھیں اور پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔ کبھی کبھار تو ایڑیاں پھٹ جاتی تھیں اور ان میں سے خون رسنے لگتا تھا۔ فرماتی ہیں کہ ہمیں جناب رسول اللہ ﷺ پر ترس آتا تھا کہ حضور ﷺ اس مشقت کی کیفیت میں عبادت فرما رہے ہیں، یہ بات حضرت ام سلمہؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں نے اپنے اپنے انداز سے حضور ﷺ سے پوچھی کہ آپ ﷺ یہ مشقت کیوں فرماتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ اللہ کے پیغمبر نہیں ہیں؟ فرمایا ہاں پیغمبر ہوں۔ پھر پوچھا کیا آپ ﷺ اللہ کے حبیب نہیں ہیں۔ فرمایا ہاں میں اللہ کا حبیب ہوں۔ پھر پوچھا کیا جنت آپ کے لیے واجب نہیں ہے؟ فرمایا ہاں جنت میرے لیے واجب ہے۔ پھر پوچھا اس سب کے باوجود آپ اتنی زیادہ مشقت کیوں کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ٹانگیں سوج جاتی ہیں، پاؤں میں ورم آجاتے ہیں، ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں ان میں سے خون رسنے لگتا ہے اور ہم دیکھنے والوں کو آپ ﷺ پر ترس آتا ہے کہ حضور ﷺ کس مشقت میں پڑے ہوئے ہیں۔ جناب نبی کریم ﷺ نے اس کے جواب میں ایک جملہ کہہ کر ایک مسئلہ سمجھا دیا أَفَلَا أَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

حضرات صوفیائے عظام کا اپنا انداز ہوتا ہے بات کو کہنے کا۔ وہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس جملے میں ایک بنیادی بات سمجھائی ہے۔ حضرت عائشہؓ کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ انسان مشقت کسی نہ کسی چیز کی طلب میں کرتا ہے۔ نماز پڑھنا روزہ رکھنا حج کرنا زکوۃ دینا اور دیگر عبادات کرنا تاکہ اللہ تعالیٰ سے ان کے بدلے میں انعامات ملیں۔ ہمارے ہاں بعض لوگ یہ بات بھی کر دیتے ہیں کہ بھئی ہم نے تو اللہ کی بہت عبادت کی بہت نمازیں پڑھیں لیکن اس کے بدلے میں ہمیں ملا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس ذہن کی نفی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ! اگر اللہ تعالیٰ کے مجھ پر احسانات زیادہ ہیں تو کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر بھی زیادہ نہ ادا کروں؟ گویا یہ جو مشقت اٹھا رہا ہوں یہ پچھلے احسانات کا شکرانہ ہے۔ اگر ہم اس بارے میں تصور کریں کہ اللہ تعالیٰ کے ہم پر کتنے احسانات ہیں کیا ان میں سے کسی ایک احسان پر بھی ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر سکتے ہیں؟ ہماری ساری عبادات اگر پچھلے احسانات کے شکرانے میں قبول ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ چنانچہ جناب نبی کریم ﷺ کا اپنے گھر میں عبادت کا معمول تھا، حضور ﷺ کی رات کی عبادت اپنی جگہ پر تھی لیکن آپ ﷺ دن میں بھی نفل اور سنت نماز گھر پر پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ نے گھر پر نماز پڑھنے کی ترغیب بھی دی۔

گھروں میں نماز پڑھنے کی ترغیب

مسلم شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا صَلُّوْا فِیْ بُیُوْتِکُمْ وَلَا تَجْعَلُوْهَا قُبُوْرًا کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ جس گھر میں نماز نہیں ہوتی وہ دراصل قبرستان ہی ہے، جس گھر میں اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں ہوتی وہ روحانی طور پر مردہ انسانوں کا گھر ہے۔ آباد گھر وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔ گھر میں نماز پڑھنے کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے رحمت کے فرشتے آتے ہیں جو گھر میں برکت کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ہمیں اپنے گھروں کے ماحول کے متعلق بہت تشویش ہوتی ہے، عام طور پر لوگ

شکایت کرتے ہیں کہ گھروں میں برکت نہیں رہی نحوست کا ماحول ہے، کسی نے کاروبار میں رکاوٹ ڈال دی، کسی نے رشتوں میں رکاوٹ ڈال دی اور یہ کہ کسی نے کوئی جادو ٹونہ وغیرہ کر دیا ہے۔ جادو کے اثرات سے انکار نہیں ہے لیکن اس بات کو ہم نے اپنے اعتقاد میں بہت زیادہ جگہ دے دی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر ہم گھر میں رحمت کا ماحول پیدا کریں گے تو رحمت آئے گی لیکن اگر اس کے برعکس لعنت والے کاموں کا ماحول پیدا کریں گے تو لعنت آئے گی۔

میں اس کی مثال پیش کیا کرتا ہوں کہ گھر میں اگر صفائی ہو گی تو خوشبو ہو گی لیکن گھر میں اگر گندگی ہو گی تو بدبو کا ماحول ہو گا۔ اگر گھر میں باغیچہ ہو گا تو تتلیاں اور بلبلیں آئیں گی لیکن اس کے برعکس گھر کے صحن میں گندگی پڑی ہو گی تو اس میں کیڑے مکوڑے پیدا ہوں گے اور اس پر مکھیاں و مچھر آئیں گے۔ اسی طرح اگر گھر میں نماز کا اور قرآن کریم کی تلاوت کا ماحول ہو گا تو اللہ کی رحمت کے فرشتے آئیں گے اور برکات نازل ہوں گی لیکن آج کل جو کچھ ہمارے گھروں میں ہوتا ہے اس کی دلچسپی والی مخلوق بھی دنیا میں موجود ہے، ہم اپنے گھروں کے ماحول سے شیطانی مخلوق کو دعوت دیں گے تو پھر لازمی بات ہے کہ وہ اپنے اثرات بھی چھوڑ کر جائیں گے۔ یہ اثرات نحوست، بے برکتی اور بے چینی کی صورت میں ہوتے ہیں۔ گھر کا ماحول بنانا گھر کے مکینوں کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کے اس فرمان صلوا فی بیوتکم پر عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے رحمت کے فرشتے گھروں میں آتے ہیں اور جہاں اللہ کی رحمت کے فرشتے آتے ہیں وہاں شیطانی مخلوق کا داخلہ ممنوع ہو جاتا ہے۔

دوسرا بڑا فائدہ اس کا محدثین یہ بیان فرماتے ہیں کہ جب گھر میں نماز کا ماحول ہو گا تو پھر گھر کے بچوں کو اور دیگر افراد کو نماز کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ وہ خود اس ماحول کے اثرات سے نمازیں پڑھیں گے۔ یوں گھروں میں نماز پڑھنے سے تربیت کا ماحول پیدا ہو گا کہ بچے ماحول کے اثرات کو بہت تیزی کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ جناب

رسول اللہ ﷺ نے گھر کے معمولات کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور ضروریاتِ زندگی کو نظر انداز نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ آپ ﷺ نے گھر میں نماز کا اور قرآن کریم کی تلاوت کا ماحول بھی رکھا۔ چنانچہ امہات المؤمنین یہ بات فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ گھر کے ماحول میں جہاں گھر کی ضروریات اور تقاضوں کا لحاظ رکھتے تھے وہاں گھر میں دینی ماحول بھی قائم رکھتے تھے۔

گھر میں دینی ماحول، گھر کے سربراہ کی ذمہ داری

جناب رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی رو سے گھر کے اندر دینداری کا ماحول پیدا کرنا گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ کہ تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ راعی چرواہے کو کہتے ہیں۔ ایک روایت میں حضور ﷺ نے خود اس کی تشریح فرمائی کہ چرواہے کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے، فرمایا کہ چرواہے کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی بکریوں اور بھیڑوں کو اچھی چراگاہ میں لے کر جائے کہ وہ اچھی غذا کھا سکیں، انہیں اچھے چشمے پر لے جائے کہ انہیں پینے کے لیے صاف پانی میسر ہو اور انہیں موسمی اثرات سے اور دشمن سے بچائے۔ پھر جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بھیڑ بکری کا دشمن بھیڑیا ہے جبکہ انسان کا دشمن شیطان ہے۔ یوں گھر کے سربراہ کی بھی یہی ذمہ داری ہے کہ ضروریاتِ زندگی مہیا کرے، یعنی خوراک، تعلیم، لباس، رہائش وغیرہ اور اس کے ساتھ شیطان کے نرغے سے اپنی اولاد کو بچانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ گھر کی عورت کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا کہ عورت اپنے خاوند کے گھر کی نگہبان ہے۔ یعنی مرد گھر سے باہر کے کاموں کا ذمہ دار ہے جبکہ عورت گھر کے اندر کے معاملات کی ذمہ دار ہے۔ آپ نے فرمایا كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ کہ ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ قیامت کے دن ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ یہ معاملہ تمہارے سپرد کیا گیا تھا تم نے یہ ذمہ داری کس طرح نبھائی۔ مرد و عورت دونوں اپنے

اپنے دائروں کے اندر معاملات کے ذمہ دار ہیں، ہر ایک سے اس کے اختیار کے مطابق اس کی ذمہ داریوں کے متعلق باز پرس ہو گی۔

رمضان المبارک میں حضور ﷺ کا معمول

ایک روایت میں آتا ہے کہ جب رمضان المباک کا آخری عشرہ آتا تھا تو أَحْیِی لَیْلَهٗ وَشَدَّ مِئْزَرَهٗ وَأَیْقَظَ أَهْلَهٗ۔ کمر باندھنا ایک محاورہ ہے۔ یعنی حضور ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں نماز، روزہ اور عبادات کے لیے کمر کس لیتے تھے۔ دوسرا یہ کہ آپ رات کو زندہ کرتے تھے یعنی عام دنوں میں آپ ﷺ رات کا تیسرا حصہ عبادت کرتے تھے جبکہ رمضان میں ساری رات عبادت فرمایا کرتے تھے۔ تیسرا جملہ یہ ہے کہ اکیلے نہیں بلکہ گھر والوں کو بھی عبادت کے لیے بیدار کیا کرتے تھے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ گھر والوں کو ترغیب بھی دیتے تھے اور اس پر کچھ سختی بھی فرمایا کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ رمضان کی ایک رات میں حضور ﷺ عبادت کر رہے تھے کہ اچانک فرمایا دیکھو اللہ کی کتنی انوار و برکات نازل ہو رہی ہیں، کوئی جا کر اِن حجرے والیوں کو بھی جگائے کہ اللہ کی بندیو! اللہ کی رحمتیں بانٹی جا رہی ہیں، اٹھو اور اللہ کی ان رحمتوں اور برکتوں سے اپنا حصہ وصول کرو۔

حضرت انس بن مالکؓ حضور ﷺ کے ذاتی خادم تھے۔ جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت انس بن مالکؓ دس سال کے تھے۔ ان کی والدہ بہت سمجھدار خاتون تھیں وہ حضرت انسؓ کو حضور ﷺ کی خدمت میں لے کر آئیں اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس اور تو کچھ نہیں ہے لیکن یہ میرا بیٹا آپ کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ حضرت انسؓ نے دس سال حضور ﷺ کی خدمت میں صرف کیے، آپ ﷺ کے وصال کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ حجاب کے احکامات تک تو ان کا حضور ﷺ کے گھر میں آنا جانا تھا لیکن بعد میں پردے کا لحاظ رکھ کر خدمت بجالاتے تھے۔ ایک روایت میں حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے زندگی بھر کسی عورت پر، کسی بچے پر اور کسی خادم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ گھر کے کام کاج کا کوئی نقصان ہو جاتا کوئی برتن

ٹوٹ جاتا کوئی چیز ضائع ہو جاتی تو حضور ﷺ نے اس پر کبھی ڈانٹا نہیں۔ البتہ دینی کاموں میں کمی و کوتاہی پر حضور ﷺ سختی فرمایا کرتے تھے۔

جناب نبی کریم ﷺ کے گھر کے ماحول کے متعلق ازواجِ مطہرات نے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ میں نے اصولی طور پر یہ بات عرض کی ہے کہ گھر کے ماحول کے بارے میں جناب نبی کریم ﷺ نے دونوں باتوں کی طرف بیک وقت تلقین فرمائی ہے کہ سب کے حقوق بھی بوقت ضرورت ادا کرنے ضروری ہیں اور اللہ کے ساتھ تعلق بر قرار رکھنا بھی لازمی ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے ان دونوں معاملات کے درمیان توازن قائم کر کے اپنی امت کے لیے ایک عملی نمونہ پیش کیا۔ جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے آپ ﷺ کی گھریلو زندگی کی ایک جھلک میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جناب رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

معجزہ شق القمر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

بخاری شریف ص ۷۲۱ ج ۲، مسلم شریف ص ۳۷۲ ج ۲، مستدرک حاکم ص ۴۷۲ ج ۲ میں متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے اظہار کے لیے مکی زندگی میں چاند دو ٹکڑے ہوا۔ اس تاریخی معجزہ کے بارہ میں روایات اتنی کثرت سے منقول ہیں کہ علامہ سبکیؒ نے انہیں متواتر کا درجہ دیا ہے۔ ابو نعیمؒ نے دلائل میں اس واقعہ کی تفصیل حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے اس طرح نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس مشرکوں کا ایک گروہ آیا جس میں ولید بن مغیرہ، ابو جہل، عاص بن وائل، عاص بن ہشام، اسود بن یغوث اسود بن مطلب زمعۃ بن الاسود اور نضر بن حارث بھی تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ اگر آپ واقعی سچے ہیں تو اپنی سچائی کے ثبوت میں چاند دو ٹکڑے کر کے دکھائیں، اس طرح کہ اس کا ایک ٹکڑا قبیس کی پہاڑی پر اور دوسرا ٹکڑا قیقعاں پر ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے پوچھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا تم لوگ ایمان لے آؤ گے؟ کہنے لگے ہاں! وہ رات چودھویں تھی اور چاند آسمان پر پورے آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! ان مشرکوں کا سوال پورا فرما دے۔ پھر آپ ﷺ نے انگلی سے اشارہ کیا تو چاند اسی طرح دو ٹکڑے ہو گیا جس طرح کافروں نے کہا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اِشْهَدُوْا اِشْهَدُوْا اے لوگو گواہ رہنا گواہ رہنا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے ص ۲۶۱ ج ۴ میں سورہ قمر کی پہلی آیت اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ کے حوالہ سے اس بات پر امت کا اجماع ذکر کیا ہے کہ یہ آیت نبی اکرم ﷺ کے معجزۂ شق القمر کے بارے میں ہے۔

ملا محمد قاسم فرشتہؒ "تاریخ ہند ص ۴۸۹ ج ۲ میں لکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں کچھ عرب مسلمان کشتی پر سوار جزائر سری لنکا کی طرف جا رہے تھے کہ طوفانوں کی وجہ سے جزائر مالا بار کی طرف جانکلے اور وہاں گدنکلور نامی شہر میں کشتی سے اترے۔ شہر کے حاکم کا نام "سامری" تھا۔ اس نے مسلمانوں کے بارے میں یہودی اور عیسائی سیاحوں سے کچھ سن رکھا تھا۔ عرب مسلمانوں سے کہنے لگا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے حالات اور ان کی کچھ علامات بیان کریں۔ ان مسلمانوں نے اسے آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی، اسلام کے اصول و مسائل اور نبی اکرم ﷺ کے معجزات کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں، دریں اثنا شق القمر کے تاریخی معجزہ کا ذکر بھی کیا۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ ذرا ٹھہرو ہم اسی بات پر تمہاری صداقت کا امتحان لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں دستور ہے کہ جو بھی اہم واقعہ رونما ہو اسے قلمبند کر کے شاہی خزانہ میں تحریر کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کے اظہار کے لیے چاند دو ٹکڑے ہوا تھا تو اسے یہاں کے لوگوں نے بھی دیکھا ہو گا اور اتنا محیر العقول واقعہ ضرور قلمبند کر کے شاہی خزانے میں محفوظ کر لیا ہو گا۔ یہ کہہ کر اس نے پرانے کاغذات طلب کیے، جب اس سال کا رجسٹر کھولا گیا تو اس میں یہ درج تھا کہ آج رات چاند دو ٹکڑے ہو کر پھر جڑ گیا۔ اس پر وہ بادشاہ مسلمان ہو گیا اور بعد میں تخت و تاج چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ ہی عرب چلا گیا۔

علامہ سید محمود شکری آلوسیؒ اپنی کتاب مادل علیہ القرآن مما یعضد الھیئۃ الجدیدۃ القویمۃ البرہان میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ جب سلطان محمود غزنویؒ ہندوستان پر بار بار حملے کر رہے تھے، انہوں نے بعض عمارتوں پر یہ تختی لکھی ہوئی دیکھی کہ اس عمارت کی تکمیل اس رات ہوئی جس رات چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۹ جنوری ۱۹۷۵ء کے صفحہ نمبر ۲ پر خبر شائع ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مصری سائنسدان ڈاکٹر فاروق الباز نے، جو واشنگٹن میں طبقات ارضی اور اجرام فلکی کے تحقیقاتی مرکز کے ڈائریکٹر ہیں، گزشتہ روز مصر کے صدر جناب انور السادات

سے ملاقات کی اور انہیں قرآن کریم کے اس نسخے کا ایک ورق پیش کیا جو اپالو ۱۵ کے خلانورد چاند پر رکھ کر آئے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق نے صدر سادات کو مریخ کی ایک وادی کا ماڈل پیش کیا جسے وادئ قاہرہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چاند پر سے لی گئی عرب ممالک کی رنگین تصویر پیش کی اور چاند پر موجود ایک دراڑ کی تصویر بھی پیش کی جسے عرب دراڑ کا نام دیا گیا ہے اور جس کے بارے میں سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جب چاند دو ٹکڑے ہوا تھا تو دوبارہ جڑتے وقت یہ دراڑ رہ گئی تھی۔ صدر سادات نے ان تمام دستاویزات کو مصر کے سائنسی ریسرچ سنٹر میں رکھنے کی ہدایت کر دی ہے۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ایک سبق، ایک پیغام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْد

معراج اور اسراء جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہیں۔ اسراء اس سفر کو کہتے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد حرام سے مسجد اقصٰی تک کیا، اور معراج وہ سفر ہے جو زمین سے ساتوں آسمانوں اور اس سے آگے سدرۃ المنتہٰی تک ہوا، اور اس میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سات آسمانوں، عرش و کرسی اور جنت و دوزخ کے بہت سے مناظر دیکھے جن کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی ہے اور سینکڑوں احادیث میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں۔ عام طور پر روایات میں آتا ہے کہ یہ دونوں سفر ایک ہی رات میں ہوئے اور نبوت کے گیارہویں سال ۲۷ ویں رجب کو اس عظیم الشان معجزے کا ظہور ہوا۔ اور اسی کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان معجزات میں شمار کیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ دونوں سفر بیداری کی حالت میں جسم مبارک کے ساتھ ایک ہی رات میں ہوئے۔ چونکہ یہ سب کچھ عام حالات و اسباب میں ممکن نہیں ہے اسی لیے یہ سفر معجزہ کہلاتا ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار معجزات عطا فرمائے ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے بھی سینکڑوں معجزات کا ظہور رہا ہے۔ معجزات کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ کسی معجزاتی واقعہ کے ثبوت کے لیے روایت میں تو بحث و اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ رونما ہوا ہے یا نہیں، اس کی سند درست ہے یا نہیں، لیکن اگر کوئی واقعہ صحیح روایت اور سند کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس کے بعد اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو عقل اور مشاہدہ کے خلاف ہے، وغیرہ۔ اس لیے کہ معجزہ اگرچہ پیغمبر

کے ہاتھ پر اس کی صداقت کے اظہار کے لیے ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار اور فعل سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی وقت اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اس لیے ہمارا ایمان اور عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جناب نبی اکرم ﷺ کو معراج کی شب مسجد حرام سے مسجد اقصٰی تک اور زمین سے سات آسمانوں، عرش و کرسی اور جنت و دوزخ کی سیر کرائی اور یہ سارا سفر حالت بیداری میں جسم مبارک کے ساتھ ہوا، اس کی تفصیلات خود آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائیں جو سینکڑوں احادیث مبارکہ میں مذکور و محفوظ ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ متعدد مواقع پر خواب میں بھی آپ ﷺ کو جنت و دوزخ اور کائنات کے مختلف مناظر دکھائے گئے جن کا تذکرہ احادیث میں خواب کے حوالہ سے موجود ہے۔ اور یہیں سے کچھ حضرات کو مغالطہ ہوا ہے کہ معراج بھی شاید خواب کا واقعہ ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے خواب کے واقعات بھی ہوئے اور معراج و اسراء کا معروف واقعہ بیداری کے ساتھ جسمانی طور پر ہوا۔ اور اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے ورنہ خواب کی بات ہو تو اسے معجزہ کا عنوان دینے کی ضرورت نظر نہیں آتی اس لیے کہ خواب میں تو ہم بھی خدا جانے کہاں کہاں کی سیر کرتے رہتے ہیں اور اس میں کوئی معجزاتی بات نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے خواب میں اور حضرات انبیاء کرامؑ کے خواب میں فرق ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارا خواب ضروری نہیں کہ سچا اور درست ہو شیطانی خیالات بھی ہو سکتے ہیں، نفسانی تخیلات بھی ہو سکتے ہیں اور فرشتوں کی طرف سے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر کے سوا کسی کا خواب حجت اور دلیل نہیں بن سکتا جبکہ پیغمبر کا خواب حجت اور دلیل ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نبی کے خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں ہے اور بیداری کی طرح خواب کی وحی بھی حجت اور دلیل ہے۔ پیغمبر کا خواب اس درجہ کی وحی اور حجت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی والد محترم کے سامنے اپنی گردن ذبح کے لیے پیش کر دی بلکہ اپنی طرف سے باپ نے ذبح کر دیا اور بیٹا ذبح

ہو گیا، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح ہونے سے اپنی قدرت کے ساتھ بچا لیا۔ اس سارے واقعہ کی بنیاد خواب پر ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر کا خواب بھی اس کی بیداری کی طرح وحی کا درجہ رکھتا ہے۔

اس بنیاد پر یہ عرض کرنا شاید نامناسب بات نہ ہو کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے حوالہ سے تو ان کے خواب کے اسفار اور بیداری کے سفر میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں قسم کے مشاہدات حقیقی اور واقعاتی ہیں، البتہ ہمارے لیے دونوں کی حیثیت اس پہلو سے الگ الگ ہے کہ حضور ﷺ کا بیداری کی حالت میں معراج و اسراء کا سفر معجزہ ہے، جبکہ خواب کے اس قسم کے اسفار کو معجزات میں شمار نہیں کیا جاتا۔

اس تمہید کے ساتھ یہ گزارش کروں گا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج اور اسراء کا ہمارے ساتھ تعلق ایک تو اس حوالہ سے ہے کہ یہ ہمارے ایمان وعقیدہ کا حصہ ہے، اور دوسرا تعلق اس پہلو سے ہے کہ ان میں ہمارے لیے سبق اور عمل کے بہت سے پہلو ہیں۔ ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم ان واقعات سے سبق حاصل کریں اور ان میں ہمارے لیے جو پیغامات اور تعلیمات ہیں ان پر عملدرآمد کا اہتمام کریں۔ چنانچہ خواب اور بیداری کے ان واقعات میں سے، جو سینکڑوں احادیث مبارکہ میں بکھرے ہوئے ہیں، دو واقعات کا تذکرہ کروں گا۔ ایک واقعہ خواب کا ہے اور دوسرا بیداری کے معراج کا ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد اشراق کے وقت تک مسجد میں ہی تشریف فرما ہوتے تھے اور اس دوران مختلف نوعیت کی باتیں ہوتی رہتی تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ کسی صحابی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو وہ اپنا خواب بیان کرتا تھا اور آنحضرت ﷺ اس کی تعبیر بتا دیتے تھے۔ بسا اوقات آپ ﷺ پوچھ بھی لیتے تھے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو تو بیان کرے، کبھی حضور ﷺ اپنا خواب بیان فرماتے تھے کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے اور اس کی تعبیر بیان فرماتے تھے۔ بخاری شریف میں حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی روایت سے جناب نبی اکرم ﷺ کا ایک طویل خواب مذکور ہے جس کا ایک حصہ عرض کر رہا ہوں۔

رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ دو شخص میرے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا، ہم چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچے جو بہت خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت بستی میں نے اس سے قبل نہیں دیکھی تھی، خوبصورت عمارتیں، کشادہ راستے، صاف ستھرا ماحول، غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ عمارتیں سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ میں نے ساتھ والے دو شخصوں سے پوچھا کہ یہ بستی کون سی ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ آگے چلیں بعد میں بتائیں گے۔ ہم آگے چلے تو بستی کے ایک طرف صاف ستھرے پانی کی ایک بڑی نہر ہے جس میں روانی کے ساتھ پانی چل رہا ہے، میں نے دیکھا کہ بستی کی دوسری طرف لوگوں کا ایک بڑا ہجوم ہے جو بستی کی طرف بڑھ رہا ہے مگر ان کے چہرے عجیب ہیں "نصفهم كأحسن ما رأيت ونصفهم كأقبح ما رأيت" چہرے کا نصف حصہ اتنا خوبصورت ہے جتنا خوبصورت تم دیکھ سکو اور چہرے کا باقی نصف اتنا بدصورت ہے جتنا بدصورت تم دیکھ سکو۔ میں نے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ آگے چلیں بعد میں بتائیں گے۔ اتنے میں میرے ساتھیوں نے ہجوم والوں کو آواز دی کہ سب اس نہر میں کود جاؤ وہ سب نہر میں کود گئے اور اس میں دو چار غوطے لگاتے ہوئے تیر کر دوسرے کنارے سے بستی میں داخل ہونا شروع ہو گئے، میں نے دیکھا کہ نہر میں چھلانگ لگانے اور غوطے کھانے سے ان کے چہروں کی ساری بدصورتی غائب ہو گئی اور وہ انتہائی خوبصورت چہروں کے ساتھ اس بستی میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد میرے ان دو ساتھیوں نے جو مجھے لے کر آئے تھے بتایا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں اور ہماری آج کی ڈیوٹی آپ کو یہ مناظر دکھانے کی ہے۔ یہ بستی عدن ہے جو جنت کا وہ حصہ ہے جہاں آنجناب کا قیام ہو گا، یہ بستی کی طرف بڑھنے والے لوگوں کا ہجوم آپ کی امت کے ان لوگوں کا ہے جو "خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا" نیکی اور بدی کے کام گڈمڈ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اچھے اعمال بھی کیے اور برے اعمال بھی کرتے رہے اور ان کے معمولات میں نیکی اور گناہ کے اعمال خلط ملط چلتے رہے۔ ان کے چہروں پر ان کے اپنے اعمال کا پرتو ہے، نیکی اور خیر کے اعمال حسن کی صورت میں جبکہ گناہ اور شر کے اعمال قبح کی صورت

میں ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اور جس نہر میں چھلانگ لگا کر انہوں نے قبح اور بدصورتی سے نجات پائی ہے یہ توبہ اور استغفار کی نہر ہے جس میں نہانے سے ان کے چہروں سے ساری بدصورتی صاف ہو گئی اور وہ خوبصورت چہروں کے ساتھ جنت میں داخل ہو گئے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کا یہ قصہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں گناہوں سے نجات اور اعمال شر کے اثرات ختم کرنے کے لیے توبہ اور استغفار کا راستہ بتایا ہے اور تلقین فرمائی ہے کہ ہم توبہ اور استغفار کرتے رہیں تاکہ گناہوں سے اور ان کے اثرات سے پاک ہو سکیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے جسم پر میل کچیل جمتی ہے، پسینہ آتا ہے اور بدبو پیدا ہوتی ہے، جس کا علاج یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً غسل کرتے رہیں۔ اگر غسل کرتے رہیں گے تو جسم کی بدبو، پسینہ اور میل کچیل ساتھ ساتھ صاف ہوتی رہے گی اور اگر غسل کی عادت اور معمول نہیں ہو گا تو رفتہ رفتہ یہ میل کچیل جسم کا حصہ بن جائے گی اور ایک وقت آئے گا کہ غسل بھی فائدہ نہیں دے گا۔ یا جیسے استعمال ہونے والے کپڑے ہیں کہ ان پر گرد بھی لگے گی، داغ بھی جمیں گے، پسینہ اور میل کچیل بھی ان کو میلا کرے گی اور ان سے بدبو بھی آئے گی۔ ان سب کا علاج یہ ہے کہ ان کو وقفہ وقفہ سے دھویا جاتا رہے، کپڑے استعمال ہوں گے اور ساتھ ساتھ وقفہ وقفہ سے دھلتے رہیں گے تو صاف رہیں گے، لیکن اگر استعمال تو ہو رہے ہیں مگر دھل نہیں رہے تو یہ میل کچیل اور داغ ان کے ساتھ پختہ ہوتے چلے جائیں گے اور ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ کپڑوں کو دھونے کا بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہمارا جسم اور اس کے ساتھ روح ہے۔ اور ہمیں ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ اگر روح کا کنکشن ہے تو یہ انسان ہے ورنہ خالی جسم تو کباڑ کی طرح ہے کہ اسے کوئی بھی گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ باپ بیٹے کو دفن کر دیتا ہے اور بیٹا اپنے ہاتھوں باپ کو سپرد خاک کرتا ہے، بیوی خاوند کو گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہے اور خاوند بیوی کو گھر میں نہیں رکھتا۔ جیسے موبائل فون میں کنکشن ہو تو وہ رابطے کا کام کرتا ہے، اور ہم اپنے موبائل فون کو کارآمد رکھنے کے لیے سیٹ اور کنکشن دونوں کی حفاظت کرتے ہیں اور دونوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ سیٹ کی ضرورت یہ

ہے کہ اس کی مشینری صحیح کام کرے اور اس کی بیٹری چارج ہوتی رہے جبکہ کنکشن کی ضرورت یہ ہے کہ وہ برقرار رہے اور اس کو ضرورت کے مطابق بیلنس ملتا رہے۔ اسی طرح انسان ہے جو جسم اور روح دونوں سے مرکب ہے، جسم کی ضروریات کی طرف تو ہماری توجہ ہوتی ہے اور ہم اس دنیا میں اس کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہو کرتے رہتے ہیں لیکن روح کی ضروریات کی طرف ہماری توجہ نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ جسم کے ساتھ کنکشن رکھتے ہوئے بھی ڈیڈ ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح جسم میلا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ گرد اور بدبو لگتی ہے جس کا علاج ہم غسل کے ساتھ کرتے ہیں، اسی طرح روح بھی میلی ہوتی ہے، نفسانی خواہشات، گناہ، شیطانی خیالات اور برے اعمال انسان کی روح کو میلا کر دیتے ہیں، اسے بدبودار بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کا غسل بھی اگر ساتھ ساتھ ہوتا رہے تو وہ صاف رہتی ہے ورنہ میل اور بدبو رفتہ رفتہ اسے اس حال میں کر دیتی ہے کہ میل اور بدبو کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے، اسی حالت کو قرآن کریم نے دلوں کے گرد غلاف چڑھ جانے سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ پھر دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور ان میں حق اور خیر کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ روح کا غسل نماز کے ساتھ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہوتا ہے، قرآن کریم کی تلاوت سے ہوتا ہے، جناب نبی اکرم ﷺ پر درود شریف پڑھنے سے ہوتا ہے اور توبہ و استغفار کی کثرت سے ہوتا ہے۔ اور جناب رسول اکرم ﷺ کے اس خواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسی بات کی تعلیم دی ہے۔

دوسرا واقعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تاریخی سفر معراج و اسراء کا بیان کروں گا جو ایک بڑا معجزہ ہے، بیداری کی حالت میں ہوا ہے، جسم مبارک کے ساتھ ہوا ہے اور اس کی مختلف تفصیلات آنحضرت ﷺ سے سینکڑوں احادیث مبارکہ میں منقول ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے جب جنت میں سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی تو حضرت ابراہیمؑ نے آنحضرت ﷺ کی امت کے لیے آپ کو دو پیغام دیے۔ وہ دو پیغام میں آج کی اس محفل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ حضرات کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ

آنحضرت ﷺ کی اس سفر معراج و اسراء میں تین بار ملاقات ہوئی۔ پہلی بار جب تمام انبیاء کرامؑ بیت المقدس میں جمع ہوئے اور سب نے نبی اکرم ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے۔ دوسری بار فرشتوں کے قبلہ بیت المعمور کے پاس ان دو بزرگوں کی ملاقات کا ذکر روایات میں ملتا ہے۔ اور تیسری ملاقات کا ذکر ترمذی شریف کی اس روایت میں ہے جو جنت میں ہوئی ہے اور اس میں حضرت ابراہیمؑ نے جناب نبی اکرم ﷺ کے ذریعے آپ ﷺ کی امت کے لیے دو پیغامات دیے۔

ایک یہ کہ اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہہ دیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ ہمیں سلام بھیج رہے ہیں، اور وہ بھی جناب نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ سے۔ اس لیے یہ سلام سن کر ہم سب کو سنت کے مطابق اس کا جواب دینا چاہیے۔

دوسرا پیغام یہ ہے کہ اپنی امت سے فرما دیجیے کہ ''اِنَّ الْجَنَّةَ اَرْضُهَا طَيِّبٌ وَمَاءُهَا عَذْبٌ وَاِنَّمَا هِيَ الْقِيعَانُ، غَرْسُهَا سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللهُ اَكْبَرُ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ'' بے شک جنت کی زمین عمدہ ہے اور پانی میٹھا ہے لیکن وہ چٹیل میدان ہے، اسے ذکر الٰہی کے ذریعے خود آباد کرنا ہوگا۔

یعنی جنت انسانوں کے رہنے کے قابل ہے لیکن خالی پلاٹ ملے گا اور وہاں تعمیر اور آبادی خود کرنا ہوگی۔ دنیا میں کسی بھی جگہ آبادی کے لیے اور بسنے کے لیے سب سے پہلے زمین اور پانی کو چیک کیا جاتا ہے اور پھر وہاں بستی بسانے اور انسانوں کو آباد کرنے کا پلان کیا جاتا ہے۔ آج کل ہمارے سائنسدان مختلف سیاروں میں انسانی زندگی کے امکانات تلاش کر رہے ہیں، پانی آکسیجن اور ہوا وغیرہ کی تلاش جاری ہے اور اس بات کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ انسانوں کو اگر کسی دوسرے سیارے میں آباد ہونا پڑے تو اس کے لیے کونسا سیارہ مناسب رہے گا۔ ویسے بھی ہم نے اس سیارۂ ارضی کا خود اپنے ہاتھوں جو حشر کر دیا ہے بلکہ مسلسل کیے جا رہے ہیں اس کے پیش نظر متبادل جگہ کی تلاش نسل انسانی کی ضرورت بھی ہے کہ ہماری

بداعمالیوں اور حرکتوں کی وجہ سے یہ سیارۂ ارضی خدانخواستہ کسی وقت بھی تباہی کا شکار ہو سکتا ہے۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے سائنسدان تو ابھی امکانات کی تلاش میں سرگرداں ہیں جبکہ حضرت ابراہیمؑ نے چودہ سو سال قبل ایک پیغام کے ذریعے یہ رپورٹ ہمیں بھجوا دی ہے کہ جنت انسانوں کے رہنے کے قابل ہے اور اس کی زمین اور پانی دونوں حیات انسانی کے لیے خوشگوار ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دے دی ہے کہ جنت چٹیل میدان ہے اور جس کو بھی ملے گی خالی پلاٹ کی صورت میں ملے گی، اسے آباد خود کرنا ہوگا اور اس پر شجرکاری، باغات اور سبزہ وغیرہ کا اہتمام انسانوں کو خود کرنا پڑے گا۔

مختلف احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر انسان کو اس کی دنیا میں پیدائش کے ساتھ ہی دو پلاٹ الاٹ ہو جاتے ہیں ایک جنت کا اور دوسرا دوزخ کا، دونوں پلاٹ اس کے ساتھ مختص ہو جاتے ہیں۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو آباد کرتا ہے اور کس کو ویران رہنے دیتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں جب سوال وجواب کا مرحلہ مکمل ہو جاتا ہے تو جنتی اور نیک شخص کے لیے پہلے جہنم کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر تو نیکی اور ایمان کا راستہ اختیار نہ کرتا تو تیرا یہ ٹھکانہ ہوتا، یہ بتا اور دکھا کر دوزخ کی وہ کھڑکی بند کر دی جاتی ہے اور اس کے لیے جنت کی کھڑکی کھول جاتی ہے۔ اسی طرح بدکار اور دوزخی کے لیے پہلے جنت کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ نیکی اور ایمان کا راستہ اختیار کرتا تو اس کا یہ ٹھکانہ ہوتا، اس کے بعد وہ کھڑکی بند کر کے اس کے لیے جہنم کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ کسی بھی انسان کو دنیا میں اس کی پیدائش کے ساتھ ہی جنت اور دوزخ کا ایک ایک پلاٹ الاٹ کر دیا جاتا ہے اور فیصلہ اس کی دنیا کی زندگی اور اس کے ایمان اور اعمال کے حوالہ سے ہوتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد کون سا پلاٹ باقی رہ گیا ہے اور کون سا منسوخ ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی اپنے پیغام میں اسی بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ جنت کا خالی پلاٹ تو انسان کو مل جاتا ہے لیکن اس کی آبادی اور اس میں سبزہ کاری انسان کی دنیا کی زندگی کے اعمال وایمان پر موقوف ہے۔ چنانچہ حضرت

ابراہیمؑ یہ فرما کر کہ "انہا ہی القیعان" جنت چٹیل میدان کا نام ہے، اس کی آبادکاری کا طریقہ بھی یہ فرما کر بتاتے ہیں کہ "غِرَاسُهَا سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" جنت کے اس بے آب و گیاہ اور چٹیل میدان کو سر سبز بنانے کے لیے دنیا میں جتنا اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرو گے اور جتنا اپنے مالک و رازق کا ذکر کرو گے اتنا ہی تمہارے جنت کے پلاٹ میں سبزہ اگے گا اور اتنے ہی وہاں درخت پیدا ہوں گے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ نسل انسانی کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ زمین کے تباہ ہو جانے کے بعد تمہارے لیے رہنے کے قابل جگہ جنت ہی ہے لیکن اس کے لیے تمہیں محنت دنیا میں کرنی ہو گی اور مرنے سے قبل اس کی تیاری کرنی ہو گی ورنہ وہ پلاٹ کینسل بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور بات عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں جنت میں اپنے پلاٹ کو آباد کرنے کے لیے ہمیں اس دنیا میں محنت کرنی ہے اور ہمارے موت سے پہلے کے اعمال اور ایمان کے ساتھ ہی ہمارا جنت کا پلاٹ محفوظ رہے گا اور آباد ہو گا، وہاں ہمیں اس پلاٹ کے سائز کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے تاکہ محنت اس کے مطابق ہو۔ جنت کی بے پناہ وسعت اور اس کی لمبائی اور چوڑائی کا تذکرہ مختلف احادیث میں ملتا ہے، مثلاً جناب نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ جنت کے ایک درخت کے سائے میں تیز رفتار گھوڑا سو سال تک دوڑتا رہے تو اس کا سایہ پھر بھی ختم نہیں ہو گا۔ مگر میں اس حوالہ سے ایک روایت کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو مسلم شریف میں ہے اور جس میں اس شخص کا ذکر کیا گیا ہے جو سب سے آخر میں جنت میں داخل ہو گا۔

یہ ایک لمبی روایت ہے لیکن میں اس کا صرف ایک حصہ بیان کروں گا کہ جب جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونے والا شخص جنت کے دروازے سے اندر جائے گا تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو گا کہ جا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔ وہ ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد عرض کرے گا کہ یا الٰہی مجھے تو کوئی خالی جگہ نہیں مل رہی، سب زمینیں ریزرو ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ پھر فرمائیں گے کہ جا کر اپنی جگہ تلاش کرو، وہ دوبارہ گھوم پھر کر واپس آئے گا

اور عرض کرے گا مولائے کریم! مجھے تو کوئی خالی جگہ نظر نہیں آرہی۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ بتاؤ کتنی جگہ چاہیے؟ جس زمین پر تم رہ کر آئے ہو، اس پوری زمین جتنی جگہ دے دوں؟ وہ عرض کرے گا "اتستھزء بی وأنت رب العالمین؟" یا اللہ! رب العالمین ہو کر میرے ساتھ استہزا کر رہے ہو؟ مسلم شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ بات سن کر ہنسیں گے اور فرمائیں گے کہ میں تم سے استہزا نہیں کر رہا "لکَ الْاَرْضُ وَعَشَرَۃُ اَمْثَالِہَا" بلکہ پوری زمین اور اس جیسی دس زمینیں اور میں نے تمہیں عطا کر دی ہیں۔ یعنی یہ کرّہ ارضی اور اس جیسی دس زمینیں اس شخص کو ملیں گی جو سب سے آخر میں جنت میں جائے گا، اسی سے جنت کے پلاٹوں کے سائز کا اندازہ کر لیں اور اس بات کا بھی اندازہ کر لیں کہ اس پلاٹ کو آباد کرنے اور اسے اپنے لیے محفوظ رکھنے کی خاطر ہمیں دنیا میں کس قدر محنت درکار ہے۔

حضرات محترم! میں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج و اسراء کے دونوں پہلوؤں یعنی بیداری کے معراج اور خواب کے معراج کے حوالہ سے دو مختصر واقعات آپ کے سامنے بیان کیے ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کے معجزات پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اپنے لیے سبق اور پیغام بھی تلاش کریں اور ان پر عمل کریں تاکہ ہماری یہ دنیا کی زندگی کارآمد ہو اور ہم یہاں سے سرخرو واپس جائیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

نبی اکرم ﷺ کی ذات ہی مسلمانوں کی زندگی کا محور ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

مجھے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ہزاروں پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو پر کچھ عرض کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ آقائے نامدار امت مسلمہ کے اتحاد کا مرکزی نقطہ ہیں۔ حضور ﷺ کی ذات اقدس ہمیشہ مسلمانوں کی وحدت کا مرکز رہی ہے، آج بھی امت آپ ﷺ کی ذات پر مجتمع ہے، اور قیامت تک آپ ﷺ تمام مسلمانوں کی یکساں عقیدت و اطاعت کا مرکز رہیں گے۔ اس عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے میں وقت کے اختصار کے باعث صرف تین حوالوں سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

اتحاد کا مطلب کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟

مسلمانوں کو آپس میں متحد رکھنے کے لیے جناب نبی اکرم ﷺ نے جن سینکڑوں ارشادات گرامی میں تلقین فرمائی ہے ان میں سے چند ارشادات نبوی ﷺ کا ذکر کروں گا۔

توہین رسالت ﷺ کے اخباری خاکوں کی اشاعت کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں نے اجتماعی طور پر جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جس شدت سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ایک بار پھر مسلمانوں کی وحدت واجتماعیت کے مرکزی نکتے کے طور پر دنیا کے سامنے آئی ہے، اس بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

اتحاد کا مطلب اور اس کے تقاضے

پہلی بات یہ کہ اتحاد کسے کہتے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی قوم کے درمیان اختلافات پیدا نہ ہونے کو اتحاد کہا جاتا ہے۔ یعنی اتحاد کے لیے یہ

ضروری ہے کہ اول تو اختلاف پیدا نہ ہو اور اگر کسی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جائے تو یہ اختلاف ختم ہو جائے۔ میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ کیونکہ اختلاف ایک فطری امر ہے، جہاں بھی انسان باہم اکٹھے ہوں گے ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گا، یہ عقل و فطرت کا تقاضہ ہے اور اسلام اس کی نفی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل و فہم کے مختلف درجات سے نوازا ہے، مزاج الگ الگ ہیں، اور نفسیات میں بے پناہ تفاوت ہے، اس لیے اختلاف پیدا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ اختلاف کو ختم ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ اختلاف اگر پیدا ہو گا تو وہ باقی بھی رہے گا۔ ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہو گا کہ اختلاف اور چیز ہے جبکہ تفرقہ اور چیز ہے۔ قرآن کریم نے اختلاف سے کسی جگہ بھی منع نہیں کیا البتہ تفرقہ سے منع کیا ہے۔ چنانچہ اتحاد بین المسلمین پر گفتگو کرتے ہوئے میں اس نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں اور اس سلسلے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیسیوں ارشادات میں سے دو کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی ﷺ میں ایک صاحب نماز پڑھ رہے تھے جس میں وہ بلند آواز سے قرأت کر رہے تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی جو اس طرح نہیں تھی جس طرح حضرت عمرؓ نے جناب رسول اللہ ﷺ سے پڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ چونکہ وہ میرے حساب سے قرآن کریم کی آیت غلط پڑھ رہا تھا اس لیے مجھے سخت غصہ آیا، قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی اسے دبوچ لیتا مگر میں نے صبر کیا اور اس کے نماز مکمل کرنے کا انتظار کیا۔ جونہی اس نے نماز مکمل کی میں نے اس کے گلے میں چادر ڈالی اور کھینچتا ہوا اسے جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گیا کہ یارسول اللہ! یہ شخص نماز میں قرآن کریم غلط پڑھ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پہلے اس کی گردن تو چھوڑ دو، میں نے اسے چھوڑ دیا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ وہ آیت جس طرح تم پڑھ رہے تھے اب پڑھ کر سناؤ۔ اس نے سنا دی۔ پھر مجھے فرمایا کہ جس طرح تمہیں یاد ہے تم سناؤ۔ میں نے بھی سنا دی۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس نے بھی ٹھیک پڑھا ہے اور تم نے بھی درست پڑھا ہے۔

یہ دراصل قرأتوں کا اختلاف تھا۔ کسی بھی زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا تلفظ اور لہجہ علاقوں اور قوموں کے فرق سے بدل جاتا ہے لیکن معنٰی ایک ہی رہتا ہے۔ لفظ بھی بنیادی طور پر وہی ہوتا ہے لیکن لہجہ اور تلفظ بدل جاتا ہے اور بعض اوقات سپیلنگ بھی بدل جاتے ہیں۔ میں مثال کے طور پر پنجابی کے ایک لفظ کا حوالہ دوں گا کہ ہمارے ہاں کسی کام کی کیفیت پوچھنے کے لیے ''کیویں'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے مختلف تلفظ ہیں کہیں یہ لفظ کیویں ہے، کہیں کِدّاں ہے، کہیں کیکن ہے، کہیں کِنجوٗ ہے، اور کسی علاقے میں اسے کَیّاں کے تلفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ یعنی لفظ اور معنٰی ایک ہی ہے لیکن تلفظ اور ادائیگی مختلف ہے۔ یہ زبان پر علاقائی اثرات ہوتے ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم جب نازل ہوا تو اسے قریش کے لہجے اور تلفظ میں پڑھنے کی پابندی تھی۔ آپ ﷺ نے بارگاہ ایزدی میں خود درخواست کی کہ ایک ہی لہجے اور تلفظ کا سب عربوں کو پابند بنانے سے بہت سے عرب قبائل کو قرآن کریم پڑھنے میں دقت پیش آسکتی ہے اس لیے اس معاملے میں سہولت پیدا کی جائے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری استدعا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو سات مختلف لہجوں اور قرأتوں میں پڑھنے کی اجازت دے دی تاکہ تمام لہجوں اور قرأتوں کے ساتھ لوگ آسانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر سکیں۔ اب یہ اختلاف ایسا ہے جو آنحضرت ﷺ نے خود مانگ کر لیا ہے اس لیے کہ یہ فطری ضرورت تھا۔

دوسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے مستقل الگ وضو فرماتے تھے، لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک ہی وضو کے ساتھ پورے دن کی نمازیں پڑھ ڈالیں۔ حضرت عمرؓ نے اس بارے میں دریافت کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے آج ایسا کام کیا ہے جو اس سے پہلے آپ نہیں کیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے الگ وضو کرنا اگرچہ بہت اجر وثواب کی بات ہے لیکن اس کی پابندی سے بہت سے لوگوں کو دقت ہوگی۔ اس لیے حضور ﷺ نے ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں ادا کر کے

اسے بھی سنت میں شامل فرمالیا تاکہ کسی کو ایسا کرتے ہوئے کوئی الجھن نہ ہو۔ یہ صرف ایک مثال میں نے ذکر کی ہے اس طرح کی بیسیوں بلکہ سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک کام کو جناب رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے انجام دیا تاکہ طریقوں میں تنوع ہو اور لوگوں کو اپنی سہولت کے مطابق ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کرنے میں یہ پریشانی نہ ہو کہ حضور ﷺ نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔

اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ اسلام نے اختلاف کی نفی نہیں کی بلکہ اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا احترام کیا ہے اور اسے برقرار رکھا ہے۔ البتہ اسلام نے اختلاف کی حدود کا تعین کیا ہے اور ہر اختلاف کو اس کے دائرے میں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اختلاف کی حدود میں پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ جہاں اختلاف کی گنجائش ہو وہاں اختلاف کیا جائے اور جہاں اختلاف کی گنجائش نہ ہو وہاں اختلاف کرنے سے گریز کیا جائے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے بریرہؓ کے ایک واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنی باندی بریرہؓ کو آزاد کر دیا تو وہ ایک صحابی مغیثؓ کے نکاح میں تھیں۔ آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر بریرہؓ کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اگر مغیثؓ کے نکاح میں نہ رہنا چاہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ بریرہؓ نے ایسا ہی کیا اور مغیثؓ سے نکاح ختم کر لیا۔ اس پر مغیثؓ کو پریشانی ہوئی اور اس نے مختلف اطراف سے بریرہؓ کو واپسی پر آمادہ کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں حتیٰ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق مغیثؓ کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھومتے رہتے تھے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو منالائے؟ حضور ﷺ نے یہ صورتحال دیکھ کر خود بریرہؓ سے بات کی اور اس بارے میں اس سے پوچھا۔ بریرہؓ نے جواب دیا کہ یہ میرا شرعی حق تھا جو میں نے استعمال کیا ہے کیونکہ میں مغیثؓ کے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم اپنا یہ فیصلہ واپس نہیں لے سکتیں؟ اس نے بڑے ادب سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ بڑی سمجھدار خاتون تھی، اور کیسے نہ ہوتی کہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہ رہی

تھی۔ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اس نے یہ سوال کر کے ایک حد فاصل قائم کر دی کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے کسی حکم کو نہ ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ مشورہ کی صورت میں اختیار باقی رہتا ہے۔ جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں حکم نہیں دے رہا بلکہ مشورہ دے رہا ہوں تو اس نے بے ساختہ کہا کہ میں اپنے فیصلہ پر قائم ہوں اور مجھے مغیثؓ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر جگہ اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی اور اختلاف وہیں کیا جا سکتا ہے جہاں اس کی گنجائش ہو۔ مثلاً قرآن کریم کے کسی حکم کو سمجھنے اور اس کا مصداق طے کرنے میں تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن نفس حکم سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد اور عمل کا مفہوم و منشا متعین کرنے میں تو اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ارشاد و عمل سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا اختلاف کی حدود میں پہلی بات یہ ضروری ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ کہاں اختلاف کی گنجائش ہے اور کہاں نہیں ہے۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ضروری ہے کہ ہر اختلاف کو اپنی سطح پر اور اپنے درجہ میں رکھا جائے۔ ہمارے ہاں اختلاف پر ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ بازی کا جو رجحان زور پکڑ گیا ہے یہ درست نہیں ہے۔ ہر اختلاف کفر و اسلام کا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر اختلاف حلال و حرام کا ہوتا ہے۔ بعض جگہ صرف اولیٰ و غیر اولیٰ اور ترجیحات کا اختلاف ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں فتویٰ بازی ہر اختلاف کے حوالے سے یکساں ہوتی ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اس رجحان پر قابو پانا وحدت امت کے لیے آج کے دور کا سب سے بڑا تقاضہ ہے۔ اس سلسلہ میں جناب نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشاد گرامی کا حوالہ دوں گا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کو کافر کہا اگر وہ کافر نہ ہو تو کفر کا فتویٰ کافر کہنے والے پر واپس لوٹ آئے گا۔ اور جس شخص نے کسی مسلمان پر لعنت بھیجی ہے جبکہ وہ لعنت کا مستحق نہیں تو یہ لعنت بھیجنے والے پر واپس آئے گی۔ یہی فتوے ہمارے ہاں سب سے بڑے فتوے شمار ہوتے ہیں جن کی اہمیت اور نزاکت جناب نبی اکرم ﷺ نے ان

ارشادات گرامی میں بیان فرمائی ہے۔ اگر اختلافات کی حدود کو قائم رکھا جائے اور بلاوجہ فتویٰ بازی سے گریز کر کے ہر اختلاف کو اس کی سطح پر اور اس کے دائرے میں محدود رکھا جائے تو یہ اختلاف امت کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ یہ اختلافات نہ صرف فطرت کا تقاضہ اور رحمت ہیں بلکہ ہماری معاشرتی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔

وحدت امت کے لیے آنحضرت ﷺ کے ارشادات

اس کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے بہت سے ارشادات میں ہمیں باہمی وحدت برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں جناب رسالت ماب ﷺ نے دور جاہلیت کے خاتمے کا اعلان کر کے اسلام اور روشنی کے دور کا آغاز کیا اور یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ کل امر الجاہلیۃ تحت موضوع قدمی کہ جاہلیت کی تمام اقدار آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ ان میں شرک وبدعت، نسل پرستی، زبان ورنگ کا امتیاز، بدکاری، شراب، جوا، سود، کہانت و نجوم، ناچ گانا، عریانی، اور باہمی قتل و قتال کی جاہلی اقدار شامل تھیں جنہیں جناب رسول اللہ ﷺ نے تئیس سالہ محنت کے ساتھ ختم کیا اور ان جاہلی اقدار سے پاک اسلامی معاشرے کا آغاز فرمایا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ آج یہ تمام اقدار ایک ایک کر کے پھر ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان روایات کا ابوجہل، ابولہب، نضر بن حارث، اور دیگر کافر سرداروں کے حوالہ سے ذکر کیا جاتا ہے تو وہ جاہلی اقدار کہلاتی ہیں جبکہ وہی اقدار ہماری سوسائٹی کا حصہ بنتی ہیں تو تمدن، سولائزیشن، ترقی، یا آرٹ کا عنوان اختیار کر لیتی ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنے خطبے میں ہمیں اس بات کی تلقین بھی فرمائی تھی کہ میرے بعد کفر و جاہلیت کے دور کی طرف واپس نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانا اور باہمی قتل و قتال کسی بھی عنوان سے ہو، اسے جناب رسول اللہ ﷺ نے کفر و جاہلیت سے تعبیر کیا ہے جبکہ ایک حدیث میں اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی ایک صورت قرار دیا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لیے چار باتوں کا سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے تین چیزیں عطا فرمائیں لیکن ایک نہیں دی۔ میں نے سوال کیا کہ میری امت پر مجموعی طور پر پہلی امتوں جیسا عذاب نازل نہ ہو، یہ بات اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت یکبارگی گمراہی کا شکار نہ ہو، یہ بات بھی قبول کر لی گئی۔ میں نے گزارش کی کہ میری امت ساری کی ساری یکبارگی تباہ نہ ہو، یہ بات بھی قبول ہو گئی۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت آپس میں نہ لڑے تو یہ بات اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی۔ جبکہ ایک اور حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت پر جب اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو گا تو اس کی عملی صورتیں تین ہوں گی۔ ایک یہ کہ میری امت کے لوگ آپس میں لڑیں گے اور ایک دوسرے کا خون بہائیں گے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ امت کے شریر لوگوں کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ اور تیسرا یہ کہ امت کے نیک لوگوں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں، اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ یعنی آنکھ کو تکلیف ہو تو سارا جسم اسے محسوس کرتا ہے اور اگر پاؤں کو درد ہو تو جسم کے سارے اعضاء اسے محسوس کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس لیے کوئی مسلمان نہ اپنے دوسرے بھائی پر خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اُسے ظلم کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کرتا ہے۔

ان ارشادات نبوی ﷺ کی روشنی میں دیکھا جائے تو امت کے موجودہ افتراق کے اسباب کو تلاش کرنا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ آج کے دور کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم امت کے افتراق کے اصل اسباب کو تلاش کریں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی کی تلقین فرمائی ہے اور اس حوالے سے ہماری یہی دینی و ملی ذمہ داری ہے۔

توہین رسالت کے خاکے اور امت مسلمہ کا اجتماعی رد عمل

اس کے بعد میں گفتگو کے آخری نکتے کی طرف آتا ہوں کہ ہماری تمام تر خرابیوں، کمزوریوں، اور بد اعمالیوں کے باوجود توہین رسالت ﷺ کے خلاف عالم اسلام کے حالیہ اجتماعی احتجاج سے ایک بار پھر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان وحدت و اتحاد کا مرکزی نکتہ آج بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ یہ بات جہاں حضور ﷺ کا اعجاز اور اسلام کی صداقت کا اظہار ہے وہاں اس بات کی بھی علامت ہے کہ مسلمانوں کے ایمان کا کنکشن آج بھی قائم ہے۔ یہ کنکشن درست ہے اور اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ البتہ ہمارے "سیٹوں" میں کمزوری ہے، اگر ہم اپنے اپنے سیٹ ٹھیک کر لیں اور ان کی خرابیوں کو دور کر لیں تو حضور ﷺ کی عقیدت کا کنکشن آج بھی "اسٹیبل" ہے اور اس کی برکتیں اور بہاریں بدستور تازہ ہیں۔

یورپ کے بعض اخبارات نے تو یقیناً یہ کارروائی شر کے خیال سے کی ہو گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں سے خیر کا یہ پہلو نکال دیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ مسلمانان عالم کی بے لچک کمٹمنٹ کا ایک بار پھر اظہار ہو گیا ہے اور مغرب کو اس تکلیف دہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ اس نے گزشتہ تین صدیوں کے درمیان مسلمانوں کی کمٹمنٹ کے مراکز تبدیل کرنے کی جو محنت کی تھی وہ رائیگاں جا رہی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی کمٹمنٹس کی ترجیحات میں آج بھی سرفہرست اسلام اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، باقی تمام کمٹمنٹس کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ یہ حضور ﷺ کی ذات گرامی، سیرت مبارکہ، اور تعلیمات کا وہ اعجاز ہے جس کا مشاہدہ ہم جیسے گئے گزرے مسلمان بھی کر رہے ہیں اور ساری دنیا اس منظر کو دیکھ رہی ہے۔ اس لیے ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آج کے دور میں ہمارے لیے یہی پیغام ہے کہ اپنی اصل کی طرف واپس پلٹیں اور آپ ﷺ کی سیرت و اسوۂ حسنہ سے روشنی حاصل کر کے اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگیوں کا جزو بنا لیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

نبی اکرم ﷺ کے معمولاتِ زندگی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

امام ترمذیؒ نے "شمائل ترمذی" میں سیدنا حضرت امام حسینؓ سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روز مرہ کے معمولات اور شب و روز کی مصروفیات کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے اپنے سوال کو تین حصوں میں تقسیم کیا:

گھر کے اندر جناب رسول اللہ ﷺ جو وقت گزارتے تھے اس کی ترتیب کیا تھی؟

گھر سے باہر کے معمولات اور انداز کیا تھا؟

مجلسی زندگی کے آداب اور انداز کیا تھا؟

حضرت علیؓ نے بتایا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے گھر کے اوقات اور معمولات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وقت کا ایک حصہ اپنے ذاتی کاموں پر صرف کرتے تھے، دوسرا حصہ گھر والوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا، اور تیسرا حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہوتا تھا۔ حضور ﷺ اپنے ذاتی کاموں کے لیے مخصوص وقت میں ان خواص کے ساتھ ملاقات بھی کرتے تھے جو آپ ﷺ کی خدمت میں گھر میں حاضر ہوتے تھے اور آپ ﷺ کی مخصوص مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ یہ مجلس روزانہ ہوتی تھی، کوئی ضرورت مند ہوتا تو وہ اپنا سوال لے کر آتا اور حضور ﷺ حسب موقع اس کی ضرورت پوری فرما دیتے تھے۔ آپ ﷺ اس مجلس کے شرکاء کے ساتھ امت کے اجتماعی مسائل پر گفتگو فرماتے اور عام لوگوں کے معاملات میں ہدایات دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے مجلس میں خاص طور پر دو باتوں

کی تلقین فرمار کھی تھی کہ مسلمانوں کے عمومی مفاد اور مصلحت کی کوئی بات ہو تو اسے دیگر لوگوں تک پہنچاؤ، اور یہ کہ کوئی شخص اپنی ضرورت اور حاجت کو حضور ﷺ تک براہ راست پہنچانے میں کوئی دقت یا حجاب محسوس کرتا ہو تو اس کا مسئلہ آپ ﷺ تک پہنچایا جائے۔ اس سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی ضرورت اور مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچانے کا موقع نہیں پاتا، اس کا مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچانے والے مسلمان کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ثابت قدمی عطا فرمائیں گے۔ مجلس میں آنے والے جو لوگ سوالی ہو کر آتے تھے حضور ﷺ کے گھر سے کوئی چیز چکھے بغیر واپس نہیں جاتے تھے۔ اس مجلس میں جناب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ شریک ہونے والے بہترین افراد ہوتے تھے جو مجلس سے باہر کے لوگوں کے لیے رہنما کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ مجلس اسی قسم کی باتوں پر مشتمل ہوتی تھی اور ان سے ہٹ کر کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

گھر سے باہر کی عمومی مجالس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ جناب نبی اکرم ﷺ مجلس کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ کرتے تھے اور مجلس کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہوتا تھا۔ حضور ﷺ جب کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں تک مجلس پہنچ چکی ہوتی وہیں بیٹھ جاتے اور اس بات کی تلقین بھی فرماتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حضور ﷺ جس جگہ بیٹھ جاتے وہی جگہ مجلس کا صدر مقام بن جاتی تھی۔ ہر صاحب مجلس کو حضور ﷺ اس کا حصہ دیتے تھے اور کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے دوسرے اصحاب مجلس سے کم توجہ مل رہی ہے۔ حضور ﷺ کے سامنے کوئی شخص اپنا مسئلہ پیش کرتا یا کسی مسئلے پر بات کرتا تو آپ ﷺ اس کی پوری بات سنتے تھے اور جب تک وہ اپنی بات مکمل نہ کر لیتا اس سے رخ نہیں پھیرتے تھے۔ کوئی شخص حضور ﷺ کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کرتا تو آپ اس کی ضرورت پوری کرتے یا نرمی کے ساتھ تسلی کی کوئی بات فرما دیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس علم کی مجلس ہوتی تھی، حیا کی مجلس ہوتی تھی، کسی پر الزام تراشی نہیں ہوتی تھی، کسی پر تہمت نہیں لگائی جاتی تھی، کسی کی غلطی کو اچھالا نہیں جاتا تھا، اور آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کے لیے باپ جیسے شفیق ہوتے تھے۔

مجلس سے ہٹ کر جناب نبی اکرم ﷺ کا عمومی انداز اور طرز عمل یہ ہوتا تھا کہ بے مقصد باتوں سے اپنی زبان کو بچاتے تھے اور وہی بات فرماتے تھے جس کی ضرورت ہوتی تھی۔ لوگوں کو قریب کرنے کی بات کرتے تھے، دور کرنے والی باتوں سے گریز کرتے تھے۔ کسی قوم کا بڑا آپ کے پاس آتا تو اس کا اکرام کرتے تھے اور اس کے ساتھ اسی سطح کا معاملہ فرماتے تھے۔ لوگوں کو اللہ کا خوف دلاتے رہتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے مگر کسی کو بے رخی کا احساس بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے حالات معلوم کرتے تھے اور اگر کوئی غیر حاضر ہوتا تو اس کی تحسین فرماتے اور اسے تقویت دیتے۔ آپ ﷺ اگر کوئی قبیح معاملہ دیکھتے تو اس کی قباحت کا ذکر کرتے اور حوصلہ شکنی کرتے تھے۔

حضور ﷺ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ لوگ خیر کے معاملات سے غافل نہ ہو جائیں اور اس بات کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ وہ اکتا نہ جائیں۔ ہر قسم کے معاملے کا آپ کے پاس حل تیار ہوتا تھا اور ہر صورتحال کے لیے مستعد ہوتے تھے۔ آپ ﷺ حق بات کہنے سے نہیں کتراتے تھے اور ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ لوگوں میں سے آپ ﷺ سے زیادہ قریب وہی حضرات ہوتے تھے جو اچھے لوگ ہوتے تھے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کے ہاں سب سے زیادہ قابل احترام وہی شخص ہوتا تھا جو لوگوں کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہو اور آپ ﷺ کے ہاں اس شخص کو زیادہ قدر حاصل ہوتی تھی جو عام لوگوں کے ساتھ غم خواری اور مدد میں پیش پیش ہوتا تھا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزمرہ معمولات اور طرز عمل کے بارے میں یہ ارشادات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہیں۔ جبکہ بخاری شریف کی ایک راویت کے مطابق ایک بار چند نوجوان صحابہ کرامؓ نے باہمی مشورہ کر کے حضور ﷺ کے گھر کے اندر کے معمولات معلوم کرنا چاہے تا کہ وہ بھی ان معمولات کی پیروی کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے امہات المومنینؓ کی خدمت میں باری باری حاضری دی اور دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ جب گھر کے اندر تشریف لاتے ہیں تو آپ ﷺ کے معمولات کیا ہوتے

ہیں؟ ازواج مطہراتؓ میں سے ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ گھر کے اندر آپ ﷺ کے معمولات کم و بیش وہی ہوتے ہیں جو ہر گھر کے سربراہ کے ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ آرام فرماتے ہیں، بیوی بچوں کو وقت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، آنے جانے والوں کے حالات دریافت کرتے ہیں، گھر کا کوئی کام کاج ہو تو اس میں ازواج مطہراتؓ کا ہاتھ بٹاتے ہیں، حتیٰ کہ جوتا گانٹھ لیتے ہیں، چارپائی کی مرمت کر لیتے ہیں اور اس طرح کے ضرورت کے کام آپ ﷺ خود کر لیا کرتے ہیں۔

لائبریری
الشریعہ اکیڈمی
۵۱۰

اسٹاکسٹ

انجمن خدام الاسلام (رجسٹرڈ) حنفیہ قادریہ

285 جی ٹی روڈ باغبانپورہ لاہور فون: 0300-9496702